گئے دِنوں کے سُورج

چند انٹرویوز چند مضامین

جاوید چوہدری

گئے دِنوں کے سورج

(چند انٹرویوز، چند مضامین)

جاوید چودھری

طاہر بک ہاؤس
پریڈی اسٹریٹ صدر کراچی
فون: 2253305

رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز

ڈوبے ہوئے دنوں کے سورج

ملاقاتیں

الطاف گوہر 11

ممتاز مفتی 49

عطاء الحق قاسمی 71

بیگم شفیقہ ضیاء الحق 117

ایئر مارشل ذوالفقار علی خان 127

شمیم قریشی 143

پروفیسر عبدالعزیز 161

امیر گلستان جنجوعہ 175

ڈاکٹر اقبال والیہ 199

فیچرز 213

فیض احمد فیض کے نرم گوشے 215

حکمرانوں کے دستر خوان 227

پروفیسر احمد رفیق اختر 241
دنیا میں نشے کی تاریخ 249
ہم جنوں کی دنیا میں رہتے ہیں 265
خان لیاقت علی خان 277
جس گھر سے مکینوں کا اعتماد اُٹھ جائے اُسے کوئی نہیں بچا سکتا 287
حکمرانوں کے روحانی بابے 297
بجٹ نہیں زندگی مسئلہ ہے 311

دیباچہ

انسان زندگی میں دو قسم کے لوگوں سے ملتا ہے' ایک وہ لوگ جن سے مل کر انسان کو محسوس ہوتا ہے وہ بہت بڑا ہے اور دوسرے وہ لوگ جن سے مل کر انسان کو احساس ہوتا ہے وہ اور اس کی ہستی دونوں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ اس کتاب میں دوسری قسم کے لوگ شامل ہیں۔

ملاقاتیں

الطاف گوہر

الطاف گوہر صاحب نے بڑی بھرپور زندگی گزاری' وہ بیوروکریٹ تھے' وہ پاکستان کے چھ سربراہان کے سیکرٹری رہے' وفاقی سیکرٹری اطلاعات رہے' لندن میں انگریزی کے اخبار کے ایڈیٹر رہے اور پاکستان میں وہ ''ڈان'' اور ''دی مسلم'' کے ایڈیٹر رہے۔ میری ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ ۱۹۹۴ء میں شروع ہوا' وہ ان دنوں علیل تھے' ان ملاقاتوں کے دوران میں نے ان سے ایک طویل انٹرویو کی درخواست کی' انہوں نے میری یہ خواہش مان لی' یوں میں نے ان کی زندگی کا طویل انٹرویو کیا۔ یہ محض ایک انٹرویو نہیں تھا۔ یہ پاکستان کی تاریخ بھی تھا' یہ انٹرویو ۱۹۹۵ء میں بہت مشہور ہوا تھا۔ میں نے گوہر صاحب کی گفتگو آپ بیتی کے سٹائل میں تحریر کی۔ آپ یہ انٹرویو پڑھیے اور گوہر صاحب کے مشاہدات سے لطف لیجئے۔

پاکستان بننے سے بہت پہلے میں گوجرانوالہ میں پیدا ہوا۔ میرے والد پڑھے لکھے شخص تھے۔ ان کی بہت بڑی لائبریری تھی۔ جب سکول جانے کی عمر ہوئی تو کنٹونمنٹ سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ اسلامی سکولوں کی تعلیم اچھی تھی اور نہ ہی ماحول۔ تعلیم پر ہندو چھائے ہوئے تھے۔ ہندو استاد مسلمان طالب علموں کو سائنس کے مضامین اور انگریزی نہیں رکھنے دیتے تھے جو طالب علم اصرار کرتا اسے کہتے یہ تمہارے بس کی بات نہیں تم گائے کا گوشت کھاتے ہو جس سے دماغ پر بُرا اثر پڑتا ہے' تم عربی' اُردو' فارسی اور ہسٹری کے مضامین رکھ لو۔ سکول میں پہلے روز جب ہندو استاد نے میرا نام ''الطاف حسین گوہر الرحمان'' پڑھا تو نفرت سے کہا میری جماعت میں تمہیں بیٹھنے کی اجازت نہیں ہوگی تم ہمیشہ کھڑے رہو گے۔ اسی ماحول میں میرے چھوٹے بھائی تجمل حسین اور میں نے خالصہ کالج گوجرانوالہ سے ایف۔ اے کیا۔ پھر بی۔ اے گورنمنٹ کالج لاہور سے کیا۔

بی۔ اے کے بعد نوکری کے لئے دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ اس دور میں ہم کلرکی سے آگے نہیں سوچتے تھے کیونکہ پڑھے لکھے مسلمان کی اس سے آگے اپروچ نہیں تھی۔ اس بے روزگاری کے دور میں تین ماہ تک ایچی سن کالج میں فارسی پڑھاتا رہا جب وہاں سے چھٹی ہو گئی تو سوچا چلو فوج ہی میں بھرتی ہو جاتے ہیں چنانچہ سائیکل پر لاہور چھاؤنی میں بھرتی آفس چلا گیا۔ وہاں اُمیدواروں کی لمبی قطار لگی تھی۔ جس میں میں بھی کھڑا ہو گیا۔ باری آنے پر چپڑاسی نے میرا نام پکارا اور میں بھرتی آفیسر کے سامنے حاضر ہو گیا۔ انگریز کرنل نے میرے کاغذات پڑھنے کے بعد میری طرف دیکھا اور اس کے چہرے پر ناگواری آ گئی۔ ''تم نے اتنے لمبے بال کیوں رکھے ہوئے ہیں؟'' میں ان دنوں ''گیسو دراز'' ہوا کرتا تھا۔ میں نے کوئی جواب دیا لیکن انگریز میرے دلائل سے مطمئن نہیں ہوا لہٰذا نوکری کا یہ دروازہ بھی بند ہو گیا۔ مزید کچھ عرصہ دوڑ دھوپ کی لیکن

ناکامی ہوئی تو ناچار گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم۔اے انگریزی میں داخلہ لے لیا۔اب تعلیم بے کاری سے نجات کا ایک بہانہ تھی۔ مجھے یہ اقرار کرنے میں کوئی عار نہیں کہ اگر اس دور میں مجھے کلرکی قسم کی کوئی نوکری مل جاتی تو میں کبھی کالج کا رُخ نہ کرتا۔

ایم۔اے انگریزی کے امتحان میں مسلمان طالب علموں میں میری پہلی پوزیشن تھی۔ کچھ عرصہ کی بے کاری کے بعد اسلامیہ کالج میں لیکچرر ہو گیا۔ ۸۰ روپے تنخواہ ملتی تھی۔ تھوڑے عرصے بعد آل انڈیا ریڈیو میں پروگرام اسسٹنٹ ہو گیا۔ اس کی تنخواہ ۱۲۰ روپے تھی۔ اس نوکری کا بڑا چرچا ہوا۔ لوگ مبارکبادیں دینے آتے تھے۔ پہلی تقرری پشاور ہوئی۔ پشاور آنے سے قبل میں نے انڈین سول سروسز کا امتحان دیا بعد ازاں پشاور میں مجھے انٹرویو کی کال ملی۔ انٹرویو دیا جس میں خوش قسمتی سے کامیاب ہو گیا۔ یوں میں ۱۹۴۶ء میں انڈین سول سروس میں شامل ہو گیا۔ مدراس کے ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ میں ٹریننگ کے بعد دہلی میں فنانس ڈیپارٹمنٹ میں میری پہلی تقرری ہوئی۔ اس دور میں میرا شمار مسلمانوں کے ان چند افسروں میں ہوتا تھا جو فنانس کو سمجھتے تھے۔ دہلی میں چودھری محمد علی، ممتاز احسن اور انور علی کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ چودھری محمد علی ان دنوں جوائنٹ سیکرٹری لیول کے افسر تھے اور ہم لوگ سیکشن آفیسر۔ ۱۱ اگست کو جب قائداعظم اور ڈماؤنٹ بیٹن کے ساتھ کراچی تشریف لائے تو ہم لوگ استقبالی قطار میں کھڑے تھے۔ پاکستان کا پہلا فنانس ڈیپارٹمنٹ گورنر جنرل ہاؤس میں قائم ہوا۔

پاکستان بننے کے فوراً بعد کرنسی نوٹوں اور سکوں کے ڈیزائن تیار کروانا، سکے ڈھلوانا اور نوٹ چھپوانے کی ساری ذمہ داری میری تھی۔ ہم نے Brandbury Wilkinson کو نوٹ چھاپنے کا ٹھیکہ دیا۔ نوٹ چھپ کر آئے تو مجھے پاکستان کے پہلے کرنسی نوٹوں کے بکسوں کو بندرگاہ سے آرمی آرڈیننس ڈپو کے تہہ خانے تک پہنچانے کی سعادت نصیب ہوئی۔ میں رات بھر خوشی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ صبح سویرے میں اپنے سینئر عبدالقادر کے پاس نوٹوں کے نمونے لے کر گیا تو وہ دیکھتے ہی برس پڑے۔ ''نوٹوں پر چاند غلط چھپ گیا ہے۔'' میں نے دیکھا اور لرز کر رہ گیا کیونکہ نوٹوں پر ہلال کے بجائے بدر کا چاند چھپ گیا تھا جو بہت بڑی بدشگونی تھی لہٰذا ہمیں تمام نوٹ ضائع کر کے دوبارہ چھپوانے پڑے۔

تخلیق پاکستان کے تھوڑا عرصہ بعد میرا تبادلہ مشرقی پاکستان ہو گیا جب ۵۴ء کے انتخابات ہوئے تو میں ہوم پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں ڈپٹی سیکرٹری تھا۔ الیکشن میں مولوی فضل حق کی

پارٹی اکثریت سے جیت گئی، وہ مشرقی پاکستان کے وزیراعلیٰ بن گئے، ہمارا خیال تھا وہ مغربی پاکستان کے افسروں کو ہٹا کر اپنے بندے لگا دیں گے لیکن حلف لینے کے کچھ روز بعد فضل حق نے مجھے بلایا۔ میں ان کے گھر گیا تو وہ تہبند بنیان میں ملبوس لکڑی کی کھاٹ پر لیٹے تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھا اور کہا۔ الطاف تم ہوم ڈیپارٹمنٹ میں اپنا کام بھی کرتے رہا کرو اور میرے سیکرٹری بھی بن جاؤ۔ میں بڑا حیران ہوا کیونکہ کسی بنگالی وزیراعلیٰ کے ذاتی سیکرٹری کا مجھے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ میں نے معذرت کی کوشش کی تو وہ کہنے لگے ہمارے پاس سردست بندے نہیں ہیں تم عارضی طور پر یہ کام سنبھال لو۔ ناچار مجھے حامی بھرنا پڑی۔

مولوی فضل حق بلا کے مقرر تھے۔ بڑا مشہور واقعہ ہے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور کے جلسہ عام میں قرارداد پیش ہونا تھی۔ قائداعظم تقریر کر رہے تھے، پنڈال میں فضل حق تشریف لائے۔ ان کو دیکھتے ہی حاضرین نے شیر بنگال زندہ باد کے نعرے لگانا شروع کر دیئے۔ قائداعظم نے مجمع کی توجہ بدلتے دیکھی تو کہا۔ ''جب شیر آ گیا تو میمنے کی کیا ضرورت ہے۔'' اور تقریر ادھوری چھوڑ کر بیٹھ گئے۔ مولوی صاحب مجمع کے نباض تھے وہ فوراً لوگوں کی ضرورت بھانپ لیتے تھے اور اس کے بعد وہ زنانے دار تقریر کرتے کہ لوگ آپے سے باہر ہو جاتے۔ ان کے ساتھ کام کے دوران مجھے ذاتی طور پر بڑے دلچسپ تجربات ہوئے۔ مثلاً ایک مرتبہ وہ کلکتہ گئے وہاں لوگوں سے خطاب کے دوران انہیں محسوس ہوا لوگ پاکستان کی حمایت کی بات نہیں سننا چاہتے انہوں نے فوراً پینترا بدلا اور دو قومی نظریہ کے خلاف تقریر جھاڑ دی۔ دوسرے روز مجھے بلایا اور پوچھا۔ تقریر کا کیا اثر ہوا۔ میں نے صاف گوئی سے کہہ دیا بڑا بُرا اثر پڑا ہے۔ انہوں نے خفگی سے کہا تم نے میری طرف سے تردید کیوں نہیں کی؟ میں بھونچکا رہ گیا پھر انہوں نے مجھے سمجھایا تم میری باتوں پر دھیان نہ دیا کرو دوسرے روز تمہیں جو بات غلط لگے اس کی فوراً تردید شائع کرا دیا کرو۔

شاہ سعود کو بنگال کا دورہ کرنا تھا۔ ہم اس کے استقبال کے لئے بڑی تیاریاں کر رہے تھے۔ دورے سے چند روز پہلے سیلاب آ گیا۔ بنگال کے سیلاب سے جہاں وسیع پیمانے پر تباہی آئی ہے وہاں عوام کے موڈ بھی تبدیل ہو گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے محلہ سرداراں کے لوگوں نے اعلان کر دیا ہم شاہ سعود کا استقبال نہیں کریں گے۔ یہاں لاکھوں آدمی مر گئے ہیں اور حکومت نمائشوں پر لاکھوں روپے ضائع کر رہی ہے وغیرہ وغیرہ۔ صورتحال خراب ہو گئی۔ فضل حق نے مجھے بلایا اور کہا کہ اب کیا ہو گا۔ میں نے کہا ظاہر ہے دورے کا پروگرام تو تبدیل نہیں ہو سکتا۔ شاہ سعود تو

کراچی پہنچ چکے ہیں۔ انہوں نے کچھ سوچا اور پھر مجھے حکم دیا تم محلہ سرداراں کے لوگوں کو کل سہ پہر تین بجے میرے گھر بلا لو۔ میں نے محلہ سرداراں کے لوگوں کو دعوت دی۔ اگلے روز مقررہ وقت پر شیر بنگال کے گھر لوگوں کا مجمع لگ گیا۔ ہر شخص دورے کے خلاف رائے دے رہا تھا۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی' شیر بنگال دھوتی بنیان میں ملبوس کھاٹ پر بیٹھے تھے جب شور نا قابلِ برداشت ہو گیا تو وہ اُٹھے اور دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا۔ یہ دیکھتے ہی سناٹا طاری ہو گیا' ہم سب ہکا بکا رہ گئے اب وہاں صرف شیر بنگال کی چیخیں تھیں۔ آنسو اور سسکیاں تھیں اور ہم لوگوں کی حیرت تھی۔ جب سارا مجمع ان کی طرف متوجہ ہو گیا تو پھر شیر بنگال بولے۔ ''بدبختو آج والیٔ کعبہ میرے گھر آ رہے ہیں۔ میرے پیارے رسولؐ کی چوکھٹ کا دربان آ رہا ہے اور میری بدقسمتی دیکھو فضل حق اس کا استقبال نہیں کر سکتا۔ لوگو! بتاؤ جب کل فضل حق بارگاہِ ایزدی میں حاضر ہو گا تو اپنے رب کو کیا منہ دکھائے گا۔ لوگو! ہم سب جہنمی ہیں۔'' ان کے الفاظ میں ایسا درد تھا کہ پورے مجمعے نے زاروقطار رونا شروع کر دیا اور پھر انہوں نے وہ زناٹے دار تقریر کی کہ خدا کی پناہ۔ مجھے ان کے وہ الفاظ تو یاد نہیں لیکن وہ نعرے میرے حافظے کی کتاب میں آج بھی درج ہیں جو بنگالیوں نے وہاں شاہ سعود کی شان میں لگائے تھے۔ جب لوگ مطمئن ہو کر اپنے گھروں کو چلے گئے تو شیر بنگال مجھے دیکھ کر مسکرائے اور کہا کیوں حضرت؟ اور میرے پاس اس جادوگری کی تعریف کے لئے الفاظ نہیں تھے۔

اور مئی ۵۴ء کی ایک گرم شام ڈھاکہ کی گلیوں میں سکندر مرزا کی آمد کی خبر گونج رہی تھی۔ فضل حق کو غدار قرار دے کر اس کی حکومت برطرف کی جا چکی تھی اور سکندر مرزا کو گورنر بنا کر مشرقی پاکستان بھجوایا جا رہا تھا۔ جنرل کے ایم شیخ مشرقی پاکستان کے کمانڈر تھے' وہ مجھے بار بار بلاتے اور بار بار کہتے سکندر مرزا کے آتے ہی ہم فلاں کو پکڑیں گے' فلاں کو ماریں گے اور میں صرف سر ہلا کر رہ جاتا تھا۔ پھر ہم نے ڈھاکہ ایئرپورٹ پر مشرقی پاکستان کے نئے گورنر سکندر مرزا کا استقبال کیا۔ وہ آئے' ہمیں دیکھا' ہیلو ہائے کی اور گورنر ہاؤس چلے گئے' اس شام ہمیں گورنمنٹ ہاؤس طلب کیا گیا۔ ہم لوگ ''مانک ہاؤس'' پہنچ گئے اور گورنر کے بیڈ روم کے باہر بیٹھ گئے۔ ڈی آئی جی انوار الحق' این ایم خان اور میں اس نیم تاریک کمرے میں بڑی دیر تک دم سادھے بیٹھے رہے۔ وہاں صرف وال کلاک کی ٹک ٹک تھی اور ہماری سہمی سہمی' ڈری ڈری سانسوں کی آواز تھی۔ پھر اچانک سلیٹی رنگ کا پردہ ہٹا اور سکندر مرزا اندر آ گئے۔ ہم سب احتراماً کھڑے ہو گئے۔ وہ سرخ گاؤن

میں ملبوس تھے۔ انہوں نے بغیر وقت ضائع کئے حکم دیا۔ ''کل صبح چھ بجے پندرہ سو غنڈوں کو اندر کر دیا جائے'' انہوں نے حکم دیا اور اندر واپس چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد انوار الحق نے پندرہ سو کو بنگال کے ۱۷ اضلاع سے تقسیم کیا تو ہم چیخ گئے۔ وہ پریشان ہو گئے' ہم نے مشورہ دیا میمن سنگھ بڑا ضلع ہے یہ چار اس کے کھاتے میں ڈال دو۔ میری ڈیوٹی تھی کہ میں تمام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو فون کر کے اطلاع کر دوں۔ اگلی صبح گورنر صاحب کے حکم کی بجا آوری ہو گئی۔ انہوں نے سنا اور کہا۔ ''گڈ'' ہم لوگ خوش ہو گئے لیکن آپ پوچھیں گے کہ پکڑے جانے والے لوگ کون تھے ان میں اکثریت ان رکشے والوں' ریڑھی بانوں اور پیدل چلنے والوں کی تھی جو بدقسمتی سے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ حضرات کے ہتھے چڑھ گئے۔

جنرل سکندر مرزا بڑے سخت آدمی تھے وہ حکم دیتا اور پھر اس پر عملدرآمد کرانا جانتے تھے۔ لیکن وہ عام آدمی کو تنگ نہیں کرتے تھے۔ وہ ساڑھے تین ماہ بنگال رہے اس دوران انہوں نے حالات بالکل درست کر دیئے۔ اس دوران ان سے بڑی ملاقاتیں رہیں وہ مجھے بہت پسند کرتے تھے۔ مغربی پاکستان واپسی کے بعد انہوں نے غلام محمد کی چھٹی کرا دی۔ خود گورنر جنرل بن گئے اور حسین شہید سہروردی کو وزیراعظم بنا دیا گیا۔ اس دوران انہوں نے مجھے بنگال سے بلا کر کراچی کا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لگا دیا۔ این ایم خان چیف کمشنر تھے۔

سکندر مرزا جونیئر افسروں پر دباؤ نہیں ڈالتے تھے۔ بات مان لیتے تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی رہائش گاہ ۷۰ کلفٹن کے سامنے ایران کا سفارتخانہ تھا جس کے سامنے بچوں کا ایک چھوٹا سا پارک تھا۔ ایک دن چیف کمشنر این ایم خان نے مجھے بلا کر کہا ''گورنر جنرل یہ پارک ایران ایمبیسی کو دینا چاہتے ہیں تم آرڈر کر دو۔'' میں نے کہا ''یہ پارک بچوں کے لئے ہے وہاں وہ کھیلتے ہیں یہ زیادتی ہو گی لہٰذا میں آرڈر نہیں کروں گا۔ آپ بحیثیت چیف کمشنر احکامات جاری کر دیں۔'' این ایم خان نے کہا ''نہیں تم ہی آرڈر کرو'' میں نے انکار کر دیا۔ چند روز بعد مجھے سکندر مرزا نے گورنر جنرل ہاؤس میں طلب کیا۔ میں وہاں پہنچا تو وہ لان میں ٹہل رہے تھے۔ مجھے بھی ساتھ شامل کر لیا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد کہنے لگے۔ ''یہ وہ بچوں کے پارک کے سلسلے میں کوئی پرابلم ہے؟'' میں نے انہیں ساری بات بتائی تو کہنے لگے۔ ''ہاں اس صورت میں یہ پارک ایران ایمبیسی کو دینا مناسب نہیں۔'' یہ ان میں خوبی تھی کہ وہ نہ صرف بات سمجھ لیتے تھے بلکہ مان بھی لیتے تھے ورنہ گورنر جنرل کے سامنے ایک ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے اصول کی کیا حیثیت ہوتی ہے؟!

سکندر مرزا بلا کے سازشی تھے۔ جمہوریت کے سخت خلاف تھے۔ جوڑ توڑ کے بہت ماہر تھے۔ میں جب بھی جمہوریت کی بات کرتا' سخت غصے میں آجاتے اور کہتے۔ یہ تم کیا کہتے رہتے ہو تمہاری ساری تھیوری غلط ہے' بکواس ہے' وہ لوگوں کو حقوق دینے کے خلاف تھے۔ ۵۶ء کے آئین کو انہی نے چلنے نہیں دیا لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ بہت ایماندار تھے۔ جب ایوب خان نے انہیں برطرف کیا تو گورنر ہاؤس چھوڑنے سے پہلے انہوں نے تمام بل کلیئر کیے۔ نوکروں کو تنخواہیں دیں۔ ان دنوں ان کے ایک ملازم کی تازہ تازہ شادی ہوئی تھی۔ انہوں نے جلاوطن ہونے سے پہلے اسے تحفہ دیا۔ بعدازاں جب وہ کوئٹہ میں دو تین ہفتے قید رہے تو وہاں سے واجبات کی ادائیگی کے لئے دس ہزار روپے بھیجے۔ گورنر جنرل کے عہدے پر فائز رہنے کے دوران انہوں نے نہ جائیداد بنائی اور نہ کوئی مالی فائدہ اٹھایا۔ وہ لندن گئے اور باقی زندگی انہوں نے ایک ہوٹل میں نوکری کر کے گزار دی۔

جب میں کراچی کا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھا تو شہر کی صورتحال بڑی خراب تھی۔ مافیا پیدا ہو رہا تھا۔ جھوٹے کلیم جمع کرا کر زمینیں حاصل کی جا رہی تھیں۔ کالونیوں پر قبضے ہو رہے تھے اور بھتے وصول کیے جا رہے تھے۔ ان دنوں کا ایک دلچسپ واقعہ سناتا چلوں۔ جب میں پہلی مرتبہ کراچی کورٹ گیا تو وہاں دو مجسٹریٹ بیٹھے تھے۔ میں نے ان کے بارے میں پوچھا تو مجھے بتایا گیا یہ لوگوں کے کلیمز کی تصدیق کرتے ہیں۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی اور میں انہیں گھور کر دیکھنے لگا' میں اس دوران ایک مجسٹریٹ کے پیچھے کھڑا ہو گیا اس نے سیاہ چشمہ لگا رکھا تھا۔ اس نے جب مجھے اوپر کھڑے دیکھا تو زاروقطار رونا شروع کر دیا۔ میں گھبرا گیا اور اسے چپ کرانا شروع کر دیا بعدازاں اس نے انکشاف کیا وہ نابینا ہے اور اس کی معذوری کو دیکھتے ہوئے میرے پیشرو نے اسے مجسٹریٹ بنا دیا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا تم کلیم کی تصدیق کیسے کرتے ہو؟ اس نے بتایا میں نے ایک بچہ رکھا ہوا ہے وہ کلیم پڑھ کر سنا دیتا ہے اور میں تصدیق کر دیتا ہوں۔ میں نے سب کی چھٹی کرا دی جس پر چیف جسٹس نے میری بڑی تعریف کی کیونکہ غلط تصدیقوں سے بڑے تنگ تھے۔

مجھے ان دنوں وزیراعظم حسین شہید سہروردی کے ساتھ کام کرنے کا بھی موقع ملا۔ وہ بڑے مزے کے آدمی تھے۔ بہت پڑھے لکھے' ذہین' بات کو سمجھنے والے اور بلا کے مقرر' وہ دن رات دیوانوں کی طرح کام کرتے تھے۔ وہ رات کو بالکل نہیں سوتے تھے لیکن کابینہ کے اجلاس میں سو جاتے تھے یا کسی سے بات کرتے کرتے سو جاتے تھے لیکن میں نے انہیں کبھی بستر پر لیٹے نہیں

دیکھا۔ رات کو بارہ ایک بجے ان کا فون آ جاتا تھا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ صاحب آپ کو خبر ہے شہر میں کیا ہو رہا ہے۔ میں کہتا نہیں سر میں تو سو رہا تھا۔ وہ کہتے ظاہر ہے جب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سو رہے ہوں گے تو یہ تو ہو گا اور میں بھاگا بھاگا وزیراعظم ہاؤس جاتا مگر اس وقت تک شکایت رفع ہو چکی ہوتی اور سہروردی صاحب سب کچھ بھول بھال کر گپیں ہانک رہے ہوتے۔

سہروردی ملتان میں جلسہ عام سے خطاب کرنا چاہتے تھے۔ جماعت اسلامی کے ہاتھ ملیا میں کسی خاتون کے ساتھ سہروردی کے ڈانس کی ایک تصویر چڑھ گئی۔ انہوں نے اس کے بڑے بڑے پوسٹر بنائے اور شہر بھر میں لگا دیا۔ نوائے وقت نے سہروردی کے خلاف خبریں لگانا شروع کر دیں۔ ایک روز سہروردی نے مجھے بلایا اور کہا۔ تم اپنے سول سروس کے دوستوں سے پوچھو مجھے ملتان جانا چاہیے یا نہیں؟ میں نے ملتان کی انتظامیہ سے رابطہ کیا انہوں نے بتایا یہاں سہروردی کے خلاف بڑی نفرت پائی جاتی ہے۔ انہیں کہیں یہاں آنے کی غلطی نہ کریں ہمیں نہیں امید وہ ڈائس تک بھی پہنچ پائیں گے۔ میں شام کو وزیراعظم ہاؤس گیا اور انہیں ساری صورتحال بتا دی۔ انہوں نے کہا۔

So tell your friends, the Hussain Shaheed will be there tomorrow at 3, o'' clock"

اور اگلے روز وہ ملتان پہنچ گئے۔ لاکھوں کا مجمع تھا۔ لوگ شور کر رہے تھے ان کے خلاف نعرے لگ رہے تھے لیکن جب انہوں نے تقریر شروع کی تو ان کی اردو اس قدر شستہ اور بلیغ تھی کہ مجمع قوت گویائی کھو بیٹھا' مجھے یاد ہے جب تقریر ختم ہوئی تو لاکھوں کا وہ مجمع ان کے ساتھ تھا۔

دوسرے روز سارے اخبارات نے ان کی تقریر کو بڑا سراہا۔

اسی دور میں نہر سویز کا مسئلہ کھڑا ہو گیا سکندر مرزا اور حسین شہید سہروردی نے اپنی احمقانہ پالیسی کے باعث عوام کو اپنے خلاف کر لیا۔ نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن نے کراچی میں بہت بڑا جلوس نکالا۔ مجھے حکم دیا گیا میں طلباء کو کنٹرول کروں۔ جلوس نے برٹش ہائی کمیشن کی طرف مڑنا شروع کر دیا۔ ہم لوگ راستے میں کھڑے ہو گئے۔ جلوس کے قائدین کو زبانی کلامی سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ نہ مانے۔ ناچار مجھے لاٹھی چارج اور آنسو گیس کا حکم دینا پڑا لیکن جلوس نے منتشر ہونے سے انکار کر دیا۔ میرے ذہن میں اچانک ایک سکیم آئی' میں نے میگافون پر جلوس سے خطاب کرنا شروع کر دیا میں نے ان سے کہا تم اگر حملہ کرنا چاہتے ہو تو برٹش ہائی کمیشن کے بجائے وزیراعظم ہاؤس پر کرو۔ جاؤ میں تمہیں اجازت دیتا ہوں۔ وزیراعظم ہاؤس کو گھیر لو۔ ہجوم

نے نعرے لگائے اور وزیراعظم ہاؤس کی طرف دوڑ لگا دی۔ میں دوسرے راستے سے فوراً وزیراعظم ہاؤس پہنچ گیا۔ سہروردی ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھے تھے ان کے چند عزیز رشتے دار آنسو گیس کے تھیلے دکھا دکھا کر بتا رہے تھے تمہارے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے آج عوام پر بڑا ظلم کیا ہے مجھے دیکھ کر وہ اٹھے اور مجھے برآمدے میں لے جا کر پوچھا "کیا ہوا؟" میں نے ساری کارروائی بتا دی اور آخر میں ان سے عرض کیا "اب وہ لوگ وزیراعظم ہاؤس کی اینٹ سے اینٹ بجانے کے لئے آ رہے ہیں۔" انہوں نے کہا "مروا دیا یار۔ اب کیا ہوگا؟" میں نے کہا "جناب ہونا کیا ہے آپ جلوس سے خطاب کریں۔" انہوں نے کہا "ٹھیک ہے آنے دو انہیں" اور پھر انہوں نے جلوس کے سامنے ایک گھنٹہ تقریر کی۔ لوگوں نے گالیاں دیں نعرے لگائے لیکن وہ میگا فون پر ڈٹے رہے اور آخر کار مجمع ہار گیا اور سہروردی جیت گئے۔

۲۵ دسمبر کو قائداعظم کے یوم پیدائش کے موقع پر مسلم لیگ نے مجھ سے جہانگیر پارک میں جلسے کی درخواست کی میں نے منظوری دے دی۔ دوسرے روز حسین شہید سہروردی کی پارٹی عوامی لیگ نے بھی جہانگیر پارک میں جلسے کی اجازت طلب کر لی۔ میں نے انکار کر دیا۔ پارٹی رہنماؤں نے کہا تم اپوزیشن کو رولنگ پارٹی پر فوقیت دے رہے ہو۔ میں نے کہا "جناب! فرسٹ کم فرسٹ" والا معاملہ ہے وہ لوگ پہلے آئے تھے۔ عوامی لیگ کو میری یہ دلیل بری لگی اور وہ سہروردی کے پاس چلے گئے لیکن انہوں نے مجھے طلب نہیں کیا اور نہ ہی کسی قسم کی وضاحت مانگی۔ تاہم چند روز بعد سرکاری نوٹ آ گیا کہ وزیراعظم ۲۲ دسمبر کو ڈھاکہ جا رہے ہیں۔ ہم ۲۲ دسمبر کی شام ماڑی پور ایئرپورٹ پر انہیں رخصت کرنے کے لئے پہنچے تو انہوں نے مجھ سے ہاتھ نہ ملایا۔ بعد ازاں ان کا اے ڈی سی آیا اور مجھ سے کہا تمہیں وزیراعظم نے طلب کیا ہے۔ میں جہاز میں چلا گیا وہ پاجامہ پہن رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی کہا۔ Who are you? میں نے کہا Sir I am District Magistrate. انہوں نے پاجامہ باندھتے ہوئے کہا you know why P.M. is leaving for Karachi and going to Dhaka. میں نے کہا۔ Sir, I don't know تو کہنے لگے۔ because you have refused to allow main public ground to his party to hold the meeting. Therefore, he must leave the city and you are responsible for this. میں نے کہا Sir, but they

came first وہ نفرت سے بولے technicality, اور اس کے بعد انہوں نے مجھے جہاز سے اتارا اور خود ڈھاکہ چلے گئے۔ یہ اس کے کردار کی خوبی تھی کہ وہ خود شہر چھوڑ کر چلا گیا لیکن اس نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو فیصلہ بدلنے کا حکم نہیں دیا بصورتِ دیگر وزیراعظم کے سامنے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے فیصلے کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔

حسین شہید سہروردی کی ایک اور عجیب عادت تھی۔ کراچی میں جو بھی پوسٹ خالی ہوتی..... وہ مجھے اس کا ایڈیشنل چارج دے دیتے۔ ایک روز انہوں نے مجھے بلایا اور کہا کراچی میونسپل کارپوریشن کی حالت بہت خراب ہے پیسہ ضائع ہو رہا ہے۔ تمہاری فنانس کی بیک گراؤنڈ ہے تم فوراً اس کا چارج بھی لے لو۔ میں نے کہا جناب یہ میرے لئے ممکن نہیں۔ انہوں نے کہا "اچھا چند ہفتوں کے لئے تو اسے اپنے پاس رکھو" میں نے کہا "جی اچھا"

چین کے ساتھ تعلقات کا آغاز سہروردی کا بہت بڑا کمال تھا۔ اس نے سکندر مرزا کی مخالفت کے باوجود چو این لائی کو پاکستان کے دورے کی دعوت دے دی۔ پاکستانیوں نے چینی رہنماؤں کی آمد پر بڑی خوشیاں منائیں۔ جب چو این لائی ایئرپورٹ پر اترا تو وہاں اس کے استقبال کے لئے لاکھوں لوگ موجود تھے۔ امریکی اور برطانوی سفیروں نے اس استقبال پر بڑا احتجاج کیا۔ سکندر مرزا پریشان ہو گیا۔ سہروردی نے مجھے بلایا اور حکم دیا۔ استقبالیہ کی صدارت تم کرو گے۔ میں حیران ہوا تو وہ کہنے لگے "تم میئر ہو میونسپل کارپوریشن کا چارج تمہارے پاس ہے لہٰذا پبلک ریسپشن کی صدارت تمہارا فرض ہے۔" ناچار مجھے ہامی بھرنا پڑی پھر جب میں خطبہ استقبالیہ کے لئے کھڑا ہوا تو وزیراعظم سامنے عوام میں بیٹھے تھے اور میں سٹیج پر کھڑا تقریر کر رہا تھا۔ میری وہ تقریر اشتراکی نظریات کے بہت قریب تھی۔ میں نے اقبال کا وہ شعر بھی پڑھ دیا کہ۔

جس کھیت سے دہقان کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

میری اس تقریر کا امریکیوں نے بڑا سخت نوٹس لیا۔

ہم نے اس تقریب میں ایلومینیشن کا انتظام بھی کیا ہوا تھا۔ پروگرام تھا کہ جوں ہی چائے ختم ہوگی۔ ہال کی تمام بتیاں جل اٹھیں گی لیکن بدقسمتی سے چائے چند منٹ پہلے ختم ہوگئی میں گھبرا گیا اور بے وقوفوں کی طرح بتیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ چو این لائی میری پریشانی بھانپ کر میرے قریب آئے اور کہا

"Is there any problem?"

میں نے کہا سر! ہم نے لائنس کا انتظام کیا ہوا ہے وہ فوراً اپنی نشست پر واپس بیٹھ گئے اور کہا۔ We will wait پھر چند سیکنڈ بعد ہال کی ساری بتیاں جگمگا اٹھیں اور شرکاء نے بے اختیار تالیاں بجانا شروع کر دیں۔ اسی طرح میں پاکستان کا پہلا شخص تھا جسے معلوم ہوا کہ چواین ائی انگریزی جانتے ہیں اور سہروردی پاکستان کے پہلے حکمران تھے جنہیں پاک چینی دوستی کی اہمیت کا احساس تھا۔

سہروردی اپنی تمام تر جرأت اور ذہانت کے باوجود سکندر مرزا کے زیر اثر تھے۔ جب وہ چین کے دورے پر گئے تو واپسی پر سکندر مرزا نے ان کے خلاف جلوس نکلوا دیا' میں نے انہیں ایئرپورٹ پر ریسیو کیا۔ انہوں نے گاڑی میں بیٹھتے ہی پوچھا۔ الطاف یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں نے انہیں مشورہ دیا آپ فوری طور پر الیکشن کرا دیں ورنہ یہ لوگ آپ کو فارغ کر دیں گے۔ انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا' مجھے آج تک افسوس ہے سہروردی نے میرے مشورے کو درخور اعتنا نہ سمجھا اور وہ آخری وقت تک سکندر مرزا پر تکیہ کئے رہے۔

مجھے وزیراعظم کی حیثیت سے سہروردی کا آخری دن یاد ہے۔ وہ لاہور گئے اور ری پبلکن پارٹی کے خلاف تقریر جھاڑ دی۔ واپس کراچی آئے تو ماحول بدلا ہوا تھا۔ استقبال کے لئے صرف دو چار آدمی تھے۔ میں نے گاڑی میں ان سے کہا جناب یہ آپ نے کیا کیا؟ وہ کہنے لگے "انہیں تمہیں نہیں پتہ۔" میں دوسرے روز وزیراعظم ہاؤس گیا تو وہ آنکھیں بند کر کے صوفے پر بیٹھے تھے اور وزراء ان کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ وہ چیخ رہے تھے بتاؤ سکندر مرزا سے کیا بات ہوئی؟ اب کیا ہوگا؟ وغیرہ وغیرہ۔ وہ مجھے لے کر برآمدے میں چلے گئے اور میرے کان میں سرگوشی کی "سکندر مرزا نے مجھے بلا کر کہا ہے۔ تم استعفیٰ دو گے یا میں تمہارے خلاف عدم اعتماد کرا دوں۔" میں نے استعفیٰ دے دیا۔ اب تم میرا سامان وغیرہ پیک کرا دو۔

ایوب خان کا مارشل لاء لگا تو میں لاہور سے ڈھاکہ جا رہا تھا۔ یہ شاید جنوری یا فروری ۵۹ء کی بات ہے۔ میں ایئرپورٹ کے وی۔ آئی۔ پی روم میں داخل ہوا تو وہاں متعدد فوجی جرنیل کھڑے تھے' ایک کونے میں سہروردی کرسی پر آنکھیں بند کئے بیٹھے تھے۔ میں بھی وہاں کھڑا ہو گیا انہوں نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور کہا۔

Altaf! tell me how has this martial Law regime

acquired the reputation of corruption such time?

میرے پسینے نکل گئے۔ مگر انہوں نے اسی اطمینان سے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ بعدازاں جہاز میں تمام جرنل ایک ایک کر کے ان کے پاس جاتے رہے اور نہایت ادب سے ان سے ملتے رہے۔ میری ان سے آخری ملاقات چٹا گانگ ایئرپورٹ پر ہوئی تھی۔ میں ڈھاکہ جا رہا تھا۔ ان سے اچانک ملاقات ہو گئی۔ ہم دونوں کی منزل ایک تھی۔ جہاز میں خرابی کے باعث ہمیں دو گھنٹے وہاں رکنا پڑا۔ ہم دونوں ایئرپورٹ کی چھت پر چلے گئے۔ وہاں بیٹھ کر انہوں نے مجھے اپنی زندگی کی ساری کہانی سنائی اور آخر میں کہا۔ الطاف اب میں نہرو کے پاس جا رہا ہوں کیونکہ تقسیم کی ساری سکیم ہی غلط تھی۔ اب ہم سارے علاقے کو لسانی بنیادوں پر از سر نو تقسیم کریں گے کیونکہ اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ اس ملاقات کے بعد وہ پوری دنیا کو لسانی بنیادوں پر تقسیم کرنے نکل کھڑے ہوئے۔ دنیا تو ان کے فارمولے کے مطابق تقسیم نہ ہوئی مگر وہ راستے ہی میں گم ہو گئے۔

حسین شہید سہروردی بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ ڈرتے نہیں تھے' دبتے نہیں تھے دشمنوں کے خلاف کارروائی نہیں کرتے تھے۔ اقتدار میں رہتے ہوئے انہوں نے کبھی فضل حق اور بھاشانی کے خلاف کارروائی نہیں کی۔ انہیں اقتدار سے الگ ہونے کا افسوس نہیں تھا۔ ایوب خان ان سے بہت خائف تھے کیونکہ انہیں معلوم تھا وہ سہروردی کو خرید سکیں گے اور نہ ہی ڈرا پائیں گے۔ سکندر مرزا نے ایوب کی مخالفت کے باوجود انہیں وزیراعظم بنایا تھا اور وہ سکندر مرزا کے خوف کے باوجود اپنی من مانی کرتے رہے تھے۔ وہ عملی اور فنی سیاست سے مکمل آگاہ تھے۔ جب ان کا انتقال ہوا تو ان کی کوئی جائیداد تھی نہ ہی کوئی بینک بیلنس۔

وہ بیروت میں فوت ہوئے تھے ان کے لواحقین کے پاس ان کی نعش تک لانے کی رقم نہیں تھی' وہ اقتدار میں آنے سے پہلے ٹیکسیوں پر سفر کرتے تھے ہوٹلوں میں رہتے تھے اور ریڑھیوں سے کھانا کھاتے تھے' اقتدار سے فارغ ہونے کے بعد بھی ان کی یہی صورتحال تھی۔ وہ جب وزیراعظم ہاؤس سے نکلے تھے تو ہمارے لیے یہ مسئلہ پیدا ہو گیا تھا کہ ہم ان کا سامان کہاں بھجیں کیونکہ پورے کراچی میں ان کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ بڑے عرصے تک ان کا سامان ان کے مختلف دوستوں کے گھروں میں پڑا رہا' ان کا کام کرنے کا طریقہ بھی بڑا دلچسپ تھا۔ ان کے کمرے میں دو سنگل بیڈ ہوتے تھے' ایک بیڈ پر وہ نیم دراز ہو جاتے تھے' ہم ساری فائلیں بیڈ پر ان کے پاس رکھ دیتے تھے۔ وہ فائل دیکھتے اور اسے دوسرے بیڈ کی طرف اچھال دیتے' دوسرے روز

جتنی فائلیں دوسرے بیڈ پر ہوتیں' ان کا مطلب ہوتا ''یس'' اور جتنی نیچے فرش پر پڑی ہوتیں وہ نامنظور ہو چکی ہوتیں لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ فائلیں پڑھتے نہیں تھے' وہ نہ صرف فائلوں کا بغور مطالعہ کرتے تھے بلکہ انہیں تمام فائلیں یاد ہوتی تھیں۔ اگر کسی روز ان کا عملہ منظور ہونے والی کسی فائل کو نامنظور ہونے والی فائلوں میں ڈال دیتا یا نامنظور ہونے والے کیس کے سلسلے میں منظوری کا خط جاری کر دیتا تو وہ فوراً پکڑ لیتے تھے۔

حسین شہید سہروردی کے بعد ملک فیروز خان نون وزیراعظم بنے۔ انہوں نے چند روز بعد مجھے طلب کیا۔ میں حاضر ہو گیا' انہوں نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور کہا۔ ''اوتے سیتو ہندے کن توں بڑا سوہنا وے پر توں تے ایویں ای اے (وہ مجھے کہتے تھے تم بڑے خوبصورت ہو لیکن تم تو یونہی سے ہو۔) میں ہنس کر رہ گیا بعدازاں انہوں نے مجھے اپنا ڈپٹی سیکرٹری رکھ لیا۔ نون کا دور سازشوں' جوڑ توڑ اور ہنگاموں کا دور تھا۔ مجھے ان کے بہت قریب رہنے کا موقع ملا وہ مجھ سے بڑی شفقت کرتے تھے۔

ان کے ساتھ کام کرنا بہت اچھا لگا۔ وہ دور لطائف سے بھرپور تھا مثلاً ملک فیروز خان نون کے پاس لیبر لا کا ایک ماہر انگریز آیا اور انہیں لیبر قانون کے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔ انہوں نے انگریز کو ٹوکا اور کہا۔ No this is not law. اس نے کہا۔ سر یہ قانون ہے تو وہ چلائے۔ Rubbish, I say this is not law. اور مجھے حکم دیا ''اسے لے جاؤ اور اسے سمجھاؤ'' میں انگریز کو اپنے کمرے میں لے گیا اور کہا ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں وزیراعظم کو سمجھاؤں گا۔'' بعدازاں میں وزیراعظم کے دفتر گیا تو انہوں نے مجھ سے پوچھا وہ کیا کہہ رہا تھا۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ کہنے لگے تم نے مجھے اس وقت کیوں نہیں بتایا۔ میں نے کہا جناب میں اس کے سامنے کیسے کہہ سکتا تھا کہ آپ غلط ہیں۔ انہوں نے تھوڑا سوچا اور کہا۔ میں جب بھی غلط بات کہوں تم اپنے کان کی لو مسلنا شروع کر دیا کرو۔ میں فوراً سمجھ جاؤں گا۔ اس روز کے بعد کان کی لو مسلنا میری سرکاری ذمہ داری ہو گئی' میرے ساتھی اکثر حیران رہتے تھے کہ میں وزیراعظم کی موجودگی میں کان کی لو کیوں مسلتا رہتا ہوں۔ دوسری طرف جوں ہی میرا ہاتھ کان تک پہنچتا وزیراعظم فوراً اپنا موقف تبدیل کر لیتے۔

وزیراعظم لاہور آئے تو ان کا ایک پرانا ساتھی شریف میرے پاس آیا۔ (یہ بعدازاں سیکرٹری ایجوکیشن بنے تھے) اور ملک صاحب سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ میں اسے

وزیراعظم کے کمرے میں چھوڑ آیا۔ آدھا گھنٹہ بعد شریف سخت غصے میں باہر نکلا۔ ملک فیروز خان نون اس کے پیچھے پیچھے تھے اور زور زور سے کہہ رہے تھے۔ ''شریف روٹی کھا جا میری روٹی وچ نون نہیں ہوندا۔'' (شریف کھانا کھا جاؤ میرے کھانے میں نمک نہیں ہوتا۔) میں نے معاملہ پوچھا تو کہنے لگے ''شریف مجھے کہہ رہا تھا مجھے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا چیئرمین بنا دو۔ میں نے کہا شریف تم اس کے لئے کوالی فائی نہیں کرتے تو کہنے لگا جناب آپ وزارت عظمیٰ کے لئے کوالی فائی کرتے ہیں؟''

ایک روز مجھے بلا کر کہنے لگے ''یار یہ پطرس بخاری عجیب آدمی ہے۔ میں نے اسے اپنی کتاب ''فرام میموری'' پڑھنے کے لئے دی' دو تین ہفتے بعد پوچھا' کیسی ہے تو کہنے لگا جناب بڑی شاندار کتاب ہے بس اگر اس کا انگریزی میں ترجمہ ہو جائے تو کیا بات ہے۔ لو تم بتاؤ..... انگریزی کی کتاب کا انگریزی میں ترجمے کا مشورہ دے رہا ہے۔''

جب دورے پر جاتے تھے تو میں ریل گاڑی میں ان کے سیلون میں بیٹھتا تھا اور ناشتے کے بعد انہیں فائلیں پڑھ پڑھ کر سناتا تھا جس کے بعد وہ مجھے آرڈر لکھواتے تھے۔ میں فائل اونچی آواز میں پڑھتا تھا۔ بعض اوقات لیڈی نون بول پڑتیں۔

Darling you must not agree with this, this is a bad proposal.

تو وہ پنجابی میں کہتے۔ ''بولن دے سو'' لیکن وہ فیصلہ ہمیشہ درست کرتے تھے۔ انہوں نے قتل کے مقدمہ میں کبھی رعایت نہیں کی ان کا ہمیشہ وہی فیصلہ ہوتا تھا جو عدالت کرتی تھی خواہ کتنا ہی دباؤ کیوں نہ ہو۔

رات کو جب ناؤنوش کی محفل سجتی' یا انہیں دوست احباب گھیر لیتے اور ان سے زبردستی احکامات جاری کرانے کی کوشش کراتے تو ان حالات میں جاری ہونے والے احکامات کے بارے میں مجھے ہدایت تھی کہ ان پر ہرگز عملدرآمد نہ کروں۔ مثلاً ایک مرتبہ مجھے وزیراعظم ہاؤس طلب کیا گیا۔ میں حاضر ہوا وہاں مظفر علی قزلباش بیٹھے تھے وہ شکایات کر رہے تھے۔ فلاں افسر تنگ کر رہا ہے اس کا تبادلہ کر دیا جائے۔ فلاں کو فلاں جگہ لگا دیا جائے وغیرہ وغیرہ۔ ملک صاحب نے مجھے حکم دیا' ان سب کے نام لکھو اور فوری طور پر آرڈر جاری کرو۔ جسٹ ناؤ۔ میں نے کہا۔ یس سر۔ باہر آیا اور گھر جا کر اطمینان سے سو گیا۔ دوسرے روز دس بجے دفتر آیا تو انہوں نے پوچھا

رات کے احکامات کا کیا بنا۔ میں نے کہا "کچھ بھی نہیں" انہوں نے ممنونیت سے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر بولے ٹھیک ہے۔ مگر اس قسم کی کارروائیوں سے مشہور ہو گیا وزیر اعظم تو آرڈر دے دیتے ہیں سیکریٹری شرارت کر جاتا ہے لیکن میں جانتا تھا یہ سب کچھ میری سرکاری ڈیوٹی کا حصہ ہے۔

وہ مجھے ایک بار اپنی زمینوں پر سرگودھا لے گئے۔ صبح ناشتے کی میز پر مجھے سرخ شرٹ میں ملبوس دیکھا تو کہنے لگے۔ "بلاشبہ یو آر لوکنگ کمیونسٹ" پھر ان کی حس مزاح پھڑک اٹھی اور زمینداروں کے قصے سنانے لگے۔ کہنے لگے پہلے جہاں آج لاہور کا واپڈا ہاؤس ہے وہاں پاکستان بننے سے پہلے پنیپنز ہاؤس ہوتا تھا۔ یہ انگریز ڈپٹی کمشنر کی رہائش گاہ تھی۔ ہر سال یکم جنوری کو ہم پنجاب کے سارے زمیندار پگڑ باندھ کر گلے لگا کر شراب اور پھلوں کی ٹوکریاں لے کر ڈپٹی کمشنر کو نئے سال کی مبارکباد دینے جاتے۔ ہندو سکھ اور مسلمان زمیندار صبح نو بجے صحن میں شامیانوں کے نیچے جمع ہو جاتے۔ اندر ڈپٹی کمشنر صاحب شراب پی کر سوئے ہوتے اور ہم باہر کھڑے انتظار کرتے رہتے کہ وہ اٹھیں اور ہم انہیں مبارکباد دے کر اجازت لیں۔ گیارہ بارہ بجے کے قریب صاحب بہادر کا چپراسی چق اٹھا کر باہر آتا اور کہتا "صاحب بولا سلام ہو گیا۔" اور ہم خوشی سے ایک دوسرے کو گلے لگاتے مبارکباد دیتے شراب اور پھلوں کی ٹوکریاں وہاں چھوڑتے اور واپس آ جاتے ہماری انگریز کے سامنے یہ اوقات تھی۔ ہم لوگ تو آخر وقت تک انگریز کے غلام تھے۔ ہم زمینداروں نے انہیں بڑا سمجھایا حضور آپ لوگ واپس نہ جائیں ہم پر مہربانی کریں لیکن وہ نہ مانے۔ ہم نے ۴۶ء کے آخر میں مسلم لیگ کو سپورٹ کرنا بھی شروع کر دیا لیکن ہم اندر سے انگریز سے بہت ڈرتے تھے۔

گوادر اور بیروباری کی پاکستان میں شمولیت ملک فیروز خان نون کا کارنامہ تھا۔ بیروباری مشرقی پاکستان کے ضلع ٹھاکر گاؤں کا حصہ تھا۔ تقسیم کے دوران بیروباری بھارت اور اس کے اردگرد کا علاقہ پاکستان کو دے دیا گیا۔ اس تقسیم سے جغرافیائی مسائل بن گئے۔ نون نے بیروباری کا ذکر کیا تو میں نے بتایا کہ میں اس سارے علاقے کو جانتا ہوں وہ بڑے خوش ہوئے میں نے انہیں نقشہ بنا کر سمجھایا۔ وہ دو تین دن تک ہاتھ سے بیروباری کا نقشہ بنانے کی پریکٹس کرتے رہے پھر مجھے اپنے ساتھ دہلی لے گئے جہاں انہوں نے بیروباری کے مسئلے پر نہرو سے مذاکرات کئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے وہاں نہرو نون میں اور فارن سیکرٹری تھے۔ نون نے نہرو کو

ہاتھ سے سارے علاقے کا نقشہ بنا کر دکھایا تو نہرو بڑے متاثر ہوئے اور کہا۔ مسٹر وزیر اعظم آپ تو مجھ سے زیادہ اس مسئلے کو سمجھتے ہیں۔ یہ آپ کا ہی علاقہ لگتا ہے میں بنگال والوں سے بات کروں گا بعد ازاں مشترکہ یادداشت میں بیروباری کو پاکستان کا حصہ قرار دے دیا گیا۔ اس پر بنگال میں نہرو کے خلاف بڑا ایجی ٹیشن ہوا۔ جھگڑے ہوئے بنگالی سپریم کورٹ میں گئے لیکن فیصلہ ہو چکا تھا۔ گوادر اومان کا حصہ سمجھا جاتا تھا۔ دشت بنجر اور خشک پہاڑیوں پر مشتمل اس علاقے کے مستقبل کا فیصلہ انگریزوں کے ہاتھوں میں تھا۔ گوادر میں اس وقت کوئی مسلمان نہیں تھا۔ مچھلی کے کاروبار اور سمگلنگ پر ہندو چھائے ہوئے تھے۔ ہمیں خطرہ تھا اومان کہیں یہ علاقہ بھارت کو نہ دے دے۔ فیروز نون صورتحال کی نزاکت بھانپ گئے اور انہوں نے برطانوی وزیر اعظم میک ملن سے رابطہ کیا۔ میک ملن ان کے پرانے جاننے والے تھے اس حوالے سے گوادر پاکستان کو مل گیا۔ ملک فیروز نے یہ کام اس وقت کیا جب ان کی حکومت چند دنوں کی مہمان تھی اور انہیں خود مستقبل قریب میں رونما ہونے والے حالات کا ادراک تھا لیکن وہ ایک محب وطن سیاستدان تھے۔

سکندر مرزا نے ملک فیروز خان سے بھی چھٹکارا پانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ ۵۷ء کے آخر میں مارشل لاء لگانا چاہتے تھے لیکن امریکیوں نے انہیں روک دیا تھا بعد ازاں ۵۸ء میں وزیر خزانہ امجد علی شاہ اور ایوب خان امریکہ گئے اور امریکی انتظامیہ کو سمجھا لیا کہ آپ پاکستان میں الیکشن نہ کرائیں ورنہ بھاشانی اور عبدالغفار خان جیسے کمیونسٹ برسر اقتدار آ جائیں گے۔ پاکستان میں صرف فوجی راج ہی تمہارے لئے سودمند ہے۔ نون کی بدقسمتی ملاحظہ کریں خود اس کا وزیر خزانہ اور کمانڈر انچیف امریکہ میں حکومت کے خلاف مذاکرات کر رہے تھے اور انہیں خبر تک نہیں تھی۔

ایوب خان کی مدت ملازمت ختم ہونے والی تھی اور انہیں توسیع کی بڑی فکر تھی۔ سکندر مرزا انہیں یہ کہتے تھے کہ یہ وزیر اعظم کا کام ہے میں اس سے بات کروں گا اور خود نون سے کہتے تھے تم اسے ذرا ڈرا کر رکھو۔ جوں جوں ریٹائرمنٹ کا وقت قریب آ رہا تھا ایوب خان توں توں پریشان ہوتے جا رہے تھے۔ پھر وزیر اعظم راولپنڈی کے دورے پر آئے تو وہ ایوب خان کے پاس ٹھہرے اور ایوب کو ایکس ٹینشن دے دی گئی جس کے فوراً بعد ایوب نے امریکیوں کے ساتھ مل کر جو منصوبہ تیار کیا تھا اس کی زمین ہموار ہو گئی۔ سکندر مرزا نے فیروز خان نون کی چھٹی کرا دی اور چند ہی روز بعد ایوب خان نے سکندر مرزا کو نکال باہر کیا۔

ملک فیروز خان نون کی قوت فیصلہ بہت زبردست تھی۔ وہ حالات وواقعات سے آگاہ

تھے۔ انہیں علم تھا آرمی آ رہی ہے اس لئے وہ ایوب خان کی ملازمت میں توسیع نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن سکندر مرزا نے انہیں مجبور کر دیا۔ پنجاب میں مظفر علی قزلباش نے انہیں بہت تنگ کیا ہوا تھا۔ نون نے سسٹم کو بچانے کی بڑی کوشش کی لیکن ان کا بس نہ چلا۔ وہ بہت ایماندار تھے، دلیر تھے اور سب سے بڑھ کر ان میں حس مزاح بہت زیادہ تھی۔ پھلجھڑیاں چھوڑتے رہتے تھے۔ مجھے ان کے فیملی ممبر کی حیثیت حاصل تھی۔ وہ بہت پڑھے لکھے تھے۔ انگریزی اچھی طرح بولتے تھے ان کی بیوی غیر ملکی تھی۔

ذوالفقار علی بھٹو سے میری ملاقات کسی حادثے سے کم نہیں تھی۔ ۵۶ء میں جب میں کراچی کا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھا تو صاحبزادہ حسن محمود ایک خوبصورت نوجوان اپنے ساتھ میرے دفتر لائے اور مجھ سے کہا۔ "یہ ذوالفقار علی بھٹو ہیں انہیں گن لائسنس چاہیے۔" میں بھٹو کو بالکل نہیں جانتا تھا۔ اس وقت وہ زیادہ جانے پہچانے بھی نہیں جاتے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا "آپ کے پاس پہلے کوئی گن لائسنس ہے۔" "۳۵"۔ بھٹو نے جواب دیا۔ میں نے کہا یہ کافی ہیں آپ کو مزید لائسنس کی ضرورت نہیں۔ انہوں نے کہا اچھا اور اُٹھ کر چلے گئے۔ اور مجھے قطعاً خبر نہیں تھی کہ میں کتنی سنگین غلطی کر چکا ہوں اور اب مجھے اس کی عمر بھر سزا ملے گی۔

ایوب خان کے مارشل لا میں مجھے امپورٹس اینڈ ایکسپورٹس کا چیف کنٹرولر بنا دیا گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کامرس منسٹر تھے۔ میں چارج لینے کے بعد ان سے ملنے گیا تو وہ تپے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے جھاڑ پلا دی۔ "ان لوگوں نے مجھ سے پوچھے بغیر تمہیں پوسٹ کر دیا۔ میں نے اب چیک کیا تو تم میرے پلے باندھ دیئے گئے۔ مجھے ابھی تک اپنی توہین نہیں بھولی۔" وغیرہ وغیرہ۔ میں حیران رہ گیا کیونکہ لائسنس والا واقعہ میرے ذہن سے بالکل محو ہو چکا تھا۔ میں نے کہا جناب میں کچھ سمجھا نہیں، انہوں نے کہا۔

Don't you remember when you were District Magistrate and I came to you with Hussain Mehmood and you refused to issue a licence to me.

میں نے کہا۔ جناب میرا جواب تو کوئی اتنا بُرا نہیں تھا۔ وہ چلائے۔ تمہیں نہیں معلوم زمینداروں کے لئے لائسنس کتنے اہم ہوتے ہیں اور انکار کتنا بُرا۔ میں نے کہا جناب میں بنگال سے آیا تھا وہاں کسی نے مجھ سے کبھی لائسنس نہیں مانگا تھا لہٰذا مجھے اس کی اہمیت کا اندازہ ہی نہیں تھا۔۔۔۔ اور پھر ہماری دوستی ہو گئی لیکن لائسنس والا واقعہ بھٹو نے کبھی فراموش نہ کیا۔

بھٹو کی یادداشت بڑی غیر معمولی تھی۔ آرٹ و ادب اور عالمی امور سے انہیں بڑی دلچسپی تھی۔ ان کی ذاتی لائبریری بہت شاندار تھی۔ ان دنوں ان کی تقریریں لکھنے کی ذمہ داری میرے پاس تھی۔ ایک مرتبہ تصاویر کی کوئی نمائش تھی بھٹو نے وہاں تقریر کرنا تھی۔ انہوں نے مجھے بلایا اور تقریر لکھنے کا کہا۔ میں نے کہا جناب آپ کو پینٹنگز کا کیا پتہ؟ ہنس کر کہنے لگے اسی لئے تو تمہیں تقریر تیار کرنے کا کہا ہے خیر میں نے لکھ دی۔ دوسرے روز وہ نمائش میں گئے اور کہا۔ "آج کل زیادہ تر وزیر لکھی ہوئی تقریریں پڑھتے ہیں، میں بھی چاہتا تو ایسا کر سکتا تھا کسی نالائق بیورو کریٹ کو کہتا اور وہ میری تقریر لکھ دیتا لیکن میں ایسا نہیں کرتا کیونکہ آرٹ اور کلچر میں میرا اپنا ایک نظریہ ہے اور اس کے بعد انہوں نے میری لکھی ہوئی تقریر ساری کی ساری زبانی پڑھ دی۔ تقریب کے بعد وہ مجھے دیکھ کر شرارتی لہجے میں بولے "کیوں پھر؟" اور میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے جناب۔"

میں پاکستان ٹریڈ سے غیر ملکی کمپنیوں کا اثر و رسوخ کم کرنا چاہتا تھا۔ بھٹو اس سلسلے میں میری حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ بھٹو فیصلہ کرتے اور میں فوری طور پر اس پر عملدرآمد شروع کر دیتا۔ یہ بات امریکہ کو بُری لگی کیونکہ اس وقت ملک میں امداد آ رہی تھی لہٰذا بھٹو کے خلاف امریکی شکایات شروع ہو گئیں۔ جب یہ دباؤ بڑھا تو ایوب خان نے بھٹو سے وزیر تجارت کا پورٹ فولیو لے لیا اس کے بعد بھٹو سے میرا رابطہ کم ہو گیا۔

بھٹو خامیوں اور خوبیوں کا عجیب مجموعہ تھا۔ وہ جب کسی شخص کو دوست بنانے کا فیصلہ کر لیتا تو دوسرے شخص کے پاس بھٹو کی دوستی کے علاوہ کوئی چوائس نہیں رہتی تھی۔ بڑا رنگین مزاج اور رنگیلا آدمی تھا۔ سول سرونٹس کو علم ہونے سے قبل ان سے اس کی دوستی ہو چکی ہوتی تھی۔ کھل کر بات نہیں کرتا تھا، سول سرونٹس کو ایک دوسرے کے بارے میں کریدتا رہتا تھا۔ اس کو بیورو کریسی کے تمام معاملات کی خبر ہوتی تھی لیکن وہ انہیں صرف اپنی حد تک رکھتا تھا۔ اپنی معلومات کو کسی کے خلاف استعمال نہیں کرتا تھا۔ ایوب خان کا بڑا مداح تھا۔ ان کا بنا بنا ہوا تھا۔ کیبنٹ میں کبھی ایوب خان کی مرضی کے خلاف بات نہیں کرتا تھا۔ اپنے ساڑھے پانچ برس کے حکومتی قرب کے دوران میں نے اسے کبھی ایوب خان سے اختلاف کرتے نہیں دیکھا۔

میں ایوب خان کے دور میں انفارمیشن سیکرٹری بنا تو بھٹو کے ساتھ میرا قرب بڑھ گیا۔ میں اور بھٹو اینٹی امریکن کیمپ سمجھے جاتے تھے جبکہ وزیر خزانہ محمد شعیب اور نواب آف کالا باغ

امریکی نواز ان دنوں ٹائم اور نیوز ویک میں میرے اور بھٹو کے خلاف آرٹیکل بھی چھپتے تھے لیکن میں کسی گروپ میں نہیں تھا۔ بس بھٹو سے میری دوستی تھی اور بھٹو وہ واسطے قرب کے باوجود کہ ہم کانفرنسوں میں اکٹھے جاتے' تقریریں کرتے اور ملتے ملاتے رہتے لیکن وہ مجھ سے ہمیشہ محتاط رہتا تھا۔ ۶۵ء کے الیکشن کے دوران سندھ میں بھٹو کی پوزیشن بہت خراب تھی۔ وہ تو الیکشن بھی نہیں لڑنا چاہتے تھے اس کی وجہ مس فاطمہ جناح تھیں۔ وہ بھٹو سے ناراض تھیں۔ انہوں نے حیدرآباد کے جلسہ عام میں بھٹو پر شراب نوشی اور عورتوں کا الزام لگا دیا' بھٹو اس الزام سے گھبرا گیا' ان دنوں لوگ فاطمہ جناح کی بات کو حرف آخر سمجھتے تھے۔ مجھے معلوم ہوا تو میں نے ایوب خان سے کہا آپ اپنی تقریر میں ذوالفقار علی بھٹو کا دفاع کریں کیونکہ وہ آپ کا وزیر خارجہ ہے۔ صدر ایوب نے میری بات مان لی جس کے بعد بھٹو کی پوزیشن بہتر ہوگئی۔

۶۵ء کی جنگ سازش نہیں تھی لیکن پھر بھی بعض باتیں کھٹکتی ہیں مثلاً جبرالٹر سازش محسوس ہوتا ہے۔ فروری ۶۵ء میں یہ بھٹو' عزیز احمد اور آئی ایس آئی نے کابینہ کی انٹیلی جنس کمیٹی میں پیش کیا جسے سن کر ایوب خان نے سب کو ڈانٹ دیا اور کہا میں نے تو تم لوگوں کو صرف کشمیر پر نظر رکھنے اور بھارت پر دباؤ بڑھانے کا کہا تھا لیکن تم نے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس میٹنگ میں بھٹو سارا عرصہ خاموش رہے لیکن سیکرٹری خارجہ عزیز احمد گرمجوشی دکھاتے رہے پھر میں ایوب خان کے ساتھ روس چلا گیا تو وہاں ایک روز صدر نے بتایا ان لوگوں نے میری غیر موجودگی میں جنگ چھیڑ دی ہے۔ ہم واپس آئے تو ملک میں رن آف کچھ کا بڑا ''یوفوریا'' تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا پاک فوج نے بھارت کو مار مار کر بھگا دیا ہے۔ ایوب خان نے واپس پہنچتے ہی جنگ بند کرا دی لیکن ان پر اس یوفوریا کا بڑا اثر ہوا۔ اسی دوران یہ بات چل نکلی کہ یہ بھارت پر حملے کا بہترین وقت ہے۔ پھر یہ لوگ مئی ۶۵ء میں ایوب خان کو مری لے گئے اور وہاں جنرل اختر ملک نے ایوب خان کو جبرالٹر کا پلان سمجھایا اور انہوں نے انہیں مقبوضہ کشمیر اور اکھنور پر حملے کی اجازت دے دی۔

مجھے مزید چند باتیں بھی بری طرح کھٹکتی ہیں مثلاً یہ سارا آپریشن مجھ سے خفیہ رکھا گیا۔ بھٹو جو مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتے تھے' انہوں نے بھی ذکر نہ کیا جبکہ ہم اس دوران الجیریا کے دورے پر بھی گئے۔ ہاں ایک مرتبہ انہوں نے اتنا ضرور کہا کہ میں نے تم سے ضروری بات کرنی ہے لیکن پھر وہ کچھ سوچ کر خاموش ہو گئے۔ ان لوگوں نے ایوب خان کو بھی مجھے اس آپریشن سے الگ رکھنے کے لئے قائل کر لیا تھا۔ شاید ان لوگوں کا خیال تھا کہ ایوب خان میری بات کا نوٹس

لیتے ہیں اور میں انہیں اس اقدام سے باز رکھ سکتا ہوں۔ ان کا یہ خیال بھی تھا کہ میرا چین سے رابطہ ہے اور یہ لوگ اس آپریشن کی بھنک چینیوں کو نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ دوسرے ان لوگوں نے ایوب خان کو مشورہ دیا کہ وہ آپریشن کے دوران چھٹیاں گزارنے کے لئے سوات چلے جائیں کیونکہ وہ یہاں رہیں گے تو بھارت سمجھے گا کوئی سازش ہو رہی ہے' ایوب خان نے ان کی یہ بات بھی مان لی' وہ سوات گئے اور وہاں انہوں نے شاہ ولی اللہ کا مطالعہ شروع کر دیا۔ ایوب خان کے جانے کے بعد ان لوگوں نے فوجی جوانوں کو چھٹیاں دے دیں۔ بھٹو اور عزیز احمد میرے سامنے ایوب خان کو یقین دلاتے تھے کہ انہیں گارنٹی دے دی گئی ہے کہ بھارت بین الاقوامی بارڈر کراس کر کے پاکستان پر حملہ نہیں کرے گا۔ جنگ شروع ہوئی تو بھارت نے بارڈر عبور کر لیا۔ کابینہ کے اجلاس میں ان لوگوں کو ان کی باتیں یاد کرائی گئیں تو ان لوگوں نے کہا۔ وہ تو ہماری رائے تھی۔ تیسرا یہ لوگ جن کشمیری مجاہدین کی بنا پر اتنا بڑا آپریشن شروع کرنے والے تھے ان کا ان سے رابطہ تک نہیں تھا۔ یہاں تک کہ لندن میں ان کی فاروق عبداللہ سے بات تک نہیں ہوئی تھی۔ آپریشن کے سلسلے میں کسی کور کمانڈر تک کو اعتماد میں نہیں لیا گیا تھا۔ چوتھا یہ آپریشن مئی میں فائنل ہوا تو جون میں سیکرٹری دفاع نذیر احمد نے واہگہ بارڈر سے بارودی سرنگیں اٹھوا دی تھیں۔ جنگ کے بعد جب انکوائری شروع ہوئی تو جنرل موسیٰ نے کہا سرنگیں بارشوں کی وجہ سے بے کار ہو گئی تھیں اس لئے ہٹوانا پڑیں جبکہ میں نے محکمہ موسمیات سے رپورٹ نکلوائی تو اس ماہ وہاں صفر میٹر بارش ہوئی تھی۔ آپریشن شروع ہوا تو ۱۸ اگست کو آئی ایس آئی نے اعلان کر دیا مقبوضہ کشمیر میں ہمارے سارے رابطے منقطع ہو چکے ہیں اور فوجیوں نے کہا ہمارے ٹرانس میٹر خراب ہو گئے ہیں۔ اب ہمیں کچھ پتہ نہیں وہاں کیا ہو رہا ہے۔

جبرالٹر کا آپریشن ناکام ہو گیا تو جنرل موسیٰ بھاگتے ہوئے بھٹو کے پاس آئے (میں بھی وہاں موجود تھا) اور کہا۔ ''بھٹو میرے فوجی بری طرح پھنس چکے ہیں' بھارتی مظفرآباد پر نظریں گاڑے بیٹھے ہیں اب اکھنور پر حملے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔'' بھٹو نے کہا ''ٹھیک ہے کر لو۔'' موسیٰ نے کہا ''اس کے لئے ہمیں بین الاقوامی بارڈر کراس کرنا پڑے گا جس کے لئے صدر کی اجازت ضروری ہے۔'' بھٹو فوری طور پر سوات گئے اور ایوب خان کا آرڈر لے آئے جس کے بعد ہماری فوجیں بھارتی سرحد عبور کر کے اکھنور کی طرف بڑھنا شروع ہو گئیں وہاں انہیں بری طرح مار پڑی۔ جب ایوب خان سوات سے واپس راولپنڈی آئے تو ان لوگوں نے انہیں فتوحات کی نماط

ریویو پیش کرنا شروع کر دیں لیکن وہ معاملے کو بھانپ گئے اور انہوں نے آپریشن کی کمان جنرل اختر ملک سے لے کر جنرل یحییٰ خان کو دے دی۔

۴ ستمبر ۶۵ء کو بھارت میں ہمارے ہائی کمشنر میاں ارشد حسین نے ترکی کے سفیر کو ایک پیغام دیا جس نے وہ پیغام استنبول بھیجا اور وہاں سے کراچی میں ترکی کے سفیر کو پاس کر دیا گیا۔ اس نے اسی رات یہ پیغام پاکستان کے سیکرٹری خارجہ عزیز احمد تک پہنچا دیا۔ انہوں نے پیغام پڑھا تو اس میں لکھا تھا بھارت ۶ ستمبر کو پاکستان پر حملہ کرنے والا ہے۔ وہ فوری طور پر بھٹو کے پاس پہنچے اور انہیں یہ پیغام دکھایا۔ بھٹو نے یہ پیغام پڑھنے کے بعد کہا۔ ارشد حسین نروس ہو گیا ہے' ایسے ہی بے تکی باتیں کر رہا ہے۔ یہ خط ایوب تک پہنچا تو وہ گھبرا جائے گا تم جا کر سو جاؤ۔ جنگ کے بعد جب ارشد حسین نے پاکستان کابینہ کے اجلاس میں شور مچایا تو بھٹو اور عزیز احمد کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

۴ ستمبر کو میں اور وزیر اطلاعات شہاب الدین ڈھاکہ تھے۔ وہاں شام کو ہم نے ریڈیو پر بھارتی وزیر اعظم لال بہادر شاستری کا وہ خطاب سنا جس میں اس نے قوم کو جنگ کے لئے تیار رہنے کی صاف صاف ہدایت کی تھی۔ تقریر ختم ہوتے ہی میں نے شہاب الدین سے کہا اب یہاں ایک منٹ کے لئے ٹھہرنا بے وقوفی ہو گی ہمیں فوری طور پر بنگلہ دیش سے نکل جانا چاہیے۔ ہم ۵ ستمبر کو ڈھاکہ سے کراچی آ گئے۔ یہ ڈھاکہ سے مغربی پاکستان آنے والی آخری فلائٹ تھی۔ یہاں آ کر انکشاف ہوا کہ لال بہادر شاستری کی اس تقریر کی اطلاع ایوب خان کو فارن آفس نے دی اور نہ ہی جی ایچ کیو نے۔ یہاں تک کہ ۶ ستمبر کی صبح ایوب خان کو ایئر فورس کے ایک آفیسر نے جگا کر خبر دی تھی کہ بھارت نے ہم پر حملہ کر دیا ہے۔

میں ۶ ستمبر کی صبح اسلام ایئر پورٹ پر اترا تو میرے جوائنٹ سیکرٹری نے بتایا۔ صدر آپ کو طلب کر رہے ہیں۔ میں ایوان صدر پہنچ گیا۔ وہاں باہر وزراء کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ صدر کا ملٹری سیکرٹری ملا اور کہا صدر کا حکم ہے آپ فوری طور پر ان کے لئے تقریر لکھیں۔ صبح آغا شاہی اور بھٹو نے تقریر لکھی تھی لیکن صدر نے وہ مسترد کر دی۔ میں نے کہا جناب جب تک میں صدر سے بات نہ کر لوں تقریر کیسے لکھ سکتا ہوں۔ ملٹری سیکرٹری نے صدر کو جی ایچ کیو فون کر دیا وہ فوری طور پر آ گئے۔ میں نے دیکھا وہ بہت مطمئن تھے۔ مجھ سے معمول کے مطابق حال احوال پوچھا ڈھاکہ کی حالت پوچھی بعد ازاں بتایا صبح امریکی سفیر آیا تھا اور مجھے کہنے لگا

Mr. President the Indian have got you by the neck تو میں نے کہا۔ The Indian don't know the people they have taken on، میں نے فوراً کہا۔ ''سر بس ٹھیک ہے میں سمجھ گیا آپ کو کس قسم کی تقریر چاہیے۔'' اور اس کے بعد میں نے ۶۵ء کی جنگ کی وہ معرکۃ الآرا تقریر لکھی جس نے پوری قوم کا مورال بلند کر دیا۔ یہ تقریر دن گیارہ بجے ریکارڈ ہوئی تھی۔ میں نے ساڑھے دس بجے یہ مکمل کی۔ ایوب خان نے پڑھی میں نے لکھا تھا۔ I have virtually تو انہوں نے Virtually کاٹ دیا۔ تقریر ریکارڈ ہو گئی تو اس تقریر کا اردو میں ترجمہ کیا گیا۔ اس تقریر کے بعد صدر کی تمام تقریروں کا بوجھ مجھ پر پڑ گیا۔ مجھے یاد ہے میں نے جنگ کی اختتامی تقریر لکھی اور کاتب اس مقام پر آیا کہ ہم فائر بندی کر رہے ہیں تو اس نے رونا شروع کر دیا میرے پاس آج بھی تقریر کا وہ صفحہ موجود ہے جس پر کاتب کے آنسوؤں کے نشان ہیں۔

۶۵ء کی جنگ کو آرڈینیشن کی بدترین مثال ہے۔ فوج کو یہ پتہ نہیں تھا۔ کمانڈر انچیف کہاں ہے اور کمانڈر انچیف کا نیوی سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ ایئر مارشل نور خان سے پوچھیں تو وہ کہتے فوج تو لڑ ہی نہیں رہی' سارا کام ایئر فورس کو کرنا پڑ رہا ہے۔ پیچھے رہ گئے نیوی والے تو وہ کراچی میں بیٹھ کر جھوٹی فتوحات کا اعلان کر رہے تھے۔ جنگ کے لئے تیاری سرے سے نہیں تھی اور حکمت عملی کی یہ حالت تھی ان لوگوں نے ایئر مارشل اصغر خان کو جس نے پاک فضائیہ کی بنیاد رکھی جس نے اسے سٹیبلش کیا۔ اسے جولائی میں ریٹائر کر دیا اور ان کی جگہ ان ایئر مارشل نور خان کو لگا دیا جو عرصے سے کمرشل لائن اختیار کر چکے تھے۔ کشمیر کمیٹی نے کشمیریوں سے کوئی رابطہ نہ کیا۔ مقبوضہ کشمیر میں (جبرالٹر آپریشن) گوریلا جنگ کے لئے ایسے کمانڈوز بھیج دیئے گئے جن کا کمانڈر کرنل غفار مہدی چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے میرے لوگ اس قابل نہیں انہیں وہاں نہ بھیجو شہریوں کی کوئی تربیت نہیں۔ جنگ ہو رہی ہے اور لوگ چھتوں پر کھڑے ہو کر ہوائی جہازوں کی لڑائی کا نظارہ کر رہے ہیں۔ یہ جنگ نہیں ہڑبونگ تھی۔

جنگ کے دوران ہمارے پاس ہتھیار ختم ہو گئے۔ سرحدوں پر صورتحال بہت خراب تھی۔ مشرقی پاکستان سے کوئی رابطہ نہیں تو ایک روز ایوب خان نے مجھ سے پوچھا۔ اب کیا کریں۔ میں نے کہا۔ سر آپ کے پاس چین کا کارڈ ہے آپ وہ استعمال کیوں نہیں کرتے۔ ایوب خان چونک اٹھے اور کابینہ کی میٹنگ بلا لی۔ پھر اسی رات وہ خفیہ طور پر چین چلے گئے ہم نے

یہ بات ان کے گھر والوں تک سے چھپائی تھی۔ صبح بیرا معمول کے مطابق بیڈروم میں چائے لے کر گیا واپسی پر پیالی خالی تھی۔ گارڈز تک کو یہ علم نہیں تھا کہ صدر ایوانِ صدر میں موجود نہیں ہیں۔ چین میں چو این لائی نے ان سے کہا۔ ''ہم آپ کی پوری مدد کریں گے۔'' ایوب خان نے پوچھا ''کہاں تک'' اس نے جواب دیا' ''جہاں تک تم کہو گے۔'' ایوب نے حیران ہو کر کہا'' آپ بہت بڑا رسک نہیں لے رہے'' وہ بولا۔ ''نہیں ہم نے سوچ لیا ہے' تم جنگ لڑو خواہ تمہیں پہاڑوں تک پسپا کیوں نہ ہونا پڑے تم ہم سے جو چاہو گے ہم دیں گے۔ لیکن ہم سے غلط بیانی نہ کرنا کیونکہ دوستوں میں یہ نہیں ہونا چاہیے۔'' ایوب خان واپس آئے تو وہ ڈبل مائنڈڈ تھے وہ جنگ لڑنا چاہتے تھے لیکن پاکستان کے لیڈر اور فوجی لڑائی کے لئے تیار نہیں تھے چنانچہ ایوب خان نے چینی کارڈ استعمال نہیں کیا۔

۶۵ء کی جنگ میں بھٹو کا کردار بہت بُرا تھا۔ بھٹو کا مزاج سازشی تھا۔ وہ جھوٹ بہت بولتا تھا۔ اس میں دوسروں کو بےوقوف بنانے کی ساری صلاحیتیں موجود تھیں۔ اس نے ایوب خان کو بےوقوف بنایا کہ ہمیں گارنٹی مل گئی ہے' بھارت پاکستان پر حملہ نہیں کرے گا۔ جنگ کے دوران اسے ڈر تھا ایوب خان اس کے اور جنرل موسیٰ کے خلاف انکوائری آرڈر نہ کر دے لہٰذا وہ سیکورٹی کونسل میں بھی جانے کے لئے تیار نہیں تھا ایک مرتبہ تو ایس ایم ظفر گئے جب بھٹو کو یقین ہو گیا کہ اس نے حکومت سے تو بےدخل ہو ہی جانا ہے تو اس نے سوچا چلو اب عوام کو ہی اپنے ساتھ شامل کر لوں۔ پھر وہ سیکورٹی کونسل گیا وہاں اس نے وہ تقریریں کیں کہ خدا کی پناہ۔ تاشقند میں وہ ہمارے ساتھ تھا۔ اس دوران اس نے ایوب خان کی کسی بات کی مخالفت نہیں کی میں اور وہ معاہدوں کے ڈرافٹ تیار کرتے رہے' وہ مجھے بریف کرتا تھا اور میں ڈرافٹ تیار کرتا تھا لیکن جب وہ واپس پاکستان پہنچا تو اس کا رویہ بدل گیا اس نے سب کچھ ایوب خان کے کھاتے میں ڈال دیا۔

بھٹو میں جواری کی خوبی تھی۔ اسے صورتحال سے فائدہ اُٹھانے کا ملکہ حاصل تھا۔ پاکستان آ کر اس نے محسوس کیا عام آدمی جنگ بندی کے سخت خلاف ہے۔ لہٰذا اس نے معاہدہ تاشقند کے خلاف تقریریں شروع کر دیں۔ فوج کو بھی بدنامی کا ڈر تھا لہٰذا وہ لوگ بھی بھٹو کے ساتھ شامل ہو گئے کہ جی ہم تو لڑنا چاہتے تھے لیکن ایوب خان نہیں لڑا جبکہ فوجی جرنیل بالکل لڑنا نہیں چاہتے تھے' ان کے پاس تو اسلحہ تک نہیں تھا' وہ ایوب خان کے خلاف تحریک میں اس لیے شامل ہو رہے تھے کہ انہیں خوف تھا کہیں ایوب خان انکوائری کمیٹی نہ بٹھا دے' کہیں انہیں نکال نہ دے۔

دوسری طرف ایوب خان خود کو اس سانحہ کا مجرم قرار دیتے تھے۔ وہ ساری ساری شام تنہا اور خاموش بیٹھے رہتے تھے۔ مجھے روز شام چھ بجے ان کا فون آ جاتا تھا۔ میں وہاں پہنچتا تو وہ چھوٹا سا ریڈیو لئے بیٹھے ہوتے تھے۔ میں سامنے خاموشی سے بیٹھ جاتا وہ کوئی بات نہیں کرتے تھے۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد مجھے خدا حافظ کہہ دیتے۔ کبھی کوئی کتاب پڑھ رہے ہوتے' میں جاتا تو مجھے پڑھ پڑھ کر سناتے وہ ان دنوں ایک فقرہ بہت دہراتے تھے۔ One fatal mistake and you lost the war.

میں دل میں پوچھتا تھا وہ مہلک غلطی کون سی تھی تو اندر سے آواز آتی تھی اکھنور۔ کیونکہ ان لوگوں نے طے نہیں کیا تھا کہ اس پر پہلے حملہ کرنا چاہیے یا آخر میں۔ ایوب خان پورے دو ماہ اس کشمکش کا شکار رہے۔ مجھے ڈر تھا شاید یہ شخص اب پوری زندگی اس سے نہ نکل پائے گا۔ انہوں نے پوری زندگی کسی دوسرے کو ۶۵ء کی جنگ کا الزام نہیں دیا' وہ پوری زندگی خود کو مجرم قرار دیتے رہے' وہ دراصل ایک کمانڈر تھے اچھے کمانڈر۔

ایوب خان کے بعد یحییٰ خان کا دور آیا' یحییٰ خان نے ۳۱۳ بیوروکریٹس کے ساتھ مجھے بھی نوکری سے برخاست کر دیا۔ میں نے یحییٰ خان کا سارا دور اپنے گھر میں بیٹھ کر گزارہ' میرے سامنے ملک ٹوٹا' میں نے ملک کی ٹوٹتی کرچیاں دیکھیں' یہ دور ایک الگ انٹرویو کا متقاضی ہے اس لیے میں سردست اس پر بات نہیں کرتا' ہم سیدھے بھٹو کی طرف آتے ہیں۔

جب بھٹو برسرِ اقتدار آئے تو میں ''ڈان'' کا ایڈیٹر تھا ایک اداریے کی پاداش میں انہوں نے مجھے قید کرا دیا' میں رہا ہو گیا' اس دوران مقدموں' عدالتوں اور وکیلوں کا ایک لمبا دور شروع ہو گیا۔ اس دوران میں نے قید تنہائی بھی کاٹی اور جیلوں کی سنگلاخ دیواریں بھی جھیلیں' ہتھکڑیاں اور بیڑیاں بھی برداشت کیں لیکن سارے الزام بالآخر الزام ہی ثابت ہوئے اور میں رہا ہو گیا' اس دوران مجھے لندن سے ایک ریسرچ کے لئے بلاوا آ گیا۔ میں نے بھٹو سے اپنا پاسپورٹ واگزار کرنے کی درخواست کی انہوں نے مجھے بلایا۔ میں دس بجے حاضر ہوا لیکن میری باری اڑھائی بجے آئی۔ میں ان کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ میز پر پاؤں رکھے بیٹھے تھے' میں نے کہا Prime Minister! you worked long hours بھٹو نے ہنس کر کہا۔ We don't play golf like you used to play. میں بیٹھ گیا تو کہنے لگے۔ تم ہمارے ساتھ آ جاؤ۔ بہت عرصے آؤٹ رہے ہو' اب ''مین سٹریم'' میں آ جاؤ۔ میں

نے کہا۔ ''سر میری کوئی مین سٹریم نہیں تو اپیشن تو مین سٹریم'' پھر جب میں رخصت ہونے لگا تو انہوں نے کہا۔ Altaf, whenever I want to see you why does every body here get very agitated and start talking agaist you. میں نے عرض کیا۔

''جناب ان کا خیال ہے آپ مجھے کنگ آف بہاولپور بنا دیں گے'' انہوں نے قہقہہ لگایا اور کہا۔ ''الطاف یہ ناممکن بھی نہیں۔'' پھر میں لندن چلا گیا جہاں مجھے بھٹو کی پھانسی کی خبر ملی۔

بھٹو صورتحال کو پلٹنے کا ماہر تھا۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکا وہ اس بُرے انجام کو کیسے پہنچ گیا کیونکہ میرا خیال تھا دنیا میں بھٹو کو بھٹو کے علاوہ کوئی پھانسی نہیں چڑھا سکتا تھا شاید بھٹو کی پھانسی بھی بھٹو ہی کا کمال تھا۔

اب ذرا ایوب خان کا ذکر ہو جائے۔ ایوب خان کے ساتھ میں نے سب سے زیادہ کام کیا لہٰذا زیادہ تفصیل سے ان کا ذکر ہونا چاہیے۔

میں ملک فیروز خان نون کا سیکرٹری تھا تو ایک دوپہر دو اڑھائی بجے میرے دفتر کا دروازہ کھلا اور سامنے جنرل ایوب خان پوری وردی میں ملبوس کھڑے تھے۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگے۔ وزیراعظم لنچ کے بعد آرام فرما رہے ہیں اور پرنسپل سیکرٹری کھانا کھانے گئے ہیں اس لئے آپ کو تکلیف دے رہا ہوں۔ آپ وزیراعظم کو میری طرف سے دعوت دے دیجئے گا کہ جب وہ راولپنڈی کا دورہ کریں تو میرے پاس ٹھہریں۔ میں نے کہا۔ درست۔ وہ فوجی انداز میں واپس چلے گئے۔ یہ ایوب خان سے میری پہلی ملاقات تھی۔ مارشل لاء کے بعد جب مجھے ڈائریکٹر امپورٹس اینڈ ایکسپورٹس لگایا گیا تو وہ ایک آدھ مرتبہ ہمارے دفتر آئے لیکن اس ملاقات کو ملاقات نہیں کہا جا سکتا تھا ان سے اصل ملاقاتیں سیکرٹری اطلاعات بننے کے بعد شروع ہوئیں۔ میں اگست ۶۳ء میں ایک ادبی کانفرنس میں شرکت کے لئے امریکہ گیا تھا۔ مجھے وہاں چیف سیکرٹری کا پیغام ملا کہ تم فوراً واپس آ جاؤں۔ میں آ گیا تو مجھے بتایا گیا صدر نے آپ کو سیکرٹری اطلاعات لگا دیا ہے۔ میں بڑا پریشان ہوا اور سیدھا نتھیا گلی میں نواب آف کالا باغ کے پاس چلا گیا۔ انہوں نے کہا الطاف صابا (وہ مجھے ہمیشہ الطاف صابا کہہ کر پکارتے تھے) میرے ہتھ وچ کج نئیں پتہ نہیں کنے صدر صاحب نوں آکھیا تے اوہناں نے فیصلہ کر لیا اے (الطاف صاحب میرے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے پتہ نہیں کس نے صدر صاحب کو کہا اور انہوں نے فیصلہ کر لیا) میں اگلے روز پنڈی

ایوب خان کے پاس حاضر ہو گیا اور انہیں کہا۔ ''سر میں اکنا مک پول کا آدمی ہوں مجھے اطلاعات کا کوئی تجربہ نہیں۔ انہوں نے کہا لٹریچر میں تمہارا نام ہے وغیرہ وغیرہ مجھے ان کی باتوں سے محسوس ہوا انہوں نے طے کیا ہوا ہے لہٰذا میرے پاس انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

میں نے ستمبر ۶۳ء میں سیکرٹری اطلاعات کا چارج لیا آتے ہی پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈیننس سر پر آ گرا۔ اس آرڈیننس پر اگست سے کام شروع ہو چکا تھا۔ پریس نے ہڑتال کا نوٹس دے رکھا تھا۔ پریس میں چند بنگالی واقف کار صحافیوں کے علاوہ میرا کوئی واقف کار نہیں تھا۔ ایوب خان صحافیوں پر بہت گرم تھے۔ آرڈیننس کے سلسلے میں پہلی میٹنگ ہی میں انہوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ میں ان سب کو سیدھا کر دوں گا۔ یہ بڑے بدمعاش لوگ ہیں۔ جب تک میں نے مارشل لاء رکھا یہ لوگ میری بڑی خوشامد کرتے رہے جوں ہی مارشل لاء اُٹھا ان لوگوں نے اپنا رویہ بدل لیا۔'' بہرحال میں نے آتے ہی ایک تو پریس سے مذاکرات کا آغاز کر دیا اور دوسرا پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈیننس کا تفصیلی مطالعہ شروع کیا۔ مجھے اس کی افادیت اور ضرورت دونوں مشکوک لگیں کیونکہ سیفٹی اینڈ سیکورٹی آرڈیننس اور دوسرے قوانین کی موجودگی میں اس کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مزید برآں بعض شقوں کی وجہ سے وہ بالکل ناقابلِ عمل تھا۔ مثلاً آرڈیننس میں ہدایت کی گئی تھی کہ کوئی اخبار اسمبلی اور عدالت کی کارروائی رجسٹرار کی تصدیق کے بغیر شائع نہیں کر سکتا یہ ظاہر ہے ممکن ہی نہیں تھا۔ پریس سے مذاکرات کے دوران مجھے محسوس ہوا یہ آرڈیننس مناسب یا نامناسب کے دائرے ہی میں نہیں آتا۔ یہ بالکل ناقابلِ عمل ہے۔ میں نے اس کے جواز کے خلاف پوری تیاری کر لی۔ ایوب خان کی پریس سے فائنل ملاقات سے ایک روز قبل آرڈیننس کے سلسلے میں تشکیل دی گئی۔ کمیٹی کی میٹنگ تھی جس میں نواب آف کالا باغ' غلام علی میمن' خورشید مرحوم' پرنسپل آفیسر این اے فاروقی' میں اور ایوب خان تھے۔ میٹنگ سے قبل ازاں مسٹر خورشید احمد نے مجھے اشارتاً بتا دیا کہ ان کا اس آرڈیننس سے کوئی تعلق نہیں یہ سب کچھ میمن کا کیا دھرا ہے۔ میٹنگ کے دوران سب لوگ پریس کو گالیاں دے رہے تھے' یہ بڑے بدمعاش ہیں' بدکردار ہیں۔ یہ پریس والے نہیں۔ ان کا مقصد پیسہ بنانا ہے۔ یہ سب مالکان ہیں جو ایڈیٹر بنے ہوئے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ایوب خان آرام سے سنتے رہے آخر میں اُنہوں نے میری رائے پوچھی تو میں نے صاف کہہ دیا سر یہ ناقابلِ عمل ہے سب کے چہروں پر سکتہ طاری ہو گیا۔ ایوب خان نے وجہ پوچھی تو میں نے تفصیل سے سارے آرڈیننس پر روشنی ڈالی اور آخر میں کہا۔

Whatever the character of this Press. No responsible, Government should be things of this kind.

تو ایوب خان ان سب پر چڑھ دوڑے اور کہا۔ ''او خنزیر کے بچو! یہ تم نے کیوں ہنایا تھا۔ تم کو کس نے کہا تھا۔'' اور سب کو گالیاں دینا شروع کر دیں اور یہ لوگ سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ پھر میری طرف دیکھا اور کہا۔ اب اس کا کیا کریں۔ میں نے مشورہ دیا اسے چھ ماہ کے لئے ماری ٹوریم میں رکھ دیا جائے۔ وہ کہنے لگے یہ صوبائی قانون ہے تمہیں مغربی اور مشرقی پاکستان جانا پڑے گا۔ میں نے کہا ''سر میں جاؤں گا؟'' دوسرے روز انہوں نے آرڈیننس ماری ٹوریم میں رکھ دیا جس سے پاکستانی صحافت اس آرڈیننس کے تباہ کن اثرات سے بچ گئی۔ پاکستانی اخبارات نے میرے اس اقدام پر اگلے روز خبریں اور مضامین شائع کئے۔ میں چند روز بعد لاہور نواب آف کالاباغ کے پاس گیا تو انہوں نے کہا۔ ''الطاف صاباتوں تے بیڑا ای غرق کر دیتا اے۔'' (الطاف صاحب آپ نے تو بیڑا ہی غرق کر دیا ہے) میں نے کہا ''کیوں؟'' کہنے لگے۔ ''توں نئیں جاندا اے والایت نئیں اے ساڈی پریس اے ساڈے تک ہوندے سن جہنڈ آج اے رپورٹر بن گئے نے'' (تم نہیں جانتے یہ ولایت نہیں ہماری پریس ہے پہلے ہمارے بھانڈ ہوتے تھے اب یہ لوگ رپورٹر بن گئے ہیں۔) پھر میں ڈھاکہ اور مشرقی پاکستان کے گورنر منعم خان کے پاس گیا تو وہ عجیب دیوانہ آدمی تھا اس کا نہ پتہ چلتا تھا سو رہا ہے نہ پتہ چلتا تھا جاگ رہا ہے۔ میں انگریزی میں ساری بات سمجھاتا رہا وہ سنتا رہا سنتا رہا جب میری بات مکمل ہو گئی تو اس نے آنکھیں کھولیں اور کہنے لگا۔ ''الطاف تم واقعی گوہر ہو اور جو تم کہو گے وہی ہو گا'' مجھے نہیں پتہ تھا وہ کس قدر منافق ہے بہر حال آرڈیننس ''ماری ٹوریم'' کے باعث ان لوگوں نے کوئی ''فارمل ایکشن'' تو نہ لیا لیکن پریس پر ان فارمل ایکشن جتنے ہو سکتے تھے وہ ان لوگوں نے لئے اشتہار بند کر دیئے اور صحافیوں کو پریشان کئے رکھا وغیرہ وغیرہ۔

اس دور میں میری ایوب خان سے بہت ملاقاتیں ہوئیں وہ مجھے اکثر ذاتی زندگی کے بارے میں بتاتے رہتے تھے۔ ایک دن انہوں نے بتایا کہ وہ شروع زندگی میں بہت سگریٹ پیتے تھے۔ دو روز ۵۰، ۶۰ سگریٹ پھونک جاتے تھے۔ جب وہ ڈھاکہ میں جی۔او۔سی تھے تو صبح اردلی ناشتے کے ساتھ سگریٹوں کا کاٹن دے جاتا۔ ایک روز وہ چائے کے ساتھ سگریٹ لانا بھول گیا تو انہیں بہت غصہ آیا اور انہوں نے اردلی سے کہا۔ سگریٹ کہاں ہیں؟ اس نے بتایا آج نہیں ملے۔ انہوں نے اسے ڈانٹ دیا۔ اردلی غصہ سے بولا۔ ''تم کیسے آدمی ہو تم میں تو برداشت ہی نہیں۔ تم ذرا سے سگریٹوں کے لئے اس شخص کو ڈانٹ رہے ہو جس نے اتنی برسوں تمہاری خدمت کی۔'' پھر

کہنے لگے۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا زندگی میں دوبارہ سگریٹ نہیں پیوں گا اور یہ فیصلہ انہوں نے زندگی بھر نبھایا۔

ایک دن بتانے لگے قائداعظم مجھے پسند نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ تقسیم کے وقت میں باؤنڈری فورس میں بریگیڈیئر تھا۔ میری ڈیوٹی پنجاب میں فسادات کی روک تھام تھی لیکن انگریز نے سازش کر کے مجھے صرف ڈیڑھ سو جوان دیئے۔ جب فسادات شروع ہوئے تو فورس کم ہونے کی وجہ سے میں فسادات روکنے میں ناکام رہا۔ نتیجتاً پنجاب میں ہزاروں لوگ مارے گئے۔ لوگوں نے مشہور کر دیا ایوب خان ہندوؤں سے ملا ہوا ہے۔ رلیہ پٹیالا کی لڑکیوں پر عاشق ہے وغیرہ وغیرہ۔ میری یہ بُری شہرت قائداعظم تک پہنچی تو وہ بھی مجھ سے متنفر ہو گئے۔ ۴۸ء میں جب قائداعظم ڈھاکہ آئے تو ایئرپورٹ پر ان کے لئے سلامی کا انتظام کیا گیا۔ قائداعظم مجھے وہاں دیکھ کر ناراض ہو گئے۔ میں ڈائس پر ان کے پیچھے کھڑا تھا میں نے انہیں مشورہ دیا آپ ذرا سا آگے ہو جائیں انہوں نے پیچھے منہ کر کے مجھے جھڑک دیا جس سے مجھے ان کی ناراضی کا صاف اندازہ ہو گیا۔

ایوب خان بہت سنجیدہ اور ''رکھ رکھاؤ'' شخص تھے۔ انہوں نے کیبنٹ میٹنگ میں کبھی مجھ سے نہیں پوچھا یہ کیا چھپ گیا۔ ان اخبار والوں کو روکو وغیرہ جبکہ دوسرے وزراء کا رویہ بہت بُرا تھا۔ اس وقت کے وزیر اطلاعات عبدالوحید خان روز صبح سویرے فون کر کے مجھے کہتے۔ ''الطاف صاحب آپ نے جنگ کراچی دیکھا اس کے پانچویں صفحے پر میری تصویر بہت چھوٹی ہے اور بیان بھی نہیں چھپا۔'' مجھے بہت غصہ آتا۔ ایک روز میں نے زچ ہو کر کہہ دیا۔ ''وحید خان صاحب آپ کو غلط فہمی ہے کہ میں ساری رات اخبار والوں کے دفتروں میں بیٹھ کر تصویروں کا سائز دیکھتا رہتا ہوں۔'' انہوں نے فنانس منسٹر سے میری شکایت کر دی۔ وزراء ایوب خان سے بھی میری شکایتیں کرتے رہتے تھے لیکن انہوں نے کبھی مجھ سے نہیں پوچھا۔

۶۵ء کے انتخابات کے دوران مس فاطمہ جناح کی مقبولیت دیکھ کر ایوب خان کے ساتھی ان کا ساتھ چھوڑنے لگے۔ شروع میں ان لوگوں نے ایوب خان کو یقین دلایا کہ کوئی شخص آپ کے مقابلے میں الیکشن کے لئے کھڑا نہیں ہو گا لیکن جب اپوزیشن نے فاطمہ جناح کو کھڑا کر دیا تو ان لوگوں نے ایوب خان کو مشورہ دیا۔ آپ عوامی اجتماعات سے خطاب نہ کریں چند روز بعد فاطمہ جناح عوام میں آ گئیں اور پورا پاکستان ان کے استقبال کے لئے گھروں سے باہر نکل آیا۔

یہ لوگ پریشان ہو گئے۔ اس وقت میں نے ایوب خان کو مشورہ دیا آپ عوام سے ضرور خطاب کریں۔ فاطمہ جناح گاؤں گاؤں جا رہی ہیں۔" ایوب خان کو مجبوراً "انتخابی مہم" کے لئے نکلنا پڑا۔ پشاور میں ایوب خان کے لئے صورتحال بڑی خراب ہو گئی۔ فاطمہ جناح ایک روز قبل وہاں بھرپور جلسہ کر کے گئی تھیں۔ ایوب خان کے جلسے کا وقت ہوا تو پنڈال خالی تھا۔ انتظامیہ نے بڑی مشکل سے لوگ اکٹھے کئے۔ ایوب خان نے تقریر کی لیکن ان کی اردو اچھی نہیں تھی، پشتو وہ سرے سے بول نہیں سکتے تھے لہٰذا جلسہ ناکام ہو گیا۔ شام کو کالا باغ اور منعم خان ایوب خان کو یقین دلا رہے تھے بڑا شاندار جلسہ ہوا ہے، بہت لوگ آئے تھے فاطمہ جناح کا جلسہ تو ہوا نے اُڑا دیا تھا وغیرہ وغیرہ انہوں نے میری رائے پوچھی میں نے کہا جناب عوامی ردعمل بڑا منفی ہے۔ یہ لوگ غلط کہہ رہے ہیں میں نے مس جناح کا جلسہ دیکھا تھا وہ بڑا کامیاب تھا۔ اُنہوں نے استفہامیہ انداز میں میری طرف دیکھا میں نے مزید بتایا جناب کل تین بجے فاطمہ جناح کا جلسہ ہونا تھا دو بجے بڑی شدید آندھی اور بارش آئی شامیانے اُڑ گئے قناتیں گر گئیں اس کے بعد بارش آئی لیکن ایک گھنٹے کی بارش کے بعد میں نے اپنی موٹر میں بیٹھے ہوئے دیکھا انہی ٹوٹی قناتوں اور گرے شامیانوں سے ہزاروں کا مجمع باہر نکلا۔ جناب لوگ آپ کو سننے آتے ہیں لیکن فاطمہ جناح کو دیکھنے آتے ہیں کیونکہ لوگ ان کی تکریم کرتے ہیں وہ بات سمجھ گئے۔ جیسے جیسے انتخابی مہم تیز ہوتی چلی گئی ایوب خان کے ساتھی بھاگتے چلے گئے۔ وزیر اطلاعات وحید خان جو کنونشن مسلم لیگ (ایوب خان کی پارٹی) کے جنرل سیکرٹری بھی تھے وہ اس دوران نظر ہی نہیں آئے۔

کالا باغ منعم خان اور انتظامیہ کے بھرپور "تعاون" کے باوجود ایوب خان بہت تھوڑے "مارجن" سے فتح یاب ہوئے اور اس میں بھی کراچی اور ڈھاکہ جیسے بڑے شہروں سے انہیں شکست فاش ہوئی۔ مجھے ایوانِ صدر سے بلاوا آیا۔ میں وہاں پہنچا تو میں نے دیکھا۔ انتخابی مہم کے دوران غائب ہونے والے تمام لوگ دوبارہ وہاں جمع تھے اور ایوب خان کو چیخ چیخ کر مشورے دے رہے تھے انہیں کس قسم کی تقریر کرنی چاہیے اور ایوب خان سکتے کی حالت میں منہ اُوپر کئے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر ایوب خان نے پلاننگ کمیشن کے سعید حسن کی طرف اشارہ کیا وہ بھی بڑھ چڑھ کر مشورے دے رہے تھے صدر نے کہا۔ آپ انہیں باہر لے جائیں اور ان کی بات سن لیں۔ میں انہیں الگ لے گیا اور انہیں کہا۔ "جناب آپ کو کوئی اور کام نہیں۔ میں صدر کے لئے ڈیڑھ سو تقریریں نہیں لکھ سکتا۔"

یہ ایوب خان کے لئے حیران کن تجربہ تھا کیونکہ ان کا خیال تھا وہ عوام میں بہت مقبول ہیں لیکن جب وہ عوام کے پاس گئے تو انہیں بہت مایوسی ہوئی۔ پھر انتخابات میں اتنے کم مارجن سے جیتنا بھی ان کے لئے بڑا افسوسناک تھا۔

ایوب خان کی کتاب "فرینڈز ناٹ ماسٹرز" کا منصوبہ قدرت اللہ شہاب نے تیار کیا تھا۔ اس کے لئے وزارت اطلاعات میں باقاعدہ بجٹ مختص کیا گیا تھا۔ کتاب کی اشاعت کے بعد شہاب کو رائلٹی میں بھی حصہ دار بننا تھا لیکن ان کا تبادلہ ہو گیا۔ جب میں سیکرٹری اطلاعات بنا ایوب خان نے مجھ سے کتاب کا ذکر کیا، میں نے کہا "سر چھوڑیں کیا کریں گے مشکل ہو جائے گا۔" اسی دوران ایوب خان کا ہرنیا کا آپریشن ہوا اور وہ مری منتقل ہو گئے۔ انہوں نے مجھے طلب کیا اور حکم دیا۔ میں ۳ ہفتے یہاں ہوں تم اس دوران میرے انٹرویوز کر لو اور کتاب مکمل کر دو۔ میں نے ان کے حکم کی تعمیل کی۔ میں روز ان کے سامنے بیٹھ جاتا۔ مائیکروفون لگ جاتے۔ میں سوال کرتا اور وہ فائلیں کھول کھول کر ہر بات کا تفصیلی جواب دیتے بعد ازاں یہ گفتگو ٹائپ ہو جاتی۔ تین ہفتے ختم ہوئے تو وہ دو ہزار صفحے بن گئے۔ ہم نے اسے ایک طرف رکھ دیا پھر ہم مصروف ہو گئے۔ درمیان میں انہوں نے ایک مرتبہ پوچھا تو میں نے کہا سر اس کے لئے کوئی ماہر رائٹر چاہیے آپ باہر سے کسی کو بلوا لیں۔ انہوں نے اپنے ہائی کمشنرز کو کہہ دیا۔ کچھ روز بعد لندن میں ہمارے ہائی کمشنر نے "سکاٹس مین" نامی اخبار کے ایڈیٹر کو پاکستان بھیج دیا۔ ہم نے اسے دو ہزار صفحے دے دیئے اس نے ایوب خان سے چند ملاقاتیں کیں اور سارا مواد لے کر ساتھ فرانس چلا گیا۔ اس نے وہاں سے کتاب لکھ کر بھجوا دی۔ یہ کتاب دیکھنے کے بعد ایوب خان نے کہا یہ تو میری کتاب ہی نہیں۔ نہ میری زبان ہے۔ نہ واقعات درست ہیں یوں وہ مسئلہ ایک بار پھر کھٹائی میں پڑ گیا۔ ۶۶ء میں بھٹو کی بے دخلی کے بعد حکومت میں میری پوزیشن خراب ہو گئی کیونکہ میں بھٹو کا آدمی سمجھا جاتا تھا۔ میں ایوب خان کو بھٹو کے خلاف ایکشن لینے سے بھی منع کرتا رہتا تھا۔ چنانچہ وزراء نے اعتراضات شروع کر دیئے۔ میں نے ایوب خان سے کہا۔ "آپ مجھے ہٹا دیں" انہوں نے کہا "نہیں مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ ہاں سر دست تم مری چلے جاؤ اور کتاب کا کام شروع کر دو۔" بہر حال میں اپنے سیکرٹری کے ساتھ مری گیا اور کتاب شروع کر دی۔ اس وقت تک مجھے ایوب خان کی زبان پر بھی عبور ہو چکا تھا۔ میں نے ایوب خان کے خیالات کو اس کی زبان میں ڈھال دیا وہ ساری کتاب ایوب خان کی تھی۔ ماسوائے فارن پالیسی کے دو ابواب کے وہ میں نے اس کی تقریروں کی روشنی

میں تیار کیے تھے شاید اسی لیے اس کتاب میں دو انداز محسوس ہوتے ہیں۔ کتاب مکمل ہونے کے بعد ایوب خان نے کہا "تم اس میں اپنا نام بھی شامل کر دو۔" میں نے انکار کرتے ہوئے کہا "سر میں گھوسٹ رائٹر ہوں میں نے اس کتاب میں کوئی کنٹری بیوشن نہیں کی اس کی ساری ذمہ داری آپ کو لینا پڑے گی۔" "فرینڈز ناٹ ماسٹرز" میں نے لکھی تھی وہ کتاب ایوب خان ہی کی تھی کیونکہ اس کتاب میں درج بے شمار نظریات سے مجھے اختلاف تھا۔ کتاب کی تحریر کے دوران میری جنرل یحییٰ خان سے پہلی ملاقات ہوئی۔

یحییٰ خان ان دنوں او۔ جی۔ سی ڈھاکہ تھے۔ ایوب خان نے کہا "تم اس سے مل لو وہ میرا سٹاف آفیسر رہا ہے اس سے کتاب لکھنے میں آسانی ہو جائے گی۔" میں نے یحییٰ خان کا انٹرویو کیا مجھے وہ بہت ذہین اور تیز شخص محسوس ہوا۔ ڈھاکہ میں اس کی شہرت بڑی خراب تھی۔ وہاں اس کی شراب خوری اور عشق بازی کے قصے بہت مشہور تھے۔ بعد ازاں اس کا تبادلہ جی۔ ایچ۔ کیو ہوا تو اس سے باقاعدہ ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔ ہم اکٹھے گالف کھیلتے تھے۔ ایک روز ایوب خان نے اپنے ملٹری سیکرٹری کے سامنے مجھے کہا۔ تم یحییٰ خان کے ساتھ گالف کھیلتے ہو وہ بہت موٹا ہو گیا ہے اسے سمجھاؤ شراب بند کر دے۔ میں نے کہا جناب میں اسے کیسے کہہ سکتا ہوں۔ جب وہ کمانڈر انچیف بنا تو کابینہ کے اجلاس میں بھی آنے لگا۔ میں نے دیکھا اگرچہ وہ ایوب خان کو اپنا باپ سمجھتا ہے تو یحییٰ خان کے لئے ایوب خان باپ سے بھی زیادہ معتبر تھا۔ وہ ایوب کے سامنے سر جھکا کر خاموش بیٹھا رہتا کچھ بھی نہیں بولتا تھا۔ پھر میں نے اسے بدلتے ہوئے بھی دیکھا۔

اردن کا شاہ حسین پاکستان کے دورے پر آیا۔ اس کے استقبال کے دوران میں نے ایوب خان سے ہاتھ ملایا تو ان کا ہاتھ بہت گرم تھا۔ پھر جب وہ تقریر کرنے لگے تو ایک صفحہ چھوڑ گئے۔ میں نے ملٹری سیکرٹری سے پوچھا اس نے بتایا صدر صاحب کی طبیعت بہت خراب ہے۔ میں اسے معمول کی بیماری سمجھ کر ڈھاکہ چلا گیا۔ واپس آیا تو نقشہ بدل چکا تھا۔ ایئر پورٹ پر صدر کے پی آر او قاضی سعید نے بتایا صدر کو ہارٹ اٹیک ہو چکا ہے اور ایوانِ صدر پر اب یحییٰ خان کا قبضہ ہے۔ کوئی سویلین آفیسر اندر نہیں جا سکتا۔ میں دفتر چلا گیا' روز ایوانِ صدر سے ایک میڈیکل بلیٹن آ جاتا تھا کہ صدر کو بخار ہے' اب نزلہ شروع ہو گیا ہے' طبیعت بحال ہو گئی ہے وغیرہ وغیرہ ہم یہ بلیٹن جاری کر دیتے تھے۔ پورے ملک میں پریشانی تھی۔ افواہیں گردش کر رہی تھیں کہ صدر کو فالج ہو گیا۔ کوئی کہتا ان کا انتقال ہو گیا۔ لوگ ہم سے پوچھتے مگر ہمارے پاس ٹال مٹول کے سوا کوئی

جواب نہیں ہوتا تھا کیونکہ ایوانِ صدر پر یحییٰ خان' جنرل حفیظ پیرزادہ' رحیم اللہ کریم' بریگیڈیئر اے آر صدیقی' جنرل حمید اور جنرل عمر کا قبضہ تھا۔ چار پانچ روز بعد مجھے صدر کا بلاوا آ گیا۔ میں ایوانِ صدر گیا تو کوریڈور میں گوہر ایوب کے بڑے بھائی اختر ایوب سے ملاقات ہو گئی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے۔ "ایناں نے تواں نوں آن دیتا اے تو اڈا تے ایناں نے بی ڈی بنا دیتا سی۔ (آپ کو ان لوگوں نے آنے دیا؟ انہوں نے تو آپ کا بی ڈی بنا دیا تھا) میں ایوب خان کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ لیٹے ہوئے تھے۔ مشین لگی ہوئی تھی۔ جوس کا گلاس پڑا تھا۔ کہنے لگے مجھے تھوڑی سی دل کی تکلیف ہو گئی تھی' میں اب اچھا ہوں۔ میں نے کہا سر آپ اب لوگوں سے ملنا شروع کر دیں۔ میں گورنر موسیٰ اور منعم خان کو بلاتا ہوں تاکہ لوگ آپ کو ٹی وی پر دیکھ کر مطمئن ہو جائیں۔ انہوں نے اجازت دے دی لیکن جب میں دفتر آیا تو مجھے فون پر اطلاع دی گئی کہ ملاقاتوں کا شیڈول کینسل کر دیں صدر کو بڑا ہارٹ اٹیک ہو گیا ہے۔

ایوب خان کی طبیعت زیادہ خراب ہونے کے باعث باہر سے انگریز ڈاکٹر گڈول کو بلانا پڑا۔ اس نے آتے ہی میڈیکل بلیٹن پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا اس کا کہنا تھا یہ ڈاکٹر کا کام نہیں ہے اگر آپ عوام کو اطلاع کرنا چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے کریں جھوٹ نہ بولیں۔ اس روز پہلی مرتبہ سچا میڈیکل بلیٹن جاری کیا گیا جس کے بعد آئینی مسئلہ کھڑا ہو گیا صدر بیماری کے باعث امور سلطنت چلانے سے معذور تھے چنانچہ آئین کے مطابق سپیکر عبدالجبار کو عبوری صدر بنایا جانا تھا۔ کابینہ کا اجلاس ہوا تو وزیر قانون ایس ایم ظفر نے اس آئینی شق کی عجیب تشریح شروع کر دی انہوں نے کہا سپیکر اس وقت عبوری صدر بن سکتا ہے جب صدر معمولی بیمار ہوں یا دورے پر گئے ہوں۔ صدر کی اس بڑی بیماری میں سپیکر کا عبوری صدر بننا ضروری نہیں وغیرہ وغیرہ۔ دراصل ایس ایم ظفر اس وقت تک یحییٰ خان کے کنٹرول میں آ چکے تھے لہٰذا ایوب خان کی بیماری کے دوران ملک صدر کے بغیر ہی چلتا رہا بعد ازاں ایک مرتبہ یحییٰ خان نے مجھے کہا۔ "میرا کیا تھا مجھے تو ایوب خان نے بیماری کے دوران واضح کہہ دیا تھا یو بیٹر ٹیک اوور" بہر حال ایوب خان ٹھیک ہو گئے اور انہوں نے کام شروع کر دیا۔

یحییٰ خان اگرتلہ سازش کیس کی وسیع پیمانے پر پبلسٹی چاہتے تھے۔ انہوں نے مجھے بلا کر کہا ہم ٹریبونل اوپن رکھیں گے آپ دنیا بھر کے پریس کو جمع کر دیں۔" میں نے جب کیس کی سٹڈی شروع کی تو اس میں شیخ مجیب الرحمان کے خلاف ثبوت تو رہے ایک طرف اس کا نام تک

نہیں تھا جہاں اس کا ریفرنس آتا وہاں لکھا ہوتا ''دی شیخ سیڈ لیس اینڈ دی شیخ سیڈ ڈیٹ''۔ میں فوراً ایوب کے پاس گیا اور ان سے عرض کیا آپ اس کیس میں مجیب کو شامل نہ کریں کیونکہ اس سے کیس بین الاقوامی ہو جائے گا اور اس کے خلاف ہمارے پاس ثبوت اس قدر کم ہیں کہ ہم ثابت نہیں کر سکیں گے۔ میں نے انہیں بتایا یہ کیس مغربی پاکستان کے کسی شخص نے تیار کیا ہے جسے یہ تک معلوم نہیں بنگالی میں ''دی شیخ'' نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ بنگالی مجیب کو شیخ مجیب کہتے ہیں یا ''مجیب الرٗ'' پکارتے ہیں۔ ایوب خان نے میرے ساتھ اتفاق کیا اور دوسرے روز ملزمان کی فہرست سے مجیب الرحمان کا نام اُڑا دیا گیا لیکن سات آٹھ روز بعد اخبار میں مجیب الرحمان کا نام بھی آ گیا۔ میں ایوب خان کے پاس گیا تو اُنہوں نے بتایا۔ ''یحییٰ خان کہہ رہا تھا بڑے مسائل ہیں اس کا نام شامل کرنا ضروری ہے۔'' اس وقت یحییٰ خان نے ایوب کے خلاف سازش شروع کر دی تھی۔ اسے ایک مرتبہ پاور مل چکی تھی اسے اندازہ تھا ایوب خان بیمار ہے زیادہ دیر نہیں چل سکے گا۔ مجھے اس دور میں صاف محسوس ہو گیا اگرتلہ سازش کیس کی آڑ میں مغربی پاکستان کی اعلیٰ قیادت میں سمجھوتہ ہو چکا ہے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں بنگالی بڑی مصیبت ہیں انہیں ہٹاؤ۔ یحییٰ خان بڑا اپیا لباز تھا۔ سازشی اور بے اُصول تھا مگر بہت ذہین اور تیز بھی تھا۔ مجھے دشمن سمجھتا تھا۔

امریکیوں کے لئے بھی ایوب خان کو بے دخل کرنے کا یہ بہترین موقع تھا۔ انہوں نے یحییٰ خان کا حوصلہ بڑھایا۔ یحییٰ خان نے پاورز اپنے اختیار میں لینا شروع کر دیں۔ وزراء نے بھی فوج کی طرف رُخ کر لیا۔ اس وقت یحییٰ خان نے آخری ضرب لگانے کے لئے عوامی ایجی ٹیشن کی حوصلہ افزائی کا فیصلہ کیا۔ جب پبلک ایجی ٹیشن شروع ہوا تو میں نے ایوب خان کو سیاست دانوں سے مذاکرات کا مشورہ دیا لیکن وہ کہنے لگے۔ یہ سب سودے باز ہیں ان میں کوئی جان نہیں۔ مذاکرات شروع ہوئے تو ان میں سے کوئی اصول پر بات نہیں کرے گا سب اپنی اپنی پارٹی کی بات کریں گے لیکن میرے اصرار پر انہوں نے اپوزیشن کے کنوینر نوابزادہ نصر اللہ کو وفد تشکیل دے کر ملاقات کی دعوت دے دی۔ نوابزادہ نصر اللہ مقررہ وقت پر اکیلے آئے اور کہا میں اپوزیشن کا وفد نہیں بلا سکتا آپ لوگ انہیں دعوت دیں۔ ناچار ہمیں دعوت نامے جاری کرنا پڑے لیکن فوج اس وقت تک بھٹو سے گٹھ جوڑ کر چکی تھی چنانچہ بھٹو مذاکرات میں شامل نہ ہوئے جس سے کانفرنس کمزور ہو گئی۔ ایوب خان اپوزیشن کی تمام شرطیں مانتے چلے گئے لیکن صورتحال درست نہ ہو سکی اس دوران یحییٰ خان ایوب خان کو کہتے رہے۔ ''آپ فکر نہ کریں ہمیں جب حکم دیں گے ہمیں حاضر

پائیں گے۔'' پھر ایک روز کراچی ڈھاکہ اور لاہور میں جزوی مارشل لاء کا فیصلہ ہوا۔ ایوب خان نے یحییٰ کو کابینہ میں بلایا تو اس نے جزوی مارشل لاء سے صاف انکار کر دیا اور صورتحال وہی ہو گئی جو کبھی سکندر مرزا کی ایوب خان کے سامنے تھی۔ بے شک تاریخ خود کو دہراتی ہے۔

پھر یحییٰ نے ایوب سے کہا۔ اپوزیشن برسرِ اقتدار آ کر آپ کا ٹرائل کرنے کا منصوبہ بنا رہی ہے اگر آپ مجھے موقع دیں تو میں ان سب کو سیدھا کر دوں گا۔ بھٹو کیا مجیب کیا سب کی چھٹی کرا دوں گا۔ ایوب خان باتوں میں آ گئے۔ یحییٰ خان نے انہیں مشورہ دیا۔ آپ تین ماہ کے لئے چھٹی چلے جائیں اور مجھے ایک خط لکھ دیں کہ کمانڈر انچیف اپنی آئینی ذمہ داریاں پوری کریں۔ ایوب خان نے مجھے طلب کیا اور خط ڈرافٹ کرنے کا حکم دیا۔ میں خط دینے ان کے دفتر گیا تو انہوں نے کہا۔ تم یہ نہ سمجھنا میں ہٹ رہا ہوں میں نے یحییٰ کو ہدایات دے دی ہیں اور ساتھ ہی فائل کھول کر وہ ہدایات پڑھنا شروع کر دیں جو انہوں نے بحیثیت صدر کمانڈر انچیف کو دیں۔ اسی اثناء میں اے ڈی سی اندر آیا اور یحییٰ خان کی آمد کی اطلاع دی۔ ایوب خان نے مجھے باہر بھیج دیا بعد ازاں یحییٰ خان نے خط کا ڈرافٹ دیکھا اور اس کی منظوری دے دی۔ ایوب خان کے گمان میں ہی نہیں تھا یحییٰ خان خط ملتے ہی شام کو مارشل لاء لگا کر آئین ختم کر دے گا اور ساری پاورز اپنے قبضے میں لے لے گا۔ ایوب خان مارشل لاء کے بعد دو دن ایوان صدر میں رہے۔ اس دوران انہوں نے پرانی تاریخوں میں ایس ایم ظفر کا استعفیٰ منظور کیا تو جنرل پیرزادہ اور یحییٰ خان کو بہانہ مل گیا وہ دونوں ایوب خان کے پاس گئے اور انہیں مشورہ دیا اب آپ کا یہاں رہنا مناسب نہیں آپ سوات چلے گئے۔

صدر کے گھر سے صدر کی بے دخلی کا منظر بڑا دردناک تھا۔ وہاں ہم صرف ۳ شخص تھے۔ میں اے ڈی سی اور صدر کے ملٹری سیکرٹری جنرل رفیع ایوب خان گاڑی میں بیٹھے لیکن تھوڑی دیر بعد باہر آ گئے اور ایوان صدر کے اندر چلے گئے۔ واپسی پر ان کے ہاتھوں میں چند کتابیں اور کچھ کاغذ تھے جو انہوں نے اے ڈی سی کو پکڑا دیئے اور خود گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گاڑی سٹارٹ ہوئی انہوں نے کھڑکی سے منہ باہر نکال کر آخری مرتبہ خدا حافظ کہا اور گاڑی گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ وہاں گارڈز نے آخری مرتبہ اپنے صدر کو سرکاری سیلوٹ کیا اور وہ ہمیشہ کے لئے اقتدار کے ایوانوں کو اداس چھوڑ کر چلے گئے لیکن مجھے آج تک ان کے چہرے کی سلوٹیں اور لرزتے ہونٹ یاد ہیں انہیں بھول بھی کون سکتا ہے بالخصوص وہ شخص جس نے اپنی زندگی کے ساڑھے پانچ برس ان

کے انتہائی قرب میں گزارے ہوں۔

ایوب خان سے اس کے بعد میری دو ملاقاتیں ہوئیں۔ جب یحییٰ نے میرے خلاف مقدمات قائم کئے تو ایک روز میں اسلام آباد میں ان کے گھر گیا۔ مجھ سے کہنے لگے۔ الطاف تم احتیاط کرو فوجی بڑی دور تک جا سکتے ہیں۔ میں تو ہٹ گیا ہوں یہ لوگ اب ساری ذمہ داری تم پر ڈال دیں گے۔ میں نے کہا۔ سر جو اللہ کرے۔ دوسری ملاقات اس وقت ہوئی جب ڈھاکہ میں آرمی ایکشن شروع ہوا تو کراچی میں اصغر خان مجھ سے ملے اور کہنے لگے ان لوگوں نے وہاں کیا شروع کر دیا ہے چلو کسی سے پوچھیں' میں اسلام آباد ایوب خان کے گھر آ گیا۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگے۔ "الطاف تمہیں یاد ہے جب ہم نے اسلام آباد کا پلان بنایا تھا تو ہم نے اس شہر میں ایسی گلیاں رکھی تھیں جو آگے جا کر بند ہو جاتی ہیں۔ میں نے کہا۔ لیس سر۔ تو کہنے لگے۔ یہ لوگ بھی ایسے ہی راستے پر چل نکلے ہیں جس نے آگے جا کر بند ہو جانا ہے۔ پھر کہنے لگے ان لوگوں نے مجیب الرحمان کو غدار قرار دے کر بہت بڑی غلطی کی کیونکہ اب یہ لوگ مذاکرات کس سے کریں گے؟ یہ ان سے آخری ملاقات تھی پھر ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی بیوہ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا ایوب خان میرے لئے کچھ کاغذ چھوڑ گئے تھے' میں نے وہ کاغذ مانگے لیکن ان کے بچوں نے وہ کاغذ مجھے نہیں دیا۔

یحییٰ خان نے اقتدار سنبھالتے ہی مجھ سمیت ۳۰۳ سرکاری افسروں کو نکال دیا۔ مجھے ملٹری کورٹ میں طلب کیا گیا۔ میں نے جانے سے انکار کر دیا' مجھے گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔ پھر انٹیلی جنس نے دو اخبارات پنچ اور ڈیلی نیوز میں رپورٹیں شائع کرا دیں کہ بنگلہ دیش کے ۶ نکات میں نے تحریر کئے ہیں۔ میرے بارے میں مشہور کر دیا گیا میں بنگالیوں کا ایجنٹ ہوں۔ کور کمانڈر جنرل رحیم میری گفتگو ٹیپ کرتے رہتے۔ ایک روز انہیں مقدمہ بنانے کا موقع بھی مل گیا۔ ایک تقریب کے دوران جب مجھ سے ڈھاکہ کے فوجی ایکشن کے بارے میں پوچھا گیا تو میں نے کہہ دیا۔ "یہ فوج وہاں سے واپس نہیں آ سکے گی" ایک اور جگہ جہاں ایڈمرل احسن بھی موجود تھے' ایک میجر ڈھاکہ میں اپنی شجاعت کے قصے سنا رہا تھا کہ کس طرح فرنٹیئر سکاؤٹ کا کمانڈر نواب پور روڈ پر نکلا' اس نے گولی چلا دی اور ۳۲ غدار بنگالی وہیں ڈھیر ہو گئے' مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میں نے باآواز بلند کہہ دیا۔ "مجھے آج پاکستانی ہونے پر شرمندگی ہے" مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ طویل مقدمہ بازی ہوئی جس کے آخر میں جج نے ان الفاظ کو ایک محب وطن کے الفاظ قرار دے کر مجھے بری کر

دیا لیکن مجھے پھر گرفتار کر لیا گیا اور مجھ پر ملک سے فرار ہونے' ایک بوتل شراب اور دو سوڈا لر رکھنے کا مقدمہ بنا دیا گیا لیکن میرے وکیل دوست منظور قادر نے عدالت میں کیس ہوا میں اڑا دیا' مجھے رہا کر دیا گیا تو بھٹو نے مجھے بلا کر کہا۔

"میری سیاسی زندگی میں کورٹ نام کی کوئی چیز نہیں۔" میں ان کی بات سن کر خاموش ہو گیا لیکن میں نے دل میں سوچا اتنا غرور انسان کے لیے اچھا نہیں ہوتا۔ پھر میں نے اپنی زندگی ہی میں بھٹو کو کورٹس میں دھکے کھاتے دیکھا' کورٹ ہی نے اسے سزا سنائی اور اسی کورٹ کے حکم سے اسے پھانسی پر چڑھا دیا گیا' افسوس میرا دوست ذوالفقار علی بھٹو اپنے ہی غرور کے ہاتھوں مارا گیا۔

بہر حال وہ جیلوں' قیدیوں اور کورٹ کچہریوں کا دور تھا۔ اس میں نظر بندی بھی تھی اور قید تنہائی بھی۔ یحییٰ خان کے ظلم بھی تھے اور بھٹو کی دوست کشی بھی۔ میں کس کس کا ذکر کروں' کبھی مجھے بنگالیوں کی حمایت کا سزاوار قرار دیا گیا' کبھی "ڈان" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے فوج اور حکمرانوں سے ادارتی جواب طلبی کا مجرم لیکن میں شرمندہ بالکل نہیں ہوں کیونکہ وہ دور میرے سچ کا دور تھا۔ سقراط کی زہر خوری اور منصور کی سولی کا دور تھا۔

سچ ہے برے وقت میں خدا یاد آتا ہے۔ یحییٰ خان نے جب مجھے قید خانے میں پھینکا تو میرا اللہ تعالیٰ سے رابطہ قائم ہو گیا۔ قید تنہائی کے دوران میں نے خدا کو یاد کیا۔ مجھے جس مکان میں رکھا گیا تھا اس کی دیوار کے سائے میں بیٹھ کر کسی حافظ نے تلاوت قرآن پاک شروع کر دی۔ وہ الفاظ میرے لئے قبولیت کا پیغام بھی تھے اور زندگی کے ایک نئے دور کی نوید بھی۔ پھر میں نے قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ طلب کیا اور روز کے تین صفحے پڑھنا شروع کر دیئے۔ اس دور میں فکر دین تھی۔ قرآن فہمی کا جنون تھا اور اپنے پروردگار کی نظر کرم کی طلب تھی اور اسی طلب میں ایک روز قرآن مجید کا انگریزی میں ترجمہ شروع کر دیا۔ پتہ نہیں ترجمہ کیسا رہا لیکن نور بصیرت سے میرا سینہ ضرور روشن ہو گیا۔

صاحبو! میں نے اس ملک کو بنتے دیکھا' اس میں اسلامی تشخص اور اس کی شناخت ابھرتے دیکھی۔ پھر اسی شناخت کو ٹوٹتے اور گم ہوتے بھی دیکھا۔ میرے سامنے نوزائیدہ پاکستان کی آئین ساز اسمبلی سے ان تمام سیاستدانوں کو غدار قرار دے کر بے دخل کر دیا گیا جنہوں نے پاکستان کی پہلی اینٹ رکھی تھی اور ان کے بعد ۶۹ ارکان کی اسمبلی میں جاگیردار' زمیندار اور

بیوروکریٹ رہ گئے پھر خان لیاقت علی خان' غلام محمد اور چودھری محمد علی سمیت تمام بڑے بڑے سیاستدان صرف اس لئے ملک میں انتخابات کرانے سے گھبراتے رہے کہ یہاں ان کا کوئی اپنا حلقہ نہیں تھا اور انہیں شکست کا خوف تھا۔ اور صاحبو! میں نے تو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ان لوگوں نے فضل حق کو غدار قرار دیا پھر اسے وزیر اعلیٰ بنا دیا پھر غدار کہا پھر ہوم منسٹر بنایا' ان لوگوں نے سہروردی کو غدار قرار دیا پھر وزیر اعظم بنا دیا' پھر غدار قرار دے کر بے دخل کر دیا۔ ان لوگوں نے مجیب کو غدار قرار دیا پھر اس سے مذاکرات کئے۔ پھر غدار قرار دیا اور پھر جیل سے باہر لا کر اپنے سامنے بٹھا دیا۔ پھر بھٹو نے ایوب خان کو مجرم قرار دیا' یحییٰ خان نے بھٹو کو صدر بنا دیا۔ پھر اسے پاکستان توڑنے کا مجرم قرار دیا اور پھر وزیر اعظم پھر مجرم اور پھر پھانسی پر چڑھا دیا اور صاحبو! اب یہی لوگ الطاف حسین کو غدار قرار دے رہے ہیں۔ اس شخص کو جس کے ساتھ ۶۰ لاکھ لوگ ہیں اور وہ وہاں لندن میں بیٹھ کر ہڑتال کی کال دیتا ہے تو سارا شہر بند ہو جاتا ہے۔ صاحبو! مجھے دوبارہ ایوب خان کے الفاظ یاد آ رہے ہیں کہ یہ لوگ ایسے راستے پر چل پڑے ہیں جس نے آگے جا کر بند ہو جانا ہے اور جہاں سے واپسی کا کوئی امکان نہیں ... صاحبو! میرا اور آپ کا خدا حافظ۔

• • •

ممتاز مفتی

ممتاز مفتی صاحب کے ساتھ میرا تعلق ایک خط کے ساتھ شروع ہوا تھا۔ میں ایک دوست کے ساتھ ان سے ملاقات کے لیے گیا۔ وہ ملے اور ہم واپس آ گئے۔ دوسری ملاقات میں ان سے عرض کیا۔ ''مفتی صاحب آپ میں بے تحاشہ کشش ہے۔ آپ مجھے بابے لگتے ہیں۔'' وہ اٹھے دوسرے کمرے میں گئے۔ واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ انہوں نے وہ لفافہ مجھے تھما دیا۔ میں لفافہ لے کر گھر آ گیا۔ اس لفافے سے ایک خط برآمد ہوا۔ یہ خط آگے چل کر ہمارے تعلق کی بنیاد بن گیا۔

اس سے پہلے کہ بات آگے چلے آپ مفتی صاحب کا خط ملاحظہ کیجئے۔

......

''جاوید! میں بابا نہیں ہوں''

میں نے اپنے بابا سے ہاتھ جوڑ کر کہا تھا مجھے بابا نہ بنا دینا۔ میں ایک کمزور انسان ہوں۔ باباؤں کی پابندیاں سہہ نہیں سکتا۔ میں ایک عام انسان کی طرح جینا چاہتا ہوں۔ یہ جو کچھ تمہارے ساتھ ہو رہا ہے میرے اندازے کے مطابق تجھے بھرتی کر لیا گیا ہے۔ آج کل بھرتی ہو رہی ہے چونکہ جسے نشاط ثانیہ کہتے ہیں (میں دور جدو جہد کہتا ہوں) وہ قریب آ گیا ہے۔ مجاہد مزاج افراد کو بھرتی کیا جا رہا ہے۔ پھر Coudition کیا جائے گا۔ پھر ان سے کام لیا جائے گا۔ انہیں احساس نہیں دیا جائے گا کہ انہیں چن لیا گیا ہے۔ تمہیں اس لیے چنا ہے کہ تم میں دونوں خوبیاں موجود ہیں ذہن اور عمل۔ دونوں بہت کم لوگوں میں ہوتی ہیں۔ یا ذہن ہوتا ہے اور یا عمل۔ لگتا ہے کہ تمہیں مجھ سے اس لیے ملایا گیا تھا کہ میں تمہیں حوصلہ دے سکوں کہ یہ تبدیلی تعمیری ہے تخریبی نہیں۔ پروفیسر میرے بابا کو نہیں مانتا۔ میں پروفیسر کو مانتا ہوں۔ وہ سول سروس میں ہے اس لئے کھل کر بات نہیں کرتا۔ پابند ہے۔

آج کل اس کی ڈیوٹی فوج پر لگی ہوئی ہے۔ ابھی ابھی کوئٹے سے آیا ہے۔

لگتا ہے اسی سال کے آخر تک یا اگلے کی ابتداء میں کچھ ہونے والا ہے۔ Great dourgs are ahead تم خوش قسمت فرد ہو کہ تم کو چن لیا گیا ہے۔ یہ سب میرے اندازے ہیں۔

ممتاز مفتی

میں یہ خط پڑھ کر حیران رہ گیا' ان دنوں میں روزنامہ پاکستان اسلام آباد میں نیوز ایڈیٹر تھا۔ یہ ۱۹۹۴ء کی بات تھی' اس وقت تک میں نے کسی اخبار' کسی رسالے میں ایک سطر نہیں لکھی تھی اور نہ ہی مجھے رائٹر بننے کی خواہش تھی البتہ مجھے لٹریچر پڑھنے کا شوق تھا۔ مفتی صاحب سے میرا

تعارف یونیورسٹی میں ہوا تھا۔ میں نے یونیورسٹی میں ممتاز مفتی کو پڑھنا شروع کیا تو وہ میرے دل میں کھب گئے' میں ۱۹۹۳ء میں اسلام آباد منتقل ہو گیا۔ وہ سارا سال مشقت اور جدوجہد کی نذر ہو گیا۔ ۱۹۹۴ء کے شروع میں ایک دوست کے ساتھ میں مفتی صاحب کے گھر پہنچ گیا' ان سے ملاقات ہوئی' اس ساری ملاقات کے دوران میں خاموش رہا جبکہ میرا دوست اور مفتی صاحب گفتگو کرتے رہے' میں اٹھنے لگا تو مفتی صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بڑے پیار سے بولے۔ ''جاوید تم مجھے اچھے لگے ہو' میرے پاس آتے جاتے رہا کرو'' میں نے عقیدت سے ان کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور واپس آ گیا۔ دوسری ملاقات بھی ان کے گھر ہی میں ہوئی' اس ملاقات کے دوران میں نے ان سے عرض کیا ''میرا دل آپ کی طرف کھنچا چلا آتا ہے'' انہوں نے قہقہہ لگایا' میرا ہاتھ دبایا اور اندر چلے گئے' دس منٹ بعد واپس آئے اور ایک لفافہ میرے ہاتھ میں تھما دیا' یہ خط اس لفافے سے برآمد ہوا تھا' اس ملاقات کے دوران انہوں نے پیشین گوئی کی' ''جاوید تم بھی بہت مشہور رائٹر بنو گے' میں تو اس وقت تک زندہ نہیں رہوں گا لیکن پورے ملک میں تمہارے ڈنکے بجیں گے'' میں نے ان کی بات قہقہے میں اڑا دی۔ تیسری ملاقات میں انہوں نے ملتجی لہجے میں فرمائش کی۔ ''تم لکھنا شروع کیوں نہیں کرتے؟'' میں نے کہا۔ ''میں نے زندگی میں ایک سطر نہیں لکھی'' فرمانے لگے۔ ''لیکن تمہارے اندر ٹیلنٹ ہے' تم لکھ سکتے ہو۔'' میں نے کہا۔ ''یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں' آپ نے آج تک میری کوئی تحریر نہیں پڑھی۔'' ہنس کر بولے۔ ''میں ایک بار تربوز خریدنے گیا' میں نے تربوز بیچنے والے بابے سے کہا' مجھے فلاں تربوز دے دو' بابے نے کہا' باؤ جی وہ تربوز نہ لیں' وہ اندر سے کچا ہے' آپ یہ لے لیں یہ اندر سے سرخ ہے' میں نے بھی تمہاری طرح بابے سے پوچھا' بابا تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو' بابے نے جواب دیا' باؤ جی مجھے تربوز بیچتے ہوئے ۵۰ برس ہو چکے ہیں اگر مجھے آج بھی تربوز کی پہچان نہیں ہوگی تو مجھ پر لاکھ لعنت۔'' وہ ذرا دیر کے لیے رکے اور پھر ہنس کر بولے۔ ''میں ۶۰ سال سے لکھ رہا ہوں اگر ۶۰ سال بعد بھی مجھے یہ معلوم نہ ہو کہ کس میں لکھنے کا ٹیلنٹ ہے اور کس میں نہیں تو مجھ پر بھی لاکھ لعنت ہو۔'' میں ہنس پڑا۔ واپسی پر مجھے ان کی بات یاد آتی رہی لیکن دل اسے ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ پھر میری ان کے ساتھ دوستی ہو گئی۔ میں ان سے تقریباً روزانہ ملنے لگا' وہ ہر ملاقات پر پوچھتے ''کیا تم نے لکھنا شروع کیا'' اور میں ان سے کہتا' ''چھوڑو مفتی جی مٹی پاؤ'' لیکن وہ مٹی ڈالنے کے لیے تیار نہیں تھے' وہ مسلسل اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ میں نے ایک روز ان سے عرض کیا۔ ''ٹھیک ہے مفتی جی

میں لکھنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن میری ایک شرط ہے۔'' بولے۔ ''کیا؟'' میں نے عرض کیا۔ ''میں اپنی زندگی کا پہلا مضمون آپ پر لکھوں گا۔'' انہوں نے فوراً ہاں میں گردن ہلا دی' اس رات میں نے اپنی زندگی کا پہلا مضمون لکھا' یہ مضمون مفتی صاحب کے بارے میں تھا' آپ مفتی صاحب کی شخصیت پر مزید گفتگو سے پہلے وہ مضمون پڑھ لیں' یہ مضمون میری ابتدائی تحریر تھا لہٰذا اس میں بے شمار خامیاں تھیں لیکن اس کے باوجود مفتی صاحب نے اس کی تعریف فرمائی' یہ ان کی ذات کا بڑا پن' ان کا ظرف تھا۔

''ممتاز مفتی ہمالیہ ہے۔

اس سے دور رہنے والا سکھی نہ قریب رہنے والا خوش۔ جو دور ہے وہ ہر وقت ''روزے دی جالی چم لین دے'' کا ورد کر رہا ہے اور جو قریب ہے وہ ''یا اللہ بچا'' کی تسبیح کر رہا ہے لیکن وہ ہمالیہ کی طرح ایستادہ ہے۔ خاموش' باوقار' سیدھا۔ نہ دوری کا غم نہ قربت کا اندیشہ' جو قریب ہے اس سے لاتعلق اور جو دور آس لگائے بیٹھا ہے اس سے ناآشنا کوئی آ جائے، آ جائے، کوئی اٹھ کر چلا جائے، چلا جائے، وہ آنے والے کا سواگت کرے گا' نہ جانے والے کو روکے گا، اس کے سامنے چائے کا ایک کپ دھرا ہے وہ چپ چاپ اسے اٹھا کر پی جائے گا اور سامنے شخص کو جھوٹے منہ تک سے نہیں پوچھے گا۔ سگریٹ کی طلب ہوئی تو پیکٹ سے سگریٹ نکال کر سلگائے گا اور مزے سے ناک منہ سے دھواں اگلنے لگے گا پر مجال ہے جو دوسرے کو سگریٹ پیش کر دے۔ پوچھیں تو آنکھ مار کر کہے گا، میں منہ پھٹ ہوں اور منہ پھٹ لوگوں کو پسند کرتا ہوں جسے طلب ہے وہ کہے' چائے ہوئی تو پیش کر دوں گا' نہ ہوئی تو افسوس میں ایک منٹ کی خاموشی اختیار کروں گا، اور کہنے والا کھسیانی ہنسی ہنس کر خاموش ہو جاتا ہے کیونکہ ممتاز مفتی ہمالیہ جو ہوا۔

جو ممتاز مفتی کو پڑھتا ہے' وہ کہتا ہے' مفتی یہ ہے لیکن جو ملتا ہے وہ کہتا ہے نہیں ممتاز مفتی وہ نہیں' وہ یہ ہے۔ یہی سوال جب اس سے پوچھا

جاتا ہے تو وہ مزے سے کہتا ہے صاحبو! نہیں میں نہ وہ ہوں اور نہ یہ بلکہ میں دھوکہ ہوں۔ جب میں ایلی ہوتا ہوں تو اس وقت میرے اندر ممتاز مفتی قہقہے لگا رہا ہوتا ہے جب میں ممتاز مفتی بن کر تخت پر بیٹھتا ہوں تو میرے اندر ایلی بغلیں بجا رہا ہوتا ہے۔ جب میں ممتاز ہوتا تو میں اس وقت ممتاز نہیں ایلی ہوتا ہوں اور جس وقت ایلی ہوتا ہوں تو اس وقت میں ایلی نہیں ممتاز ہوتا ہوں۔ یا حیرت اب کیا کہئے' کیا سمجھئے' یہ ڈور ہے یا الجھاؤ' سمجھنے لگیں تو الجھ جاتے ہیں' الجھنے لگیں تو سمجھ جاتے ہیں' اکثر ایسا بھی ہوا کہ کوئی ممتاز مفتی سے ملنے گیا تو اسے ایلی مل گیا اور کوئی ایلی سے ملاقات کے لئے گیا تو اس کا پالا ممتاز مفتی سے پڑ گیا' اب بھگتو' جب ممتاز مفتی بول رہا ہو تو ایمان کی دستار پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا پڑتا ہے۔ کیونکہ وہ کہتا ہے ''اللہ تعالیٰ بچہ ہے لاکھ گناہ کرو شرک کرو حکم عدولی کرو جب احساس ہو جائے تو سر جھکا کر کھڑے ہو جاؤ وہ فوراً خوش ہو جائے گا'' ''اللہ تعالیٰ سے بچ کر رہو اگر اسے تمہاری کوئی ادا پسند آ گئی تو چھاڈال دے گا پھر گھر کے رہو گے نہ گھاٹ کے'' اور ہنس کر کہتا ہے' ''اللہ تعالیٰ تو ہر وقت میرے ساتھ ہے۔ میرے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے چلتا پھرتا ہے۔ میں تو اس سے تنگ آیا بیٹھا ہوں'' یہ سب کچھ ممتاز مفتی بغیر ڈرے جھجکے' رُکے کہہ جاتا ہے اور وہ کیوں ڈرے؟ کس سے جھجکے؟ کہاں رُکے؟ کیونکہ وہ ہمالیہ جو ہوا اور ایلی کو اس کے سامنے بیٹھنے سے پہلے ہزار ہزار مرتبہ سوچنا پڑتا ہے روایت کہتی اخلاق بچاؤ۔ اخلاق کہتا ہے میری خیر ہے عقل بچاؤ' عقل قہقہہ لگا کر کہتی ہے مجھے چھوڑ ذرا دل کو سنبھالو۔ اور جب ایلی بولتا ہے تو بولتا ہی چلا جاتا ہے' کہتا ہے ''یورپ کی عورت نے ننگا ہو کر حسن کھو دیا ہے'' کہتا ہے ''گورے سوچ رہے ہیں اب ہماری نسل کیسے بڑھے گی کیونکہ مردوں کو عورتوں میں کشش ہی محسوس نہیں ہو رہی'' ممتاز مفتی دانشوروں میں خوش رہتا ہے اور ایلی لڑکے بالوں میں خوب پھلتا پھولتا ہے۔ لیکن اس سے پوچھیں تو وہ کہتا ہے نہیں میں تو دھوکہ ہوں' دانشوروں

میں ایلی ہوتا ہوں اور نوجوانوں میں ممتاز مفتی' اب کیا کہئے۔ چپ ہی رہئے ہم اسے قائل نہیں کر سکتے ہم اسے منا بھی نہیں سکتے کیونکہ یہ ہمالیہ جو ہوا۔

ممتاز مفتی جسے ناپسند کرتا ہے اس کے سامنے سر سے پاؤں تک عجز بن جاتا ہے دشمن کو پیار سے بلائے گا' مسند پر بٹھا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرے گا' کنگھی پٹی کر کے اس کی آنکھوں میں سرما لگائے گا' پھر ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑا ہو جائے گا اور کہے گا مہاراج سارے جہاں میں آپ ہی آپ ہیں آپ کا یہ داس آپ کے سامنے کیا ہے ہاتھی کے سامنے چیونٹی اور جب دشمن کا سینہ غرور سے پھول جائے گا' گردن فخر سے تن جائے گی تو مفتی کو ایک عجیب تسکین محسوس ہو گی ایک ایسی تسکین جو صرف مفتی ہی کو محسوس ہو سکتی ہے' کسی دوسرے کے بس کی بات نہیں لیکن جب مفتی کسی سے متاثر ہوتا ہے تو اس کے پیچھے ڈنڈا لے کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے وہ اسے خوب ڈانٹے گا' بھری محفل میں اس کی بے عزتی کرے گا' اس پر نکتہ چینی کرے گا اور بات بات پر وہ بگڑے گا' اس کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ یہ شخص اس سے ناراض ہو جائے۔ بھاگ جائے دور ہو جائے اور ہاں ایک اور بات جس سے اسے جتنا اختلاف ہو گا وہ اسے اتنا ہی دوست سمجھے گا۔ خود کہتا ہے وہ فکری طور پر اشفاق احمد اور احمد بشیر کا سخت دشمن ہے لیکن پچھلے چالیس برس سے وہ جب بھی لاہور جاتا ہے تو وہ صرف انہی دونوں کے گھر ٹھہرتا ہے۔ پوچھا جائے تو کہے گا میں کسی دوسرے کے پاس ٹھہر ہی نہیں سکتا۔ ہے نہ ٹیڑھی لکیر پر۔ ہم کیا بگاڑ سکتے ہیں کیونکہ یہ ہمالیہ جو ہوا۔

ممتاز مفتی پچھلے ۶۰ برسوں سے لکھ رہا ہے ان ۶۰ برسوں میں اسے پڑھنے والوں کو اردو آ گئی لیکن وہ آج تک اردو نہ لکھ سکا۔ اس کا کہنا ہے اس نے آج تک اردو ادب نہیں پڑھا اسے اردو سرے سے نہیں آتی' وہ صبح بیدار ہونے سے رات سونے تک پنجابی بولتا ہے۔ انگریزی ادب

پڑھنے کی وجہ سے ہمیشہ انگریزی میں سوچتا ہے لیکن جب لکھنے بیٹھتا ہے تو سوچ ایک اجنبی زبان میں ترجمہ ہو کر کاغذ کا حصہ بن جاتی ہے۔ یہ زبان اس کی اپنی ایجاد کردہ ہے۔ وہ زبان کیا ہے اسے صرف ممتاز مفتی کے چاہنے والے جانتے ہیں کیونکہ وہ چاہت، سادگی، ابلاغ اور احساس کی زبان ہے۔ مفتی نے زندگی میں ہمیشہ کہنے کے لئے نہیں بلکہ پہنچانے کے لئے لکھا چنانچہ اس کا ایک ایک لفظ وہاں پہنچ گیا جہاں اسے پہنچنا چاہیے تھا۔ اس نے کبھی لکھ کر نہیں کاٹا کیونکہ اس کا خیال ہے اس سے بات کا فطری پن مجروح ہوتا ہے بات وہ نہیں رہتی جو اسے ہونا چاہیے اس لئے ممتاز مفتی کہتا ہے اس نے ادیب بننے کے لئے نہیں بلکہ اپنے لئے لکھا لہذا جو پڑھے اس کا بھلا جو نہ پڑھے اس کا بھی بھلا۔ میرا ذاتی خیال ہے ممتاز مفتی لکھنے سے قبل اس پر کچھ پڑھ کر پھونکتا ہے اسی لئے اس کے فقرے آگ ہوتے ہیں۔ ایسی آگ جو انسان کو اندر سے جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ اور راکھ بھی وہ جس میں ہر لمحہ چنگاریاں سلگتی رہتی ہیں۔ اسے پڑھنے والا یا اس کے قریب رہنے والا وہ نہیں رہتا کچھ اور ہو جاتا ہے۔ میں نے خود کئی لوگوں کو اور ہوتے دیکھا لیکن جب اس سے پوچھا جائے تو وہ آنکھیں میچ کر کہتا ہے ''میں بابا نہیں ہوں میں نے اپنے بابے سے کہا تھا مجھے بندر بنا دینا لیکن بابا نہ بنانا'' مجھے یقین ہے ممتاز مفتی نے اپنے بابے سے یہ ضرور کہا ہوگا۔ کیونکہ اگر یہ شخص اس طرح بات نہ کرتا تو ممتاز مفتی نہ ہوتا کوئی اور ہوتا لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس کے بابے نے اس کی درخواست مان بھی لی ہو لہذا لوگوں کو ممتاز مفتی میں وہ سب کچھ نظر آتا ہے جو بابوں میں ہوتا ہے یا پھر بابوں میں ہونا چاہیے۔ تاثیر کی بھیگ، برابری کا مزا اور کبھی کبھار کشف کے چھینٹے اس میں سب کچھ ہے لیکن کون ہے جو اس سے یہ راز اگلوا سکے کیونکہ ممتاز مفتی ہمالیہ ہے اور ہمالیہ کا کام راز اگلنا نہیں دفن کرنا ہوتا ہے۔

ممتاز مفتی کا نام ممتاز ہے لہذا اس کی شخصیت سے انوکھا پن

نکال دیا جائے تو کچھ نہیں بچتا۔ اس کی ہر بات نرالی ہے۔ اسے کوئی ابا نہیں کہتا۔ بچے تو رہے ایک طرف اس کے پوتے اور نواسے تک اسے یار کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ اس کا کہنا ہے وہ پاکستان بننے سے قبل باپ بن چکا تھا لیکن یہ حرکت جسم کی حد تک محدود تھی کیونکہ وہ آج تک ذہنی طور پر باپ نہیں بن سکا۔ اس کا بیٹا جوانی میں اس سے ہر بات ببانگ دہل کہہ دیتا جو عموماً نوجوان اپنے قریبی رازداروں سے کہتے ہیں اور وہ بھی کان میں۔ اس حرکت کو بعد میں پیدا ہونے والے بچوں نے خاندانی روایت جانا لہذا آج اس کے پوتے اور نواسے بھی اس سے ان ''دو طرفہ امور'' پر گفتگو کرتے نظر آتے ہیں جن کا کوئی باپ متحمل نہیں ہو سکتا۔ لیکن کیا کیا جائے ممتاز مفتی اپنی عمر کے ہاتھوں مجبور ہے کیونکہ جب وہ ۱۶ سال کا تھا تو اس کا جذباتی ارتقاء رک گیا آج اس سانحہ کو ۷۴ برس گزر چکے ہیں لیکن وہ اپنی جوانی کو اسی طرح اٹھائے پھرتا ہے جس طرح ہابیل قابیل کو مارنے کے بعد لئے پھرتا تھا۔ اس کی محفل میں کبھی جنریشن گیپ مسئلہ نہیں بنا۔ ہر دور میں نوجوان اس کے یار رہے ہیں۔ آج سے پچاس سال پہلے بھی اور اب بھی۔ دوسروں کے برعکس (جن میں تارڑ سمیت بے شمار لوگ شامل ہیں۔ جو دوسروں کے بچوں کو ''خراب'' کرنے کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔) ممتاز مفتی کا پہلا وار ہمیشہ اپنے گھر پر چلا۔ عکسی جب جوان ہوا تو ممتاز مفتی نے اسے فوراً ''کرپٹ'' کر دیا وہ اسے سارا سارا دن کراچی کی سڑکوں پر لئے پھرتا تھا اسے فلموں کی ترغیب دیتا، شرطیں لگاتا تھا اور ہر فحش بات پر ہاتھ پر ہاتھ مارتا تھا۔ جب تک عکسی جوان رہا مفتی اس کا سب سے گہرا اور اچھا یار رہا پھر عکسی میں سنجیدگی آ گئی جو عموماً ادھیڑ عمر میں آتی ہے تو ممتاز مفتی نے ایک سعادت مند برخوردار کی طرح اس کا ادب کرنا شروع کر دیا۔ وہ اس کی موجودگی میں سگریٹ پیتا اور نہ اونچی آواز میں بات کرتا ''چپ بابا سو رہے ہیں۔'' ممتاز مفتی ہونٹوں پر انگلی رکھ کر پوتوں کو سمجھاتا۔ ان دنوں ممتاز مفتی بہت اداس رہتا تھا، اسے

رہنا بھی چاہیے تھا کیونکہ وہ کون سا نوجوان ہے جو ایسے بزرگ کے ساتھ ایک گھر میں سہولت کے ساتھ رہ لے جو ۵۰ برس قبل اس کا بیٹا اور ۳۰ سال پہلے تک دوست تھا۔ یہ اداسی فراریت بنی اور ممتاز مفتی گھر سے باغی ہو گیا ان دنوں اس نے اداس نوجوانوں کی طرح دو ایک معاشقے بھی کیے جو روایتی بندشوں کے باعث ناکام ہو گئے۔ چنانچہ مجبوراً صبح کا بھولا شام کو واپس آ گیا لیکن گھر میں اس کے لیے سرپرائز تھا۔ اس دوران اس کے پوتے جوان ہو چکے تھے۔ ممتاز مفتی اپنے ہم عمر دیکھ کر کھل اٹھا۔ اب وہ خوش ہے محفلیں جمتی ہیں' باتیں بنتی ہیں اور قہقہے لگتے ہیں لیکن جب یہ نوجوان اٹھ کر چلے جاتے ہیں تو ممتاز مفتی اچانک خاموش ہو جاتا ہے' مجھے پتہ ہے یہ خاموشی دانشور ممتاز مفتی کی خاموشی نہیں' ایلی کی چپ ہے اور وہ اس وقت یقیناً کوئی ایسی ترکیب سوچ رہا ہوتا ہے جس کی مدد سے وہ ان نوجوانوں کی جوانی "فریز" کر سکے تاکہ یہ بڑے نہ ہو سکیں' یہ یہیں رک جائیں' ان کے چہرے پر شرارت ٹھہر جائے' ان کے بالوں پر کبھی متانت کا سفید بال نظر نہ آئے کیونکہ اسے خدشہ ہے اگر ایسا ہو گیا تو اس کے گھر میں دو تین بزرگوں کا مزید اضافہ ہو جائے گا جس کے بعد اس کی ذمہ داریاں بڑھ جائیں گی اور اسے بیک وقت چار چار بوڑھوں کو سنبھالنا پڑے گا' سب کا خیال رکھنا پڑے گا اور وہ ادب کی وجہ سے کسی کے سامنے اونچی آواز میں بات نہیں کر سکے گا اور یہ سب کچھ نوجوانوں کے بس کی بات نہیں یقیناً کوئی اور نوجوان بھی وہ جس کی عمر ۹۰ سال ہو اور خواہ وہ ہالیہ ہی کیوں نہ ہو۔

یہ ایک بے ہنگم' فضول اور بے ربط سا مضمون تھا' یہ غالباً مارچ ۱۹۹۴ء میں روزنامہ پاکستان میں شائع ہوا اور ممتاز مفتی صاحب کے سوا کسی نے اس کا نوٹس تک نہ لیا' میں اس شام ان کے گھر پہنچا تو انہوں نے اٹھ کر میرا استقبال کیا' مجھے گلے لگایا اور جادوگروں کے لہجے میں بولے۔ "تم نے کام شروع کر دیا ہے اب اسے بند نہ ہونے دینا" لیکن میں نے ان کے مشورے پر عمل کرنے سے انکار کر دیا' میں نے کام بند کر دیا' وہ روز مجھ سے اصرار کرتے' میں ہنس کر ٹال دیتا۔

میرا خیال تھا میرے اندر لکھنے کا ٹیلنٹ ہی نہیں اور مفتی صاحب جان بوجھ کر میرے ساتھ گیم کر رہے ہیں۔ جب وہ کہہ کہہ کر تھک گئے تو ایک روز کہنے لگے "تم انٹرویوز کا سلسلہ کیوں شروع نہیں کرتے" میں نے پوچھا "کیا مطلب؟" بولے "تم مختلف لوگوں کے انٹرویوز کرو' یہ سلسلہ بہت پاپولر ہو گا۔" مجھے ان کی بات میں وزن لگا لہٰذا میں نے عرض کیا "ایک شرط ہے" انہوں نے قہقہہ لگایا "تم چاہتے ہو میں تمہیں انٹرویو دوں" میں نے بھی قہقہہ لگا دیا۔ انہوں نے فرمایا "چلو بسم اللہ کرو' اسی وقت انٹرویو کرو" میں نے ان سے کاغذ لیے اور ان ہی کی بال پوائنٹ اٹھائی اور انٹرویو شروع کر دیا۔ یہ ایک حیران کن انٹرویو تھا' اس انٹرویو میں انہوں نے اپنی ساری فلاسفی بدل دی' انہوں نے اپنے کام' اپنے سارے عزیز رشتے داروں اور دوستوں کا چہرہ ہی بگاڑ دیا۔ ہم نے اس انٹرویو کی چند جھلکیاں ۹ مئی ۱۹۹۴ء کو "روزنامہ پاکستان" اسلام آباد میں شائع کیں تو ہنگامہ برپا ہو گیا۔ مفتی صاحب پر اتنا زیادہ دباؤ پڑا کہ انہوں نے مجھے تحریراً تفصیلی انٹرویو شائع کرنے سے منع کر دیا۔ میں نے ان کے اس حکم کا احترام کیا لیکن ڈیڑھ سال بعد جب ان کا انتقال ہوا تو ہم نے وہ انٹرویو دوبارہ شائع کر دیا۔ ایک بار پھر ہنگامہ ہو گیا' یہ انٹرویو اب تک بے شمار اخبارات' رسائل' جرائد اور کتب میں شائع ہو چکا ہے لیکن اس کے باوجود آپ کی نذر کرتا ہوں۔ اس انٹرویو سے بھی آپ کو مفتی صاحب کی شخصیت کو سمجھنے کا موقع ملے گا۔

سوال: چلیے شہاب صاحب کی باتیں کریں۔

جواب: شہاب میں بہت خرابیاں تھیں مثلاً وہ "یس سر" کہنے والا انسان تھا جو اس کے باس نے کہہ دیا اس کی ادائیگی شہاب کی ذمہ داری ہو گی۔ جب بھی کسی بڑے افسر کا فون آتا وہ سر پر ٹوپی رکھ کر کھڑے ہو کر بات کرتا۔ اس کی دوسری خامی صدر ایوب تھا۔ ایوب کو ایوان اقتدار تک پہنچانے میں چند دوسرے لوگوں کے ساتھ ساتھ قدرت اللہ شہاب کا بھی ہاتھ تھا۔ جب سکندر مرزا نے غلام محمد کو فارغ کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا تو کراچی کی ایک خاتون عطیہ موجود نے' جو مستقبل بینی کی قدرتی صلاحیت رکھتی ہے کہنا شروع کر دیا۔

Tell this block headed pathan I see his corps on a gun.

کسی نے یہ بات ایوب کو بتا دی پہلے وہ قہقہہ لگا کر ہنسا پھر متردد ہو گیا' شہاب سے

اس کی یاری تھی۔ اس نے عطیہ سے رابطے کی ذمہ داری شہاب کی لگادی۔ دوسرے روز میں اور شہاب عطیہ کے پاس چلے گئے عطیہ نے بتایا کہ میں ریل گاڑی میں فلاں دن فلاں فلاں قسم کی تین بیگمات دیکھ رہی ہوں۔ یہ بیگمات ایوب کو زہر دینے کے لئے نکلی ہیں۔ تحقیقات ہوئیں اور وہ بیگمات ٹرین سے واقعی پکڑی گئیں۔ بعد ازاں شہادت اور چند دوسرے لوگوں نے ایوب کو مجبور کیا کہ وہ سکندر مرزا کو نکال باہر کریں۔ شہاب نے ایوب کی بیش بہامدد کی یہ شہاب کی غلطی تھی۔ یہاں شہاب مار کھا گیا۔ میں نے شہاب سے کہا اس میں کوئی شک نہیں ایوب خان میں بہت خوبیاں ہیں لیکن وہ دانش مند نہیں' شہاب نے مجھ سے اتفاق نہیں کیا کیونکہ وہ ایوب خان کو انتہائی دانشمند اور بہتر انسان سمجھتا تھا۔ تیسرا قدرت اللہ شہاب بھی میری طرح احساس کمتری کا شکار تھا۔ بنیادی طور پر نیک تھا مگر کمزور آدمی تھا۔ اس میں جنس مخالف کے لئے کوئی کشش نہیں تھی۔ چھوٹا سا تھا وہ غیر متاثر کن شخصیت تھی لیکن اس کے باوجود خواتین اس میں بہت دلچسپی لیتی تھیں۔ امریکہ نے شہاب کے پیچھے ایک فرانسیسی خاتون لگادی وہ دو برس تک اس کی جاسوسی کرتی رہی۔ دو برس بعد اس نے خود ہی شہاب کو بتادیا۔ میں نے حیران ہو کر اس بی بی سے وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگی امریکہ شہاب کو روس کا ایجنٹ سمجھتا ہے چنانچہ شہاب کو ایوب کے قریب برداشت نہیں کر پارہا۔ ''شہاب نامہ'' کا صرف آخری باب آدھا سچ ہے۔ میں نے شہاب سے کہا اگر آپ نے سچ نہیں لکھنا تھا تو کتاب ہی کیوں لکھی' وہ ہنس پڑا مثلاً ہیں بملا کماری کی روح والے باب کو حقیقت تسلیم کرنے پر کبھی تیار نہیں ہوا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے آپ گراموفون پر کلمہ شریف لکھ کر رکھیں تو سہگل کی آواز آنا شروع ہو جائے۔ یہاں مولوی حضرات بھوت بنگلوں میں پورا پورا قرآن پڑھ جاتے ہیں لیکن بھوت اپنا ٹھکانہ نہیں بدلتے۔ ''شہاب نامہ'' میں بعض جگہوں پر خود نمائی سے بھی کام لیا گیا ہے۔ جسے میں بحیثیت نقاد برداشت نہیں کر سکتا تھا کیونکہ میں جانتا ہوں جب بھی ان کے پاس کوئی دوست کام لے کر گیا ان کو پسینہ آ گیا۔ وہ اپنے ماتحتوں کو بھی اس لجاجت سے بلاتا تھا کہ اس پر بے اختیار رحم آ جاتا تھا۔

سوال: اور شہاب صاحب کا روحانی پہلو۔

جواب: ہاں اس سے بڑا کوئی بابا مجھے نہیں ملا۔ ان میں انتہا درجے کا عجز تھا۔ پولیس کا عام سا سپاہی صدر کے سیکرٹری کو روک کر کھڑا ہو جاتا تھا اور وہ کھڑے ہو جاتے تھے۔ انتہائی ٹھہراؤ' آپ جو چاہیں کہہ جائیں' وہ خاموشی سے سنتے رہتے تھے۔ کبھی کسی کو ڈانٹا نہیں' کبھی کسی کو نصیحت نہیں کی۔ آپ کہیں شہاب صاحب میں نے فلاں گناہ کیا تھا وہ اس طرح مسکرا کر دیکھیں گے جیسے داد دے رہے ہیں۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر اسلام آباد کی سڑکوں پر پھرتے رہتے تھے اور پڑھ پڑھ کر پھونکتے رہتے تھے جوان کے ساتھ رہا تر گیا۔ مجھ پر شہاب کے بڑے احسانات ہیں میری بات میں اس نے اثر پیدا کیا۔ مجھے کہنے کی جرأت دی۔ مجھے لوگوں کے خوف سے آزاد کر دیا، میں صرف کہہ سکتا تھا، بات پہنچا نہیں سکتا تھا۔ شہاب نے میری بات کو پہنچنے کا سلیقہ بخشا داوہ اس کے دم قدم سے میری زندگی آسان ہو گئی۔ دنیا جنت بن گئی یہ اس کا کتنا بڑا احسان ہے کہ لوگ اب مجھے بھی ''بزرگ'' سمجھنے لگے ہیں۔

سوال: آپ نے ایوب خان کو کیسا پایا۔

جواب: صدر ایوب بنیادی طور پر کمزور شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے اکثر فیصلے غلط کئے۔ کابینہ میں ان کا رویہ بھی عجیب ہوتا تھا۔ وہ کسی ایک مسئلہ پر تمام وزراء سے رائے لیتے پھر سیکرٹریوں کے سامنے مسئلہ اٹھاتے لیکن جب فیصلہ کرتے تو وہ بالکل مختلف ہوتا۔ ان کی شخصیت اس قدر کمزور تھی کہ وہ براہ راست کسی کو مورد الزام بھی نہیں ٹھہرا سکتے تھے۔ اس ضمن میں ان کا سٹائل کچھ یوں ہوتا تھا ''لوگ آپ کے بارے میں کہتے ہیں'' ''لوگوں کا خیال ہے آپ یوں کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ۶ ستمبر ۶۵ء کو پاک بھارت جنگ کے موقع پر شہرۂ آفاق تقریر کے دوران ان کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ ایوب مسلمان تھے نہ ہی متعصب' ان کے صاحبزادے گوہر ایوب ان دنوں اشتراکی نظریات کے حامی تھے لہٰذا وہ ایوان صدر میں بیٹھ کر اپنے والد کی اصلاحات کو گالیاں دیتے رہتے تھے اور ایوب خان طیش میں آ کر تھپڑ سے ان کی پٹائی کرتے تھے۔ ایوب میں ایمانداری ضرور تھی لیکن استقلال نہیں تھا۔ وہ بات پر قائم نہیں رہتے تھے۔ ایوب نے پاکستان کو سیکولر بنانے کا فیصلہ کیا تو شہاب نے منع کر دیا۔ ایوب نے پوچھا آپ عالمی فائدے کی بات کر رہے ہیں یا اسلامی نقطہ نظر

ے سفارش کر رہے ہیں' شہاب نے کہا میں اسلامی نقطہ نظر سے بات کر رہا ہوں
پاکستان اسلامی ریاست رہا تو آپ کو عالمی سطح پر بہت فائدے ہوں گے لہٰذا ایوب
نے شہاب کی بات مان لی۔

سوال: آپ نے اشفاق احمد کا ذکر نہیں کیا۔

جواب: اشفاق احمد پچاس برس سے میرا یار ہے۔ میں چاہوں بھی تو اس کو نہیں چھوڑ سکتا۔ بالکل ایسے جیسے وہ مجھے نہیں چھوڑ سکتا لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ مجھے اس سے کوئی اختلاف نہیں۔ ہم دونوں اندر سے ایک دوسرے کے بہت مخالف ہیں۔ اشفاق کے سارے "بابے" فراڈ ہیں۔ کہانیاں ہیں۔ وہ نرگسیت کی انتہا کو پہنچا ہوا شخص ہے۔ جسے اپنے سوا دنیا میں کوئی نظر نہیں آتا۔ اس نے زندگی بھر شہاب کو تسلیم نہیں کیا۔ وہ دوہری شخصیت کا مالک ہے۔ ٹھیک ہے وہ قابل ہے لیکن اس کے بچے اس سے زیادہ قابل ہیں پر وہ انہیں اُٹھنے نہیں دے رہا۔ خان میں غصہ اس قدر ہے کہ جب وہ بولتا ہے تو گھر کے برتن تک کانپنے لگتے ہیں۔ میں نے اسے بہت پہلے کہا تھا۔ دیکھو اشفاق تو ریڈیو ٹی وی کے لئے شوق سے لکھ لیکن قلم کاری نہ چھوڑنا کیونکہ تیرا اصل ہنر یہ ہے لیکن اس نے یہ کہہ کر میری تجویز مسترد کر دی کہ "میرا پیغام وسیع ہے اور ادب چھوٹا" اب ٹی وی والے اسے گھاس نہیں ڈال رہے تو سخت پریشان ہے۔ میں بانو کی بہت عزت کرتا ہوں وہ مجھ سے بہت چھوٹی ہے لیکن ہے میری ماں۔ میں اس کے بغیر بالکل یتیم ہوں لیکن اس نے شہاب کی ذات پر "مرد ابریشم" جیسی ہتک آمیز کتاب لکھ کر بہت زیادتی کی۔ اس نے اس کتاب میں شہاب کی بجائے اشفاق کو بڑا آدمی بنا کر پیش کیا' بڑی زیادتی ہے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مصنفہ نے پوری کوشش کی تاکہ شہاب کو اشفاق احمد سے دوستی کے طفیل بڑا آدمی سمجھے لیکن اس میں بانو کا بھی کوئی قصور نہیں وہ ادیب اور دانشور ہونے کے باوجود "پتی پوجا" ہے۔ اپنے خاوند کو خدا سمجھتی ہے۔ اشفاق احمد "شہاب نامہ" اپنے کسی پبلشر دوست کے حوالے کرنا چاہتا تھا شہاب نے مجھ سے رائے لی میں نے منع کر دیا۔ انہیں پبلشر سے تحریری معاہدے پر قائل کر لیا تو اشفاق ایک ایسا معاہدہ تیار کر کے لے آیا جس کا تمام تر فائدہ اسے پہنچتا تھا۔ میں نے شہاب کو

دوبارہ منع کر دیا لہٰذا اس نے صاف انکار کر دیا۔

سوال: یہ اللہ کیا ہے؟

جواب: اللہ، اللہ ہے لیکن ہے بالکل بچہ' آپ کفر کریں' شرک کریں' زنا کریں اور جو جی چاہے کریں جب تھک جائیں تو سر پر ٹوپی رکھ کر آنکھوں میں دو آنسو سجا کر اس کے پاس چلے جائیں وہ فوراً خوش ہو جائے گا وہ فوراً مان جائے گا۔ میرا اور اللہ کا تعلق بڑا پرانا ہے۔ پہلے میں اسے مولوی کی آنکھ سے دیکھتا تھا لہٰذا اس سے ڈرتا تھا' مجھے لگتا تھا اللہ ایک بھٹیارن ہے' جس نے دوزخ کے نام پر بہت بڑی بھٹی جلا رکھی ہے' بھٹی پر دانے بھن رہے ہیں۔ لوگ بھٹی کے قریب آتے ہیں اور اللہ انہیں پکڑ پکڑ کر بھٹی میں جھونک دیتا ہے۔ پھر میں نے اللہ کو شہاب کی آنکھ سے دیکھا تو وہ فوراً صوفے پر میرے قریب آ کر بیٹھ گیا اب تک بیٹھا ہے' میں روز اس سے باتیں کرتا ہوں' وہ مجھے جواب دیتا ہے۔ ہم گھنٹوں گپیں لگاتے ہیں' جوک شیئر کرتے ہیں۔ ہنستے ہنساتے ہیں۔ میں تھک جاتا ہوں تو اٹھ کر سونے چلا جاتا ہوں لیکن اللہ اسی طرح صوفے پر بیٹھا رہتا ہے۔ اللہ میرے ساتھ اس حد تک رہا ہے کہ میں اب اس سے تنگ آ گیا ہوں۔ "رج" گیا ہوں۔ میں نے بھٹیارن اللہ اور دوست اللہ دونوں کو بڑے قریب سے دیکھا لیکن مجھے ان دونوں کی سمجھ نہیں آئی۔ اس کے غصے اور اس کی رحمت کی کوئی وجہ نہیں ہوتی۔ مولوی معمولی سی بات پر شاتم کو قتل کر دے تو جنتی' دانشور گستاخی کو اختلاف رائے سمجھ کر فراخ دلی کا مظاہرہ کرے تو وہ بھی جنتی' لو یہ کیا بات ہوئی میں پوچھوں گا اس سے۔ وہ بہت عجیب ہے۔ بالکل عورت کی طرح میں جب اسے نہیں مانتا تھا تو سارا سارا دن اس کے خلاف تقریریں کرتا تھا لوگوں کو اس کے خلاف اکساتا تھا وہ مجھ پر بڑا مہربان تھا۔ سارا سارا دن میرے پیچھے پھرتا رہتا تھا' مجھے اپنی اداؤں سے لبھاتا' اپنے حسن' خوبصورتی اور اخلاق سے قائل کرنے کی کوشش کرتا تھا' لیکن جب میں نے اسے مان لیا' میں اس کا پبلک ریلیشن آفیسر بن گیا' پبلسٹی منیجر بن گیا تو وہ آگے آگے چل پڑا۔ اب وہ میری طرف دیکھتا تک نہیں۔ میں نے کئی مرتبہ اس کا پلو پکڑ کر جھٹکا اس کو متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے مجھ پر ایک ترچھی نظر تک نہ ڈالی۔ کبھی ملاقات ہوئی تو اس سے ضرور کہوں گا

''جناب اللہ صاحب اللہ اس قسم کے نہیں ہوا کرتے آپ فوراً اپنی پالیسی بدلیں۔ لوگوں میں آپ کی ریپوٹیشن متاثر ہو رہی ہے'' چلو تمہیں ایک اور کام کی بات بتاتا ہوں' کبھی زندگی میں زیادہ اللہ اللہ نہ کرنا اگر اس نے پیچھا ڈال لیا تو پھر کہانی ختم، دنیا رہنے کے قابل نہیں رہے گی۔ درمیانے درجے کی مسلمانی سے بڑھ کر دنیا میں کوئی خوش قسمتی نہیں ہوتی۔

سوال: یہ بزرگ کیا ہوتا ہے؟

جواب: توبہ توبہ اللہ کسی کو بزرگ نہ بنائے بزرگی سے بڑی زیادتی کسی شخص کے ساتھ نہیں آتی۔ ایک دن شہاب بزرگی کی اہمیت پر روشنی ڈال رہا تھا تو میں اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا اور کہا ''شہاب خدا کے لئے مجھے گدھا بنا دو مگر بزرگ نہ بنانا۔ مجھے عام انسان رہنے دو میں افضل ہونے سے بہت ڈرتا ہوں'' آپ کو بھی جب کوئی بزرگ ملے تو اس سے صرف دنیاوی فائدے کی بات کریں اسے کسی کام یا حاجت کے چکر میں ڈال دیں' اسے دل پلٹنے کی طرف نہ آنے دیں' نہیں تو جائیں گے کام سے۔ دنیا سنور جائے تو آخرت بھی سنور ہی جاتی ہے۔ یہ بابا لوگ بڑے مظلوم ہوتے ہیں کوئی شہرت پر قادر ہوتا ہے' کوئی عزت اور نیک نامی پر' کسی کے ہاتھ میں اختیار ہوتا ہے' کوئی اقتدار بانٹتا ہے' کوئی رزق وسیع کر دیتا ہے کوئی علم دیتا ہے کوئی کچھ اور کوئی کچھ لیکن خود قلاش ہوتے ہیں۔ اپنے لئے ان کے پاس کچھ نہیں ہوتا وہی پیوند لگے دو کپڑے ذرا خود بتاؤ ان لوگوں کو دیکھ کر کوئی صحیح الدماغ شخص بزرگی قبول کرے گا؟ میری پوری زندگی ''بابوں'' میں گزری لیکن مجھے ان کی بالکل سمجھ نہیں آئی۔ ان میں نرگسیت بہت ہوتی ہے۔ ایک بابا دوسرے بابے کو تسلیم نہیں کرتا۔ بابے کی اپنی بیورو کریسی ہے، فائلیں آتی ہیں جاتی ہیں' کچھ ضائع کر دی جاتی ہیں' کچھ بڑے عرصے تک حکم کی منتظر پڑی رہتی ہیں' وہاں بھی سفارشیں چلتی ہیں۔ رشوتیں پیش کی جاتی ہیں، وہاں بھی دھونس دھاندلی' اقربا پروری کا دور دورہ ہے' وہاں کا بھی کوئی انتظامی افسر پاک صاف نہیں۔ اگر وہاں سفارش نہ چلتی تو میں آج ایک باعزت شخص نہ ہوتا۔ یہ بابے عام آدمی کے لئے جس قدر موم ہوتے ہیں اپنی ذاتی محفلوں میں یہ اتنے ہی سخت متشدد ہوتے ہیں۔ بڑے بابے چھوٹے بابوں کے

ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو ایک ظالم استاد کند ذہن طالب علم کے ساتھ کرتا ہے۔ مرغا بنا دیتے ہیں' ڈوڈو پر یڈ کراتے ہیں۔ بچوں پر کھڑا کر دیتے ہیں۔ جسمانی اذیت بھی دیتے ہیں۔ میرے سامنے شہاب وکی مرتبہ اتنی مار پڑی کہ وہ کئی کئی دن تک بستر سے لگا رہا۔ اسی مار سے اس کی ایک ٹانگ بھی ضائع ہوئی۔ ان بابوں کی دنیا میں رقابت بھی ہوتی ہے۔ یہ لوگ ایک دوسرے سے جلتے ہیں' حسد کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کی چغلی کرتے ہیں۔ ایک بابا کبھی برداشت نہیں کرتا کہ اس کا کوئی بالکا دوسرے بابے کے پاس چلے جائے۔ ایک بابا اپنے وظائف کی دوسرے بابے کو ہوا تک نہیں لگنے دیتا۔ یہ لوگ عجیب لوگ ہیں صاحب ان سے بچ کر رہو نہیں تو کام سے جاؤ گے۔

سوال: آپ سرفراز شاہ سے بہت متاثر ہیں؟

جواب: بالکل نہیں، سرفراز شاہ میرا دوست ضرور ہے لیکن میں اسے بزرگ نہیں مانتا کیونکہ وہ بزرگوں کے ''کرائی ٹیریا'' پر پورا نہیں اترتا۔ بزرگ کی پہلی نشانی عجز ہے جو سرفراز شاہ میں سرے سے نہیں' اس میں ''ہم'' کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ بزرگی کی دوسری نشانی دنیاداری سے پرہیز ہے۔ سرفراز شاہ اس پر بھی پورا نہیں اترتا۔ وہ دنیاداری کے پیچھے بھاگتا ہے۔ ابھی کچھ عرصہ قبل اس نے کروڑوں روپے سے فیکٹری لگائی' ڈاکٹر اشفاق حسین بے نظیر بھٹو کا پرسنل فیزیشن بنا تو اس نے جسٹس الیاس کو ڈاکٹر اشفاق کے پاس بھیج دیا اور کہا کہ بے نظیر سے سفارش کر کے اسے چیف جسٹس لگا دو خود وہ صاحب اقتدار لوگوں تک پہنچنے کی کوشش کرتا رہتا ہے' بزرگی کی تیسری نشانی گمنامی کی تلاش ہوتی ہے۔ جبکہ سرفراز شاہ شہرت کی تلاش میں رہتا ہے اس نے مجھے اپنے اوپر مضمون لکھنے کا کہا میں نے لکھ دیا۔ کچھ عرصہ بعد دوبارہ کہا ایک اور لکھ دیا۔ تیسری مرتبہ کہا تو میں نے انکار کر دیا اور وہ ناراض ہو گیا۔ میں نے کہا ہو تم اللہ بزرگی کی چوتھی نشانی کشف کے مظاہروں سے پرہیز ہے۔ بزرگ کبھی کشف کا اعلان نہیں کرتے جبکہ سرفراز شاہ کرتا ہے۔

سوال: پھر سرفراز شاہ کیا ہے؟

جواب: سرفراز شاہ عامل ہے۔ اس کے قبضے میں جنات ہیں' یہ جنات لوگوں کی سوچ پڑھ کر

سرفراز شاہ کو بتا دیتے ہیں۔ خود اس نے مجھے بتایا کہ ایک مرتبہ لوگ اس کے پاس بیٹھے تھے تو اچانک ایک جن تین چڑیلوں کے ساتھ آ گیا اور لوگ چیخیں مار کر بھاگ گئے۔ سرفراز شاہ کے مرشد یعقوب شاہ "شکردرہ" میں جہاں چلہ کشی کرتے رہے وہ جنات کا علاقہ ہے کیونکہ اس دس پندرہ میل کے علاقے میں آپ کو کوئی چرند پرند نظر نہیں آتا یہ جنات کی بستی کی سب سے بڑی نشانی ہے۔

سوال: آج کے دور میں کوئی سچا بزرگ ہے؟

جواب: ہاں پروفیسر ہے۔ پروفیسر کی بات دل کو لگتی ہے۔ اثر کرتی ہے۔ یہی سچے ہونے کی سب سے بڑی علامت ہے اور یہی ایک دانشور کو بزرگ سے ممتاز کرتی ہے۔ دانشور کی بات دماغ میں اثر کرتی ہے اور بزرگ کی دل پر، دماغ پر اثر وقتی ہوتا ہے لیکن دل پر اثر ہوتا ہے تو بندہ بھیگ جاتا ہے اور سے اور ہو جاتا ہے اور پروفیسر کی بات دل تک پہنچتی ہے۔ دوسرا پروفیسر کا طریقہ کار منفرد ہے وہ علم کے زور پر بزرگ بنا ہے۔ عالم سے عالم شخص بھی اس کی ضرب سے نہیں بچ سکتا۔ اگلا زمانہ پروفیسر کا زمانہ ہے۔ باقی سارے بزرگ اس سے پیچھے رہ جائیں گے۔

سوال: اسلام پر آپ نے رائے نہیں دی۔

جواب: اسلام دو ہیں۔ ایک مولوی کا جاہل اسلام دوسرا اللہ کا علم اور عمل میں گوندھا اسلام۔ بدقسمتی سے رائج اسلام مولوی کا اسلام ہے۔ اسی لئے مسلمان تیزی سے تنہا ہو رہا ہے۔ ماڈرن لائف اسے قبول نہیں کر رہی وہ بنیاد پرست اور "فنڈامینٹلسٹ" بن کر رہ گیا ہے۔ پاکستان میں اگر دس ہزار مساجد ہیں تو ہر مسجد میں ایک جاہل اور ان پڑھ شخص اسلام کے بارے میں "ڈس انفارمیشن" پھیلا رہا ہے اور اسے روکنے والا کوئی نہیں اور تو اور اسلام آباد کی لال مسجد میں جہاں ہر نمازی ۲۰ گریڈ کا افسر ہوتا ہے امام خطبہ دیتا ہے تو کہتا ہے جرابیں پہن کر نماز پڑھنے سے نماز فسق ہو جاتی ہے اور سینکڑوں کے مجمعے سے کوئی ایک شخص بھی کھڑا ہو کر اس مولوی کو اس جہالت پر نہیں ٹوکتا اور کوئی ٹوکنے کی جرأت کرے بھی کیسے جو کھڑا ہوگا وہ رُشدی بن کر قابل گردن زنی ہو جائے گا۔ اس کا مردہ تک جلا دیا جائے گا۔ خدا جس قدر وسیع قلب ہے مولوی اسے اسی قدر تنگ نظر بنا کر پیش کر رہا ہے۔ مجھے خطرہ ہے کہیں مولوی سے

نفرت ہماری آئندہ نسل کو عیسائیت، یہودیت یا دہریت قبول کرنے پر مجبور نہ کر دے۔ شہریت تو ہماری نسل تبدیل کر رہی ہے۔ اصل اسلام امن ہے آشتی ہے، رواداری ہے، وسیع القلبی ہے۔ وہ سارے وصف جو نبی اکرمؐ کے تھے اسلام کی بنیاد ہیں جو اسلام اختلاف رائے کی اجازت نہیں دیتا "کفار مکہ" کے اعتراضات کو خندہ پیشانی سے برداشت نہیں کرتا اسلام نہیں ہو سکتا بلکہ وہ تو مذہب بھی نہیں ہو سکتا۔ کیا مولوی کا اسلام اس کسوٹی پر پورا اترتا ہے؟ جواب دیں اگر آپ نے آج جواب نہ دیا تو کل کو تو آپ کو جواب دینا ہی پڑے گا لیکن مجھے افسوس ہے میں آپ کا جواب سننے کے لئے موجود نہیں ہوں گا۔

سوال: کیا آپ خود مسلمان ہیں؟

جواب: میں اندر سے مسلمان ہوں، ایمان سے لبالب اللہ کے شیرے میں لتھڑا ہوا جیسے جلیبی شیرے میں لتھڑی ہوتی ہے لیکن میرا ظاہر مسلمان نہیں۔ میں نے اپنے ظاہر کو مسلمان کرنے کی کوشش کی لیکن یہ ممتاز مفتی ہی رہا۔ تنگ آ کر میں نے اسے آزاد چھوڑ دیا۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں جو باہر سے ایمان ہی ایمان ہوتے ہیں، مسلمان ہی مسلمان ہوتے ہیں لیکن اندر سے پکے ممتاز مفتی ہوتے ہیں لیکن میں باہر سے ممتاز مفتی ہوں، چلو یہی غنیمت ہے۔

سوال: آپ شاید زندگی بھر "محبوب آپ کے قدموں میں" قسم کا کوئی عمل کرتے رہے ہیں۔ اسی لئے آپ کو اتنے چاہنے والے ملے؟

جواب: نہیں بھائی ہرگز نہیں لیکن میں تمہیں ایک ایسا نسخہ بتا دیتا ہوں۔ دنیا میں اس سے بڑا کوئی جادو نہیں۔ وہ ہے "قرآن مجید"۔ اس کا ہر لفظ ہر آیت "عمل" ہے۔ کوئی سی آیت لے کر اس کا مسلسل ورد شروع کر دو بس ایک احتیاط ہو اس میں کسی دن کا ناغہ نہ آئے۔ چند ہی دن میں وہ آیت مجسم شکل میں تمہارے سامنے آ جائے گی۔ انہیں کوئی بتائے یہ سفلی علوم کے پیچھے بھاگنے والے بڑے بے وقوف ہیں۔ یہ پاگلوں کی طرح راتوں کو قبرستان میں ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر وظیفے پڑھتے رہتے ہیں انہیں کوئی بتائے بے وقوفو قرآن کی طرف آؤ، یہاں سے جو خزانے تمہارے ہاتھ آئیں گے وہ کہیں اور سے نہیں ملیں گے۔

سوال: مرنے کے بعد جنت میں جانا پسند کریں گے یا؟

جواب: میں جنت میں جانا بالکل پسند نہیں کروں گا کیونکہ مجھے اللہ تعالیٰ کی جنت سے بہت اختلاف ہے۔ میں تبدیلی کا شخص ہوں اور وہاں صرف یکسانیت ہوگی کوئی بھی معقول شخص ہزاروں برس تک انگور نہیں کھا سکتا، دودھ اور شہد مجھے ویسے بھی پسند نہیں، انگوروں کے درخت میرے حسن ذوق پر گراں گزرتے ہیں اور حوروں کے ساتھ مباشرت سے مجھے گھن آتی ہے لہٰذا میں اللہ تعالیٰ سے یہی گزارش کروں گا کہ مجھے زیادہ لوگوں میں رکھے۔ مولویوں سے بچائے۔

سوال: آپ خود کو واقعی عظیم ادیب سمجھتے ہیں؟

جواب: نہیں جاوید مجھے آج اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ میرا سارا ادب سفارشی ہے۔ میں پوری زندگی لوگوں کے کہنے پر لکھتا رہا کسی رسالے کے ایڈیٹر نے زور دیا تو میں نے کہانی لکھ کر بھیج دی، کسی دوست نے کہا تو میں نے اس پر خاکہ لکھ دیا میں ادیب نہیں ہوں کیونکہ ادیب کے لئے زبان پر عبور اور اچھوتا خیال ضروری ہے اور یہ دونوں چیزیں میرے پاس نہیں۔ اردو زبان مجھے سرے سے نہیں آتی۔ خدا گواہ ہے میں نے آج تک اردو ادب کی کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ انگریزی پڑھتا رہا پنجابی بولتا رہا جب لکھنے کی باری آئی تو انگریزی میں سوچ کر اسے اپنی ہی جناتی زبان میں لکھ دیا۔ اہل زبان نے بہت شور مچایا۔ ادیبوں نے بڑا احتجاج کیا لیکن میں نے سنی ان سنی کر دی کیونکہ میں کون سا ادب تخلیق کر رہا تھا جو پریشان ہوتا۔ اسی مشقت کے دوران مجھے ادیب مان لیا گیا۔ لوگوں نے کہا مفتی بڑا مہان ہے اس نے اپنی ہی زبان دریافت کر لی۔ میں نے سنا تو ہنس دیا کیونکہ مجھے پتا ہے میں کس قدر مہان ہوں۔ میں نے جو کچھ لکھا خود کو سامنے رکھ کر لکھا، اپنی خامیاں کوتاہیاں اندر کے چور اندر کے منافق کو دنیا کے سامنے پیش کیا خود کو بار بار لوگوں کے سامنے پیش کرتا رہا کہ لوگ ''ایلی'' کو دیکھ کر اپنی کمزوریوں تک پہنچ جائیں۔ ان کے اظہار سے نہ گھبرائیں۔ میں نے معاشرے یا فرد کی اصلاح کو مدنظر رکھ کر کبھی نہیں لکھا۔ اگر نادانستگی میں ایسی کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہو تو بندہ معافی کا خواستگار ہے۔ میرے بیٹے کو بھی مجھ سے یہی اختلاف ہے۔ وہ ہمیشہ کہتا ہے بابا تم نے معاشرے کو

سدھارنے کے لئے کچھ نہیں کیا تو میں اسے کہتا ہوں اچھا میں اگر ایسا کرتا تو دوسرے روز میرے دروازے پر پولیس کا سپاہی آ کر کھڑا ہو جاتا، یہ لوگ ادیب کی بات کہاں برداشت کرتے ہیں کیونکہ یہ لوگ سمجھتے ہیں لکھاری حاکم وقت کی مداح کے لئے بنے ہیں۔ قصیدہ خواں ہیں، درباری ہیں، انہیں اختلاف کا کوئی حق نہیں۔ میں ایسا نہیں کر سکتا تھا لہٰذا پولیس سے بچنے کے لئے میں نے اپنی ذات کے کیڑے نکالنا شروع کر دیئے۔ اگر آپ اس کو ادب کہتے ہیں تو اپنے رسک پر کہہ لیں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔

سوال: طویل عمری کے لئے کیا کھاتے رہے ہیں؟

جواب: یار نہیں مجھے میرے اندر کے نوجوان نے ۹۰ برس تک زندہ رکھا۔ دراصل میرا جذباتی ارتقاء ۱۵ برس کی عمر میں رک گیا تھا۔ میں نے ہر دور میں نوجوانوں سے محبت کی اس میں خواتین بھی شامل ہیں۔ نوجوان میرے دوست رہے ہیں اگر کوئی بوڑھا میرا دوست بنا تو اس کی سوچ لازمی جوان تھی جو مجھے ابا، تایا، چاچا، نانا کہتا ہے میں اس سے لڑ پڑتا ہوں۔ میں صرف ممتاز مفتی ہوں بلکہ ممتاز بھی فالتو ہے میں صرف مفتی ہوں۔ آج کل میرا ایک پندرہ سالہ لڑکی سے چکر چل رہا ہے وہ کینیڈا میں پڑھتی رہی وہاں اس نے اولیول کے امتحان میں پوری دنیا میں ٹاپ کیا، مجھے بیس بیس صفحے کے خط لکھتی ہے ہر دو سطر بعد مجھے یار لکھتی ہے۔ لڑکیاں مجھے اپنی تصاویر بھیجتی ہیں۔ روز ڈاک سے درجنوں عشقیہ خط موصول ہوتے ہیں، کبھی نوے سالہ بوڑھوں کے ساتھ ایسا ہوا؟ نہیں ہرگز نہیں یہ صرف مفتی کے ساتھ سپیشل سلوک ہے کیوں؟ اس لئے مفتی پوری زندگی نوجوان رہا وہ کبھی بزرگ نہیں بنا وہ بابا نہیں بنا اس نے کبھی نوجوانوں کو نصیحت کی لاٹھی سے نہیں ہانکا۔ اس نے کبھی جنریشن گیپ پیدا نہیں ہونے دیا۔ اس میں کبھی بناوٹ نہیں آئی اس نے کبھی دانش نہیں بھاڑی اس نے ہمیشہ نوجوانوں سے ان کے دل پسند موضوعات پر گپ لگائی۔ ادب میں بھی اور محفل میں بھی۔

سوال: آج نوے برس بعد جو خواہش سب سے زیادہ تنگ کرتی ہے۔

جواب: مجھے مرنے کا بہت شوق ہے۔ جی جی کر اکتا گیا ہوں، تنگ آ گیا ہوں اب میں

ریسٹ چاہتا ہوں۔ اب میری چھٹی ہو جانی چاہیے۔ شہاب کے بعد عزرائیل میری تلاش میں نکلا تھا لیکن وہ تھوڑا سا لیٹ ہو گیا اور میں نے ''الکھ نگری'' شروع کر دی' وہ آیا' ''پیز'' میں اس سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے تھوڑی سی مہلت مانگی وہ مان گیا'' الکھ نگری'' مکمل ہوئی تو میں اس کا دوبارہ انتظار کرنے لگا لیکن اس کے جانے ایک اور پیغام آ گیا کہ اب ''تصوف'' پر بھی کتاب لکھو' اپنی زندگی کی آخری کتاب۔ تو میں ہنس پڑا، کہاں تصوف کہاں ممتاز مفتی' اسلام کے بارے میں میری معلومات اس سے زیادہ نہیں ہیں کہ اس میں اللہ اور نبی کا بار بار ذکر آتا ہے اور یہ ا، س، ل، اور م سے بنا ہے۔ میں نے پیغام کو پیغام رساں کی غلطی سمجھ کر ایک طرف رکھ دیا کچھ دنوں بعد دروازے پر ایک لمبی داڑھی اور اونچے پگڑ والے بزرگ آ گئے۔ کتابوں سے بھرا ایک تھیلا میرے ہاتھ میں پکڑا کر کہنے لگے آپ جو کتاب لکھ رہے ہیں یہ کتابیں آپ کو اس سلسلے میں رہنمائی دیں گی' میں نے کہا یا حیرت یہ کیا تماشہ ہے پھر آگے پیچھے سے پیغامات کی بھرمار ہو گئی۔ تخی سلطان باہو نے بھی بندہ بھیج دیا، داتا صاحب کے ہرکارے بھی پہنچ گئے، ناچار میں نے سوچا صرف کتاب لکھنے کی پابندی ہے معیاری کتاب لکھنے کی تو نہیں چنانچہ ''تلاش'' کے نام سے ایک سلسلہ شروع کر دیا۔ بیس پچیس قسطوں کے بعد تنگ آ کر یہ سلسلہ بند کر دیا۔ پھر پیغام آیا جب تک یہ مکمل نہیں ہو گی آپ کو چھٹی نہیں مل سکتی ناچار دوبارہ شروع کر دی۔ امید ہے چھ مہینے بعد یہ کتاب مکمل ہو جائے گی' اس کے بعد انشاء اللہ میں فوت ہو جاؤں گا' میری میرے اللہ سے ملاقات ہو گی' اب تو اس ملاقات کے شوق میں زندہ ہوں۔ پتہ نہیں کب یہ شوق پورا ہو گا۔

یہ مفتی صاحب کا انٹرویو تھا۔

اب آتے ہیں مفتی صاحب کی شخصیت کی طرف۔

(مفتی صاحب کی شخصیت ایک طویل داستان ہے۔ یہ داستان کہنے کے لیے بے تحاشہ وقت اور یکسوئی درکار ہے۔ میں یہ داستان کسی اور وقت پر اٹھا رکھتا ہوں۔ انشاء اللہ یار زندہ صحبت باقی)

● ● ●

عطاء الحق قاسمی

میں زندگی میں جن لوگوں سے متاثر ہوا عطاء الحق قاسمی صاحب کا شمار ان میں پہلے نمبر پر ہوتا ہے۔ وہ محض ادیب، شاعر، دانشور اور کالم نگار نہیں ہیں۔ وہ ایک شاندار انسان بھی ہیں۔ وہ مجھے اپنے دوستوں کی فہرست میں شامل رکھتے ہیں۔ یہ میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں۔ میں نے ان سے یہ انٹرویو ۱۹۹۷ء میں لیا تھا۔ یہ انٹرویو کم اور انشائیہ زیادہ ہے۔ آپ اس انٹرویو میں ایک ایسے عطاء الحق قاسمی سے ملیں گے جس سے آپ پہلے واقف نہیں تھے۔ یہ انٹرویو بھی آپ بیتی کے سٹائل میں لکھا گیا۔

......

روایت کے مطابق ہمارے آباؤ اجداد عرب سے برصغیر پاک و ہند آئے تھے جبکہ عرب میں ہمارا شجرہ نسب حضرت ابوبکر صدیقؓ سے جا ملتا ہے۔ عرب سے ہمارا خاندان پہلے آگرہ آیا اور پھر کشمیر منتقل ہو گیا۔ جہاں تقریباً آٹھ سو برس مقیم رہنے کے بعد یہ خاندان امرتسر جا بسا۔ میری پیدائش امرتسر ہی میں یکم فروری ۱۹۴۳ء کو ہوئی۔

ہمارا خاندان بنیادی طور پر ایک علمی و مذہبی خانوادہ ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے کئی معروف علماء و مشائخ ہمارے بزرگ اساتذہ کے شاگرد تھے جن میں شیخ احمد سرہندیؒ (مجدد الف ثانی) اور ملا عبدالحکیم سیالکوٹی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا مفتی محمد حسن (جامعہ اشرفیہ والے) میرے دادا مفتی غلام مصطفیٰ قاسمی کے شاگرد تھے۔ میرے دادا کا پیری مریدی کا سلسلہ بھی باقاعدگی سے چلتا رہا پھر میرے والد مولانا بہاء الحق قاسمی نے اس سلسلے کو ختم کر دیا۔ انہوں نے پوری زندگی امام مسجد اور استاد کی حیثیت سے معاشرے کی خدمت کی۔

ہم کل آٹھ بھائی بہن ہیں، چھ بہنیں اور دو بھائی۔ مجھ سے چھوٹی ایک بہن ہے اس لحاظ سے میرا نمبر ساتواں ہے۔ ہم بھائیوں کی پیدائش کے حوالے سے ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اباجی کو نرینہ اولاد کی خواہش تھی مگر جب بیٹیاں پیدا ہوتی گئیں تو وہ ایک بزرگ سے ملے اور ان سے کہا وہ دعا کریں کہ ان کے ہاں بیٹا پیدا ہو۔ چنانچہ بزرگ نے انہیں ایک تعویذ دیا۔ اس کے بعد میرے بڑے بھائی ضیاء الحق قاسمی پیدا ہوئے اس کے بعد پھر کئی بیٹیوں کی پیدائش کے بعد دوبارہ تعویذ لیا تو میری پیدائش ہوئی۔ یوں ہم دونوں بھائیوں کی پیدائش ایک تعویذ کی برکت اور بزرگ کی دعاؤں سے ہوئی بعد ازاں بزرگ نے اباجی کو اجازت دے دی وہ ضرورت مندوں کو یہ تعویذ

دے سکتے ہیں اور حیرت کی بات ہے کہ انہوں نے جس جس کو یہ تعویذ دیا اس کے ہاں نرینہ اولاد ہی پیدا ہوئی۔

ابھی میں نے ہوش نہیں سنبھالا تھا کہ پاکستان معرضِ وجود میں آ گیا۔ اس موقع جب برصغیر فسادات کی لپیٹ میں تھا ہم لوگ ہجرت کر کے پاکستان چلے آئے۔ اباجی نے وزیرآباد کا شہر منتخب کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں میری نانی جان رہتی تھیں جو بیوہ تھیں اور بچوں کو قرآن کریم پڑھا کر گزارا کرتی تھیں۔ یہ فطری بات ہے کہ جس جگہ انسان کے پہلے سے کوئی عزیز رشتہ دار موجود ہوں وہ وہاں جا کر سیٹل ہونے میں آسانی محسوس کرتا ہے چنانچہ ہم لوگ وزیرآباد آ گئے اس وقت میری عمر چار برس کے قریب تھی۔ جب فسادات شروع ہوئے اور ہم نے ہجرت کی تو اس سے کچھ عرصہ پیشتر ہی امرتسر میں نیا مکان بنایا تھا۔ ہجرت کرتے وقت ہم نے سامان اسی مکان میں سجے دیا اور تالے لگا کر چلے آئے۔ اباجی کا خیال تھا کہ یہ وقتی فساد ہے اور جب یہ ہنگامے ختم ہوں گے تو واپس جا کر اطمینان سے سامان لے آئیں گے لیکن ہنگامے جلد ختم ہونے میں نہ آئے اور جب عرصے بعد سکون ہوا تو دونوں ملکوں کے درمیان سرحدیں بن چکی تھیں جن کو پار کرنا ممکن نہ رہا تھا۔ چنانچہ صبر شکر کر کے بیٹھ گئے۔ اس کے بعد یہاں وزیرآباد میں ایک مکان لے لیا جو خالی تھا لیکن رفتہ رفتہ معمول کا ساز و سامان بھی بنتا گیا۔ اگرچہ ایسے کئی مکان موجود تھے جو سامان سے بھرے ہوئے تھے اور ہندو سکھ جلدی میں انہیں چھوڑ گئے تھے اور ہم ان میں سے جو چاہتے لے سکتے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ تھانیدار اباجی کا مرید تھا۔ اس نے انہیں کئی مکان دکھائے اور کہا کہ جو پسند آئے لے لیں۔ اباجی ایک مکان میں گئے جسے غالباً سائیکلوں کا گودام بنا رکھا تھا اور اس میں نیچے سے اوپر تک سائیکلیں ہی سائیکلیں بھری تھیں اباجی نے کہا یہ حرام کا مال ہے جو میں نہیں لے سکتا۔ وہ اسے حرام کا مال اس لئے کہہ رہے تھے جو سامان وہ امرتسر چھوڑ کر آئے تھے وہ بہرکیف اتنا نہ تھا۔ دوسرا مکان تین چار منزلہ تھا اور ساری منزل سامان سے پُر تھیں اسی طرح سامان اور مال سے بھرے کئی مکان دکھائے گئے مگر اباجی کا جی نہ مانا۔ آخر خالی مکان لیا گیا کیونکہ اباجی کا خیال تھا کہ وہ یہ مکان تو اپنے امرتسر والے مکان کے بدلے میں لے رہے ہیں جبکہ سامان وہاں موجود ہے جو کسی وقت بھی جا کر لے آئیں گے۔ چنانچہ انہیں صرف خالی مکان لینا چاہئے۔ اگر ساتھ سامان لیں تو حرام ہوگا۔ تاہم امرتسر سے سامان نہ لایا جا سکا اور نہ ہی واپسی کا راستہ رہا تھا۔

مجھے یہ یاد ہے کہ ہمارے نام جو مکان الاٹ ہوا تھا وہ غالباً سکھوں کا تھا کیونکہ اس میں

دیواروں پر سکھوں کی تصاویر لگی تھیں۔ اس کے علاوہ وہاں ایک سنکھ پڑا تھا اتنی چھوٹی عمر کا ہونے کے باوجود مجھے یہ بات اچھی طرح یاد ہے۔ اسی طرح یہ بھی یاد ہے کہ ایک دن روشن نام کا ایک تیلی کسی ہندو کو لوٹ کر بھاگ رہا تھا اور پولیس اس کا پیچھا کر رہی تھی ہمارے گھر کے پاس سے گزرتے ہوئے جب اس نے دیکھا کہ پکڑا جائے گا تو زیورات کی تھیلی جو اس کے ہاتھ میں تھی وہ اس نے فضا میں اچھال دی جو ہمارے گھر کے اندر آ گری۔ اباجی چاہتے تو یہ تھیلی اٹھا کر رکھ لیتے مگر انہوں نے اسی طرح وہ تھیلی اٹھا کر باہر گلی میں پھینک دی۔ اسی طرح ایک اور واقعہ مجھے یاد ہے۔ ہمارے گھر سے دو تین فرلانگ کے فاصلے پر ایک ''گوردوارہ'' تھا جہاں ہندو سکھ پناہ لئے ہوئے تھے۔ ایک روز مسلمانوں نے اسے آگ لگا دی جب شور بلند ہوا تو سب گھر والے چھت پر چڑھ کر دیکھنے لگے۔ مجھے یاد ہے کہ دور گوردوارے سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ یہ دیکھ کر امی اور میری بہنیں رونے لگیں۔ مجھے یہ ٹھیک سے یاد نہیں کہ ان بے چارے ہندو سکھوں کا کیا ہوا ہوگا لیکن ظاہر ہے وہ اس میں جل مرے ہوں گے۔ دراصل ایسا سرحد کے دونوں طرف ہوا اور ایک دوسرے کے ردعمل کے طور پر ہوا۔

وزیرآباد آنے سے پہلے اباجی امرتسر میں ایم اے او سکول اور پھر ایم اے او کالج میں پڑھاتے تھے یہاں آ کر بھی وہی پیشہ اختیار کیا۔ اور ایم بی ہائی سکول وزیرآباد میں اسلامیات کے استاد مقرر ہوئے اس کے ساتھ وہ مسجد میں امامت بھی کراتے تھے۔ مجھے ٹھیک سے علم نہیں کہ انہیں کتنی تنخواہ ملتی تھی، غالباً سو روپے تھی۔ کئی برس کے بعد ڈیڑھ سو روپے تک ہوگئی اور اس کے بعد دو سو روپے۔ اس زمانے کے حساب سے بھی دیکھیں تو یہ آمدنی بہت زیادہ نہیں تھی۔ گھر کے افراد کی تعداد دس تھی۔ اس لحاظ سے گزر بسر غربت ہی میں ہوتی تھی لیکن یہ غربت تلخیوں اور محرومیوں سے بالکل پاک تھی بلکہ میرے لئے یہ بہت سہانا اور دلکش زمانہ تھا۔ مجھے اس زمانے کے حوالے سے غربت کی وجہ سے محرومی یا دکھ کا کوئی ایک واقعہ بھی یاد نہیں۔ اس دور کی تمام یادیں بہت خوشگوار ہیں۔ اس حیرت انگیز حقیقت کی کئی وجوہات ہیں ایک تو ہمارے گھر کا ماحول اور والدین کی تربیت تھی دوسرے ہم سب کا آپس میں پیار بہت تھا۔ خصوصاً مجھے میری بہنوں نے بہت پیار دیا۔ میرا نام نیم شہزادہ تھا اور وہ میرے ساتھ شہزادوں ہی کی طرح سلوک کرتی تھیں۔ پھر والدین نے ہمیں ایک احساس تفاخر دے دیا تھا جس کے سامنے غربت اور دوسری مادی تکالیف کی کچھ اہمیت نہیں رہی تھی۔ اول تو انہوں نے ہمیں یہ بتایا کہ جو کچھ تم لوگوں کو کھلایا جا رہا ہے یہ رزق حلال ہے اور اس

کے اندر رہ کر گزارا کرتا ہے۔ کسی دوسرے کی جھونپڑی کی طرف نظر نہیں کرتی بلکہ اپنی روکھی سوکھی کھا کر گزارا کرتا ہے۔ دوسرا یہ کہ ہمارا خاندان ایک ہزار برس سے علمی خاندان ہے اور ہمارا فخر اور عزت پیسہ اور جاہ وجلال نہیں، علم ہے۔ یہ ایک ایسا احساس تھا جس نے نہ تو ہم میں احساس کمتری پیدا ہونے دیا اور نہ کوئی محرومی، محرومی رہی۔ اصل میں ہمیں جو تعلیم دی گئی تھی اس میں یہ بتایا گیا تھا کہ سب انسان برابر ہیں۔ اگر کسی کو کسی پر برتری حاصل ہے بھی تو صرف پرہیز گاری، علم اور شرافت کی بناء پر اور پھر اس پر غرور کرنا بھی درست نہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہمارے گھر کے سامنے ملک عطاء اللہ کی دکان تھی۔ وہاں سے صبح صبح نان اور دہی لائے جاتے۔ یہ ہمارا ناشتہ ہوتا تھا۔ دوپہر کو ہمارے ہاں اکثر روٹی نہیں پکتی تھی۔ گرمیوں کے موسم میں ایک روپے کے خربوزے لائے جاتے جو عام طور پر پانچ چھ آنے سیر کے حساب سے ملتے یعنی ایک روپے میں دو تین سیر مل جاتے۔ یہ ہمارا لنچ ہوتا تھا۔ اگر کسی کا روٹی کھانے کو جی چاہتا تو امی جی آٹے میں نمک ڈال کر روٹی پکا دیتیں جو وہ خربوزوں کے ساتھ کھا لیتا۔ گھر میں روزانہ ڈیڑھ پاؤ گوشت آتا تھا' اس میں کوئی سبزی ڈال کر پکایا جاتا۔ یہ ہمارا ''ڈنر'' ہوتا۔ سردیوں میں نمکین کشمیری چائے پکتی جو سماوار میں ڈال کر نیچے کوئلے جلا دیئے جاتے۔ ہم یہ چائے وقفے وقفے سے پیتے رہتے۔ یہ ہمارا روزانہ کا مینو تھا اور جو لذت ہمیں اس وقت ان کھانوں میں ملی بعد میں فائیو سٹار ہوٹلز کے کھانوں یا چائنیز کھانے کھا کر بھی نہیں مل پائی۔

دراصل اس زمانے میں اگر ہمارے پاس پیسہ نہیں تھا تو بیشتر دوسرے لوگوں کے پاس بھی نہیں تھا اور جن کے پاس تھا وہ اس کی اس طرح نمائش نہیں کرتے تھے جس طرح آج کی جارہی ہے۔ امیر اور غریب کی زندگی میں فرق تو تھا مگر اتنا زیادہ نہیں جتنا آج پیدا ہو گیا ہے۔ پھر وزیر آباد جیسی جگہ پر کار، بنگلے اور اس طرح کی پرتعیش چیزوں کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی نہ اسکی محرومی دکھ کا باعث بنتی تھی۔ ریلوے اسٹیشن، سکول، بازار ہر جگہ اتنی نزدیک تھی کہ وہاں پیدل پہنچا جا سکتا تھا۔ رہے ٹی وی، وی سی آر تو کم از کم پاکستان میں ابھی یہ پہنچے بھی نہیں تھے۔ البتہ ہمارے گھر میں ایک ریڈیو موجود تھا جس پر پھول کاڑھے ہوئے کپڑے کا غلاف چڑھایا ہوتا تھا اور بہت سجا کر رکھا ہوتا تھا۔ اباجی کی طرف سے اس پر صرف خبریں سننے کی اجازت تھی تاہم جب وہ گھر پر نہ ہوتے تو ہم اس پر گیت اور دوسرے پروگرام بھی سن لیتے۔

بچپن میں مجھے دو کاموں کا بہت شوق تھا۔ ایک پتنگ بازی، دوسرا گولیاں (بنٹے)

کھیلنا۔ اور اباجی کو یہ دونوں کام ناپسند تھے۔ چنانچہ جب میں ان میں سے کوئی کام کرتا پٹائی ہونا لازمی تھی۔ پتنگ بازی کا شوق اس قدر زیادہ تھا کہ گرمیوں میں جب سخت گرمی پڑ رہی تھی، سیڑھیوں میں ذرا سی چھاؤں ہوتی تھی اور میں وہاں کھڑے ہو کر پتنگ اڑاتا تھا۔ پتنگ اڑاتے ہوئے میری ہمیشہ یہ خواہش اور کوشش ہوتی تھی کہ کوئی میرے ساتھ پیچ نہ لڑائے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں سپیشل ڈور بنا کر، مانجھا لگا کر پتنگ بازی نہیں کرتا تھا۔ میں تو دوسروں کی کٹی ہوئی پتنگوں کو لوٹتا تھا۔ ان کے ساتھ جو تھوڑی سی ڈور ہوتی تھی وہ میں کاغذ کے بڑے سے گولے پہ لپیٹ لیتا۔ مزید ڈور ملتی تو گانٹھ لگا کر اس کے ساتھ جوڑ لیتا۔ یوں میری ڈور کا پنا رنگ برنگی اور گانٹھ دار ڈوروں پر مشتمل ہوتا۔ اس کے ساتھ پیچ لڑانے کا صرف ایک ہی مطلب تھا کہ میری پتنگ کٹ جائے چنانچہ جب میں پتنگ اڑاتا تو کسی کے ساتھ پیچ ڈالنے سے بچتا۔ مگر بہت دفعہ دوسرے میرے نہ چاہنے کے باوجود پیچ ڈال دیتے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ میری پتنگ کٹ کر گر پڑتی اور ہاتھ میں صرف کاغذ کا خالی گولا رہ جاتا۔

ہماری گلی کے کونے میں ایک خالی پلاٹ تھا جسے ہم کھولا کہتے تھے۔ اس کھولے میں میں اپنے دوستوں کے ساتھ گولیاں اور اخروٹ کھیلتا' اس کے علاوہ گلی ڈنڈا بھی کھیلتا جو اباجی کو اتنا ہی ناپسند تھا جتنا اخروٹ اور گولیاں کھیلنا۔ جب میں گھر میں ہوتا تو ہم بہن بھائی مل کر لڈو کھیلتے۔ یہ عام طور پر سردیوں میں ہوتا تھا۔ جب ہم سارے بہن بھائی لحاف میں بیٹھ جاتے' کوئلوں والی کانگڑی پیروں میں جما لیتے اور لڈو کھیلنے لگتے۔ یہ کام بھی اباجی سے نظر بچا کر کرتے کیونکہ اس کی اجازت بھی نہیں تھی۔ اس کا یہ مطلب یہ نہیں کہ اباجی کی طرف سے ہمیں کسی قسم کے کھیل کی اجازت نہیں تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ گوروکوٹھے میں مجید پہلوان کا اکھاڑا تھا جہاں پہلوان زور کرتے یا کشتیاں ہوتیں۔ یہ دیکھنے کی اجازت تھی۔ فٹ بال کھیلنے کی اجازت بھی تھی۔ لیکن میں اپنی افتادِ طبع سے اپنے پسندیدہ کھیلوں سے باز نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لئے اس کے علاوہ کوئی اور کھیل کھیلتا تو مار پڑنا لازمی تھی اور خوب پٹتا تھا۔ ویسے تو کئی پٹائیاں یاد ہیں مگر ایک پٹائی بہت اچھی طرح یاد ہے۔ تب ہم ایک اور کھیل بھی کھیلا کرتے تھے جو اس زمانے کے بچوں میں بہت مقبول بھی تھا۔ لوہے کے ایک چھوٹے سے چکر کو لوہے کی چھڑی کے ساتھ منسلک کر کے سڑکوں پر دوڑایا جاتا تھا۔ اسے معلوم نہیں کیوں ریڑھا کہتے تھے حالانکہ یہ کسی لحاظ سے بھی ریڑھا نہیں تھا۔ میں اور میرے دوست یہ ریڑھے چلاتے ہوئے بعض دفعہ کرم آباد تک چلے جاتے جو مولانا ظفر علی

خان کا گاؤں ہے اور وزیر آباد سے کئی میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں ایک مزار پر بیریاں لگی ہوئی تھیں جن پر چڑھ کر ہم بیر کھایا کرتے تھے۔ ایک بار ہم چار دوستوں نے وہاں چل کر بیر کھانے کا پروگرام بنایا اور ریڑھے گھماتے پیدا چل پڑے۔ سڑک پر بسیں گزر رہی تھیں۔ ہم نے پروگرام بنایا کہ بسوں کو روڑے مارے جائیں۔ چنانچہ ہم چاروں بچے ہاتھوں میں چھوٹے چھوٹے پتھر پکڑ کر کھڑے ہو گئے۔ جیسے ہی ایک بس قریب آئی ہم نے اس پر پتھر پھینکے۔ ان میں سے کئی پتھر مسافروں کو لگے۔ ڈرائیور نے بس کو بریک لگا کر روک لیا۔ یہ دیکھ کر ہم کھیتوں کی طرف بھاگے مگر ان لوگوں نے ہمیں تھوڑی دور جا کر پکڑ لیا۔ اس کے بعد سب کی پٹائی شروع ہو گئی۔ باقی تینوں کی تو پٹائی ہوئی مگر ایک مسافر نے مجھے پہچان لیا۔ اس نے دوسرے مسافروں کو مجھے مارنے سے روکا اور کہا ''میں اسے جانتا ہوں یہ ہمارے مولوی صاحب کا بیٹا ہے۔ میں ان سے اس کی شکایت کروں گا۔'' چنانچہ مجھے وہاں تو مار نہ پڑی لیکن جب ابا جی کو اس واقعے کا علم ہوا تو انہوں نے اس قدر مارا کہ اس کے مقابلے میں دوسرے بچوں کو مسافروں کے ہاتھوں پڑنے والی مار کی کچھ حیثیت نہ رہی۔

جیب خرچ کے حوالے سے بتاتا ہوں کہ مجھے روزانہ دو پیسے ملتے تھے۔ سکول میں جب آدھی چھٹی ہوتی تو میں محمد حسین بلے کی ریڑھی سے ان کے آلو چھولے کھا لیتا تھا۔ میرے پاس کپڑوں کے دو تین جوڑے ہوتے تھے ایک جوڑا تین دن پہننا ہوتا تھا تاہم یہ اگر جلد گندا ہو جاتا تو امی جی دو دن بعد ہی دھلا ہوا جوڑا پہنا دیتیں۔ سردیوں میں ایک موٹا سویٹر بھی پہننے کو ملتا مگر یہ سردی سے پوری طرح بچا نہیں پاتا تھا۔ کبھی کبھی ہمیں عید پر نئے کپڑے اور جوتے لے کر دیے جاتے مگر یہ ضروری نہیں تھا۔ بیشتر عیدوں پر پرانے ہی کپڑے پہن کر گزارا کر لیتے لیکن اس کے باوجود اس زمانے میں ہمیں عید کی آمد کی جو خوشی اور اشتیاق ہوتا تھا اس کا تو اب تصور ہی ممکن نہیں۔ تب تو ہم ایک ایک دن گن گن کر گزارتے اور چاند رات کو خوشی اور جوش و خروش اپنی انتہا پر ہوتا۔ ہم سر شام ہی گھر کی چھت پر چڑھ جاتے اور مغرب کی طرف چاند تلاش کرنا شروع کر دیتے جب نظر آ جاتا تو ہم خوشی سے نعرے لگانے لگتے۔

ابا جی سال میں ایک بار موسم گرما میں پکنک کا پروگرام بھی بناتے تھے۔ اس روز چار پانچ تانگے منگوائے جاتے اور ہم سب اہل خانہ کے علاوہ ہمارے پھوپھی زاد اور خالہ زاد بھی ان تانگوں پہ بیٹھ کر دریائے چناب پر جاتے۔ یہ دریا وزیر آباد سے دو تین میل کے فاصلے پر ہے۔

ہم سارا راستہ تانگے کی سواری سے لطف اندوز ہوتے دریا پر پہنچ جاتے۔ ساتھ تربوز لے جاتے تھے جو وہاں پہنچتے ہی دریا میں ڈال دیے جاتے تاکہ ٹھنڈے ہو جائیں۔ ابا جی اس زمانے میں بہت تنومند جوان تھے۔ وہ باری باری ہمیں اپنی کمر پہ بٹھاتے اور دریا میں تیرتے تیرتے دور نکل جاتے یوں تیراکی نہ جاننے کے باوجود ہم دریا کی سیر کر لیتے۔ جب سب لوگ تھک جاتے تو کسی سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ کر ٹھنڈے یخ تربوز کاٹ کاٹ کر کھاتے۔ یہ اس زمانے میں ہماری عیاشی کی انتہا تھی۔

اس زمانے کے وزیر آباد کی یادوں میں ایک اہم یاد وزیر آباد کی راجا فیملی ہے جو اس شہر کے امیر ترین لوگوں میں سے ہیں۔ کسی زمانے میں یہ باقاعدہ حکمران خاندان تھا مگر جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں تب ان کی حکمرانی کا دور ختم ہو چکا تھا اگرچہ اس کے کئی افراد بعد میں وزیر مشیر مقرر ہوئے۔ اس خاندان کی ایک بہت بڑی حویلی تھی جسے شمن کہتے تھے۔ اس کی چھتوں پر مورچے بنے ہوئے تھے اور اندر تہہ خانوں میں پرانے عقوبت خانے موجود تھے۔ یہاں ایک پھانسی گھر بھی تھا۔ حویلی کے مین گیٹ میں داخل ہوتے ہی یہ احساس ہوتا تھا کہ یہ گیٹ یا تو ہاتھیوں کے لئے بنایا گیا ہے یا ہاتھی والوں کے گزرنے کے لئے۔ میری نانی جان راجا خاندان کے بچوں کو قرآن کریم پڑھاتی تھیں اور اس خاندان کے چھوٹے بڑے سب ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ نانی جان مجھے دو تین مرتبہ اس حویلی میں لے گئیں مگر مجھے وہاں جانا زیادہ پسند نہیں تھا۔ اس لئے کہ حویلی کا جو نقشہ میں نے بتایا ہے اسے دیکھ کر میں خوف زدہ ہو جاتا تھا۔

اسکول کے زمانے میں مجھے ایک بھی ایسا استاد نہیں ملا جس کی شخصیت متاثر کن ہو۔ اسکول کی تو بات ہی کچھ اور تھی کالج اور یونیورسٹی میں بھی جو استاد ملے ان میں سے بھی اکثر متاثر نہ کر سکے۔ ہاں جب میں ابھی میٹرک میں تھا تو ایک روز اسکول میں ایک نیا استاد آیا۔ مجھے آج بھی اس کی شکل و صورت اچھی طرح یاد ہے، وہ دبلے پتلے جسم کا مالک تھا اور اس کی سفید مونچھیں تھیں۔ اس نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے حوالے سے لیکچر دیا۔ اس کا بیان اس قدر خوبصورت اور متاثر کن تھا کہ بے اختیار ہماری آنکھوں میں آنسو آ گئے لیکن معلوم نہیں کیا ہوا کہ وہ اسکول میں بس ایک ہی روز رہا اس کے بعد ہم نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ اس کے سوا باقی اساتذہ میں سے ہر ایک الگ قسم کا نمونہ تھا، مثلاً میٹرک میں ہمارے ایک ماسٹر خدا بخش تھے۔ ان کی ذاتی زندگی دکھوں بھری تھی اور وہ ان سارے ذاتی دکھوں کو اپنے چہرے پر سجائے اور لہجے میں سمیٹے اسکول آتے

تھے، نہ صرف یہ کہ خود کبھی ہنستے ہنساتے نہیں تھے بلکہ اگر کسی کو ہنستا دیکھ لیتے تو ان کا پارہ چڑھ جاتا۔ ان کی آواز بہت باریک سی تھی اور وہ یہ فقرہ اکثر دہراتے تھے کہ جب تم ہنستے ہو تو جی چاہتا ہے کہ تمہیں گولی ماردوں۔ یہ بھی کہتے کہ اگر سکندر مرزا کی جگہ میں صدر ہوں تو قانون بنادوں کہ جو ہنستا نظر آئے اس کی گردن ماردی جائے۔ معمولی باتوں پر بھی کڑی سے کڑی سزا دیتے، اکثر لڑکوں کی انگلیوں کے درمیان پنسل رکھ کر اسے دباتے جس پر لڑکوں کی چیخیں نکل جاتیں۔

اسی طرح ایک ماسٹر دین محمد تھے، یہ خونی بواسیر کے مریض تھے چنانچہ اسکول آتے تو اکثر ان کی شلوار خون سے سرخ ہوتی۔ جب کلاس روم میں داخل ہوتے تو شور اور ہنگامہ بپا ہوتا، داخل ہوتے ہی سامنے جو لڑکا نظر آتا اس سے کہتے "مجھے تم پر شک ہے کہ شور تم مچارہے تھے۔" اس کے بعد ڈنڈے سے اس کی پٹائی شروع کردیتے ایسے میں صورت حال بہت دلچسپ ہوجاتی۔ جب لڑکا اطمینان سے مار کھاتا رہتا اور جب وہ مارتے مارتے تھک جاتے تو بتاتا کہ اسے تو یونہی غلط فہمی میں مارا گیا ہے وہ بے گناہ تھا اور اصل میں شور تو یہ ساتھ والا لڑکا مچارہا تھا۔ اب ماسٹر صاحب پھر یہ کہہ کر پل پڑتے کہ مجھے تو پہلے ہی تم پر شک تھا۔ دوسرا لڑکا بھی اطمینان سے پوری مار کھانے کے بعد بتاتا کہ وہ بھی بے گناہ تھا ورنہ اصل میں شور تو وہ لڑکا مچارہا تھا۔ جس پر "مجھے پہلے ہی تم پر شک تھا" کے فقرے کے ساتھ اس کی باری آجاتی۔ یوں باری باری کلاس کے تمام لڑکے مار کھاتے۔ تو اس طرح کے تو ہمارے اساتذہ تھے ان سے کیا متاثر ہوتے؟ جہاں تک کالج کے اساتذہ کا تعلق ہے تو اسکول کے استادوں کی طرح تو بہر کیف نہیں تھے مگر ان میں بھی کوئی غیر معمولی صلاحیتوں، قابلیت یا علم کا مالک نہیں تھا۔ سب بس نارمل تھے۔ اوسط درجے کے۔ ان میں سے کوئی متاثر کرنے کی اہلیت کا حامل نہیں تھا۔ البتہ یونیورسٹی میں ہمارے اساتذہ میں سید وقار عظیم، سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا تھے۔ ان میں ہر ایک انتہائی متاثر کن شخصیت کا مالک تھا۔ میں ان پر بعد میں گفتگو کروں گا۔ اس وقت ہم دوبارہ کالج لائف کی طرف چلتے ہیں۔

میں ابھی ایف اے ہی میں تھا جب "شہاب" میں کالم نگاری شروع کردی تھی۔ ایم اے تک آتے آتے اور بھی کئی پرچوں میں چیزیں چھپنے لگیں۔ اس دوران میں نوائے وقت کے سٹوڈنٹس ایڈیشن کے لئے بھی لکھتا تھا۔ اس لحاظ سے کالج کے اندر بطور لکھاری اور صحافی میری شہرت تھی۔ ایک روز سید وقار عظیم نے مجھے بلایا اور کہا کہ ہم تمہیں "محور" کا چیف ایڈیٹر بنانا چاہ

رہے ہیں۔ میں نے کہا "سر! اس میں تو انگریزی کا حصہ بھی شامل ہے اور میری انگریزی اتنی اچھی نہیں ہے۔ اب اگر میں چیف ایڈیٹر بنتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں انگلش سیکشن کے مدیر کا بھی انچارج ہوں گا۔ یعنی اس شخص کا جس کی انگریزی مجھ سے اچھی ہے۔ یوں میرے خیال میں یہ مناسب نہیں کہ وہ عہدے لے لوں جس کا میں اہل ہی نہیں۔ ہاں یہ ہے کہ آپ مجھے اردو حصے کا مدیر بنادیں۔" انہوں نے کہا "عجیب آدمی ہو۔ لوگ تو ایسی چیزوں کے پیچھے بھاگتے ہیں جبکہ تمہیں بن مانگے مل رہی ہے اور تم انکار کررہے ہو" تاہم جب میرا انکار جاری رہا تو انہوں نے مجھے چیف ایڈیٹر شپ کے بجائے اردو سیکشن کی ادارت دے دی۔ جبکہ چیف ایڈیٹر رفیع الدین ہاشمی کو بنادیا گیا جس کی انگریزی مجھ سے بھی کمزور تھی۔

نوائے وقت سے میری وابستگی باقاعدہ ملازمت کے بجائے کنٹری بیوٹر کے طور پر تھی اور میں طلباء کی سرگرمیوں کا احوال لکھ کردیتا۔ کبھی کبھی کسی ہونہار سٹوڈنٹس کا انٹرویو بھی کرتا جو نوائے وقت میں چھپتا ان دنوں ایک مزے کا قصہ ہوا۔ ایک لڑکا (جس کا نام میں بیان نہیں کروں گا) ایم اے فارسی کے امتحان میں اول آیا اور اسے گولڈ میڈل ملا۔ اس نے مجھ سے کہا "میرا حق بنتا ہے کہ نوائے وقت میں میرا انٹرویو شائع کیا جائے۔" میں نے کہا ضرور۔ تم ایسا کرو کہ اپنے بارے میں کچھ بنیادی باتیں لکھ دو میں فیچر بنا کر چھاپ دوں گا۔ اس نے اس میں ایسی ایسی "عالمانہ" باتیں لکھیں کہ پڑھ کر ہنسی آتی تھی اور اپنے تعلیمی نظام پہ رونا آتا تھا۔ ان میں گرائمر، زبان اور بیان تینوں کی غلطیاں موجود تھیں۔ ایک فقرہ جو مجھے یاد رہ گیا ہے۔ اس نے یوں لکھا تھا "جب میں اسکول میں پڑھتا تو وہاں ماسٹر صاحب مجھ پہ بہت مہربان تھے اور میری کمر پر اکثر دست شفقت پھیرا کرتے تھے۔" میں حیران ہوا کہ ہمارا تعلیمی معیار ایسا ہوچکا ہے کہ اس جیسے لڑکے نے ٹاپ کیا ہے۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ اس تحریر کو اسی طرح چھاپ دوں اور ساتھ نوٹ لکھ دوں کہ یہ ہمارے فارسی کی کلاس میں فرسٹ آنے والے طالب علم کا حال ہے۔ پھر سوچا کہ غریب آدمی ہے بے چارے کو مصیبت پڑ جائے گی اور نوکری کا مسئلہ بن جائے گا۔ چنانچہ میں نے اسے شائع نہیں کیا۔ کچھ عرصہ بعد وہ لڑکا مجھے ملا اور بولا "قاسمی صاحب! غریب سمجھ کر میرا انٹرویو نہیں چھاپا؟" میں نے کہا "ہاں یار! غریب ہی سمجھ کر نہیں چھاپا۔"

اس عرصے کے دوران میرے جو دوست بنے انہیں چار پانچ کیٹیگریز میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ جو وزیرآباد میں قیام کے دوران تھے، دوسرے وہ جو ماڈل ٹاؤن آنے کے

بعد بنے پھر وہ جن سے ادب کے حوالے سے تعلق بنا۔ ان میں میرے ہم عمر بھی ہیں، بزرگ بھی اور مجھ سے چھوٹے بھی۔

وزیر آباد میں میرے جو دوست تھے ان میں قابل ذکر تین ہیں، سمیع، پھیکا موچی اور منور، ان میں پھیکا اور منور دونوں بہت غریب تھے۔ منور کو تو بعد میں ٹی بی ہوگئی اور غربت کی وجہ سے اس کا علاج نہ ہو پایا چنانچہ اس کی موت واقع ہوگئی۔ جبکہ پھیکا بعد میں ڈاک خانے میں ملازم ہوا اور ایک ٹریفک حادثے میں انتقال کرگیا۔ سمیع کا باپ یوں تو محض ایک گڈز کلرک تھا اور اس کی تنخواہ معمولی تھی مگر اس پوسٹ پر ''فضل ربی'' بہت تھا۔ چنانچہ اس کے ہاں پھلوں کے ٹوکرے کے ٹوکرے آتے جنہیں وہ خود بھی کھاتے اور محلے داروں میں بھی تقسیم کرتے۔ بلکہ بچوں کو باقاعدہ آواز لگا کر بلایا جاتا کہ پھل بٹ رہے ہیں آکر لے جاؤ۔ سمیع کا باپ بہت دل چسپ آدمی تھا۔ کبھی کبھی وہ یوں کرتا کہ آواز لگائے جانے کے بعد جب محلے دار جمع ہوتے تو بالٹی میں پانی بھرتا اور اوپر کی منزل پر جا کر ان پر پھینک دیتا۔ میرا یہ دوست آج کل کراچی میں ہے۔

جہاں تک ماڈل ٹاؤن کے دوستوں کا تعلق ہے تو یہ بہت سے ہیں اور سب میرے جگری یار اور مخلص دوست ہیں۔ ان میں خالدی (فصیح الدین خالد) اکی (اکبر شیخ) مالک، مسعود اللہ خان، طارق بخاری، منیر شاہ اور عارف ہیں۔ عارف مذہبی آدمی تھا جبکہ باقی تمام دوست آزاد خیال اور لبرل بلکہ بہت حد تک مذہب کے باغی تھے۔ ان دوستوں کی صحبت میں رہ کر ان سے بحث مباحثہ کرنے، دلائل سننے اور جوابی دلائل دینے کے نتیجے میں جہاں ایک طرف میں متشدد مذہبی اور جنونی نہ ہوا وہاں دوسری طرف میں نے مذہب کا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کیا اور جستجو کی، جس کے بعد میں ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہونے کی بناء پر نہیں بلکہ خود اپنی عقل اور سمجھ کے ذریعے سے مسلمان بنا۔ میری شخصیت کی تعمیر میں ان دوستوں کا بھی بہت حصہ ہے، ان سے میں نے رواداری اور مروت سیکھی۔

ہم دوستوں کا معمول تھا کہ کوئی دوست گاڑی لے کر آجاتا اور ہم گلبرگ یا مال کی طرف چلے جاتے، مال پر ہماری پسندیدہ جگہ ''گوگو'' ہوتی تھی جہاں ہم سب بیٹھ کر چائے پیتے یا آئس کریم کھاتے، کبھی گوجرانوالہ جانے کا پروگرام بن جاتا جہاں جا کر ہم تکے کھاتے، اسی طرح یوں بھی ہوتا کہ بیٹھے بٹھائے اچانک پشاور جانے کا پروگرام بنا لیتے اور اسی وقت روانہ ہو جاتے، میرے دوست گاڑی بہت تیز چلاتے تھے اور ایک بار ہم پشاور سے واپس لاہور ساڑھے چار گھنٹے

میں پہنچے۔ بس اسی قسم کی سرگرمیاں ہوتی تھی۔ ہم شرارتیں بھی خوب کرتے بلکہ بعض اوقات تو یہ شرارتیں بڑھ کر شیطانیاں بن جاتی تھیں۔ مثلاً میں جب رات کو دیر سے گھر پہنچتا تو اباجی کی جھڑکیوں کا سامنا کرنا پڑتا، ان کا تکیہ کلام تھا ''آ گیا بے دین۔ دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا'' اور یہ ریمارکس وہ دروازہ کھولنے کے ساتھ ہی دینا شروع کر دیتے جس سے شام کی ساری سیر اور تفریح کا مزہ غارت ہو جاتا۔ اس سے بچنے کی میں نے ترکیب یہ نکالی کہ گھر کی بیرونی دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہو جایا کروں تاکہ نہ دروازہ کھٹکھٹاؤں، نہ اباجی کا سامنا ہو اور نہ ان کی جھڑکیاں سننا پڑیں، ہمارے گھر کی بیرونی دیوار ذرا اونچی تھی، اسے پھلانگنے کا میرا طریقہ یہ تھا کہ مالک چاروں ہاتھوں پیروں کے بل جھکتا اور میں اس کی کمر پہ پاؤں رکھ کر دیوار پر چڑھ جاتا اور پھر دوسری طرف چھلانگ لگا دیتا جس کے بعد اباجی کو خبر ہوئے بغیر سیدھا اندر چلا جاتا اور جا کر سو جاتا۔ ایک روز اسی طرح میں اس کی کمر پر پاؤں رکھ کر دیوار پر چڑھا ہی تھا کہ مالک نے زور سے آواز لگا دی۔

''جیرے! پہلے زیور لوٹنا پھر کپڑا اور ڈرنا نہیں۔ کوئی جاگ جائے تو بے دھڑک گولی چلا دینا۔''

اندر میری بہنیں جاگ رہی تھیں، وہ اندھیرے میں مجھے پہچان نہ سکی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے جب ایک آدمی کو دیوار پر چڑھتے دیکھا اور اس کے ساتھ اس کے ساتھی کی یہ ہدایات سنیں تو ظاہر ہے وہ اسے چور یا ڈاکو سمجھیں۔ چنانچہ مارنے لگیں، جس کے بعد اباجی بھی جاگ گئے اور جب میں نے ان لوگوں کو بتایا کہ یہ میں ہوں تو ان کی جان میں جان آئی مگر خود میری شامت آ گئی۔

مالک، خطرناک سے خطرناک کام کرنے پر بھی تیار ہو جاتا اور بعض اوقات تو جس حد تک کرنے کی پابندی ہوتی یا جس حد تک کرنے کو چیلنج کیا جاتا اس سے بھی بڑھ کر کام کر دکھاتا۔ مثلاً میرے دوست اکی کی کوٹھی بہت بڑی تھی جو گولائی میں تھی اور اس کے دو گیٹ تھے، کوٹھی کے اندر ہی سوئمنگ پول تھا۔ گرمیوں کی ایک دوپہر ہم سب اس میں نہا رہے تھے۔ اسی دوران مالک کی مسعود سے شرط لگ گئی کہ مالک اگر بالکل برہنہ ہو کر کوٹھی کے مین گیٹ سے نکل کر دوسرے گیٹ سے باہر نکل گیا جبکہ ہم سب دوست گیٹ پر کھڑے اسے دیکھنے لگے۔ اب شرط تو صرف اس قدر تھی کہ وہ دوسرے گیٹ سے اندر آجائے مگر مالک جب باہر نکلا تو دیکھا کہ سامنے سے ایک

سیدھا سادھا آدمی جو غالباً دیہاتی تھا، سر جھکائے چلا آ رہا تھا۔ دیہاتی نے مالک کو یا ہم میں سے کسی کو نہیں دیکھا تھا۔ مالک کی شیطانی حس پھڑکی، دوسرے گیٹ کی طرف آنے کے، وہ دیہاتی کی طرف بڑھا اور اس سے کہا "بھائی آپ کے پاس ماچس ہوگی؟" دیہاتی نے دوپہر کے وقت جب ہر طرف ہو کا عالم تھا اپنے سامنے جب ایک بالکل دھڑنگ آدمی دیکھا تو غالباً اسے کوئی جن بھوت یا پاگل سمجھا، چنانچہ چیخ مار کر ایک طرف بھاگ نکلا جبکہ مالک اطمینان سے چلتا ہوا کوٹھی کے دوسرے گیٹ سے اندر داخل ہوا اور مسعود سے شرط کے ۵۰ روپے وصول کر لئے۔

شرارتیں اور شیطانیاں اپنی جگہ مگر حقیقت یہ ہے کہ سب لوگ علم دوست اور پڑھنے والے تھے۔ خاص طور پر خالدی کو تو پڑھنے کا جنون تھا۔ اس کے والد انکم ٹیکس کمشنر تھے جو ریٹائر ہو چکے تھے۔ یہ اپنی بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا اور بہنیں سب شادی شدہ تھیں۔ چنانچہ اپنی جہاز جیسی کوٹھی میں اپنے والد کے ساتھ رہتا۔ اس کے علاوہ اس کی ایک خالہ بھی ان لوگوں کے ساتھ رہتی تھی۔ یہ خالہ ہندکو زبان بولتی تھی اور مزے کی بات یہ ہے کہ جہاں یہ لوگ ماڈرن بلکہ الٹرا ماڈرن تھے وہاں وہ اتنی متشدد، روایت پسند کہ برقعہ اور پھر وہ بھی شٹل کاک والا برقعہ پہنتی۔ بہر حال یہ اٹھارہویں اور بیسویں صدی دونوں ایک ہی کوٹھی میں اکٹھی رہ رہی تھیں۔ خالدی رات کو معلوم نہیں کتنے بجے سوتا کہ صبح ہم دس گیارہ بجے بھی جاتے تو اسے سویا ہوا پاتے۔ ہماری آمد پر وہ بیدار ہوتا اور پھر کمبل کے اندر ہی باریک سی آواز میں اپنے ملازم کو پکارتا "خان! چائے پراٹھے لاؤ۔"

ہمارا یہ دوست بہت وسیع المطالعہ تھا۔ کتابوں کو جیسے چٹ کر جاتا اور پھر یہ نہیں کہ کسی ایک خاص موضوع کی کتابیں پڑھتا۔ نہیں بلکہ ہر موضوع پر ہر کتاب پڑھتا۔ رات کو پڑھنے کے دوران اگر بجلی چلی جاتی تو موم بتی جلا کر اس کی روشنی میں پڑھتا رہتا۔ چنانچہ وہ پڑھنے کے لئے مجھ سے جو کتابیں ادھار لے جاتا جب واپس دیتا تو ان کے کئی صفحوں پر موم جمی ہوتی۔ اس کے علاوہ اس پر کئی اور کیفیتیں یا جنون بھی طاری ہوتے۔ مثلاً ایک زمانے میں اس نے گلاس پر روغن بنانے کا شغل اپنایا اور دن رات اسی میں لگا رہتا۔ پھر اس پہ مصوری کا جنون سوار ہوتا تو کمرہ بند کر کے دن رات تصویریں بنانے میں لگا رہتا۔ ایک روز میں اس کے ہاں گیا تو چونکہ ان دنوں بھی اس پر مصوری کا بھوت سوار تھا اس لئے دروازہ اندر سے بند تھا۔ میری دستک کے جواب میں اس نے دروازہ کھولا تو میں نے دیکھا کہ اندر اندھیرا ہے اور ماحول عجیب سا ہو رہا ہے۔ خود خالدی کا لہجہ اور

وہ بھی عجیب تھا۔ آنکھیں پھٹی پھٹی سی۔ ہاتھ میں برش۔ عجیب اور سرد لہجے میں مجھ سے کہا "اندر آ جاؤ" میں اندر داخل ہو گیا۔ دیکھا کہ ہر چیز سیاہ ہے۔ کھڑکیوں اور روشن دانوں کے شیشے کالے کئے گئے تھے۔ کالے ہی رنگ کے پردے تھے حتیٰ کہ دیواروں پر بھی سیاہ رنگ کیا گیا تھا۔ میں نے پوچھا "خالدی! یہ سب کیا ہے؟" اس نے اسی سرد لہجے میں جواب دیا "میں موت کی تصویر بنا رہا ہوں۔"

ایک تو کینوس کا رخ دوسری طرف تھا اور جہاں میں کھڑا تھا وہاں سے دیکھ نہیں سکتا تھا کہ وہ اس پر کیا بنا رہا ہے اور دیکھ بھی سکتا تو اس وقت اس کی خواہش کسے تھی؟ اس لئے کہ کمرے کا ماحول اور اس پر مستزاد اس کی سرد اور اجنبی لہجہ پھٹی ہوئی آنکھیں، سپاٹ چہرہ، یہ سب دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور خوف کی ایک سرد لہر میرے پورے بدن میں دوڑ گئی۔ میں نے دل ہی دل میں کہا "عطا! تمہیں تمہاری موت کھینچ کر یہاں لے آئی ہے۔ بس آج بچ کر واپس جانا ممکن نہیں۔" میں اسی طرح کھڑا تھا جب خالدی نے اسی سرد لہجے میں کہا "کھڑے کیوں ہو؟ بیٹھ جاؤ" میں بیٹھ گیا۔ خالدی اٹھ کر صوفے تک گیا اور اس کے نیچے کہیں سے ایک کراری والا چاقو نکال لیا۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ کیا کرنا چاہ رہا ہے کہ یکایک کمرے میں کڑ کڑ کی آواز گونجی۔ میں نے خالدی کے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ اس نے چاقو کھول لیا تھا اور اب انگلی سے اس کی دھار چیک کر رہا تھا۔ میرے حواس گم ہو گئے۔ خالدی اگر مجھ پر حملہ کرتا تو اول تو میرے لئے آواز نکالنا ہی ممکن نہیں تھا اور چیختا بھی تو دور دور تک کوئی سننے والا نہیں تھا۔ ملازم خالہ سب دور کمروں میں تھے۔ جبکہ خالدی کی جو حالت تھی اس میں وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ خیر میں نے ہمت کر کے پوچھا "خالدی! یہ کیا کر رہے ہو؟" اس نے سرسری سے لہجے میں کہا "کچھ نہیں۔ دھار چیک کر رہا ہوں" میں نے پوچھا "مگر کیوں؟" اس پر اس نے جواب دیا۔ "بس ایسے ہی" ماحول اتنا سنجیدہ اور سنگین ہو گیا تھا کہ مجھے یقین ہو گیا کہ اس پر ضرور کوئی جنون سوار ہو گیا ہے چنانچہ میں نے کہا "خالدی! میں ایک منٹ میں آیا۔" یہ کہا اور دروازہ کھول کر کمرے سے نکل گیا اور باہر آ کر میں نے دوڑ لگا دی۔ میرا خیال ہے کہ وہ مجھے کسی بہانے ٹالنا چاہ رہا تھا تاکہ اس کے کام میں خلل نہ پڑے۔ اور اسی لئے اس نے یہ ڈرامہ کیا تھا لیکن اس وقت میرے پاس یہ جاننے کا کوئی طریقہ نہیں تھا کہ وہ ڈرامہ کر رہا ہے یا واقعی سیریس ہے۔

اس طرح ہم دوستوں میں بحثیں بھی خوب ہوتیں۔ ویسے تو ہر موضوع پر بات ہوتی تھی

مگر زیادہ مذہب کے حوالے سے گفتگو کرتے۔ میں نے بتایا ناں کہ وہ وسیع المطالعہ اور پھر سوچنے والا آدمی تھا لیکن وہ بے مذہب ہو چکا تھا۔ وہ چونکہ باعلم بھی تھا تو اس کے پاس دلائل بھی بہت تھے۔ جبکہ میں ٹھہرا اپکا مذہبی۔ اس وقت تک میں نے زیادہ تر کتابیں صرف مذہب ہی کے بارے میں پڑھ رکھی تھیں چنانچہ جب وہ مذہب کے حوالے سے کوئی بات کرتا تو اگرچہ وہ مجھے بری لگتی مگر میں اس کا جواب نہ دے پاتا۔ تنگ آ کر میں نے اباجی سے بات کی انہیں تمام صورت حال کے بارے میں بتایا اور اپنا مسئلہ بھی بیان کیا کہ میں اس کے اعتراضات کا جواب دینے سے قاصر ہوں۔ اباجی کے دوستوں میں علامہ خالد محمود تھے جو منطق اور علم کلام کے بہت ماہر تھے۔ اباجی نے ان سے بات کی۔ طے یہ ہوا کہ ایک میٹنگ رکھی جائے جس میں سارے دوست اپنے اعتراض بیان کریں جبکہ علامہ صاحب ان کے جواب دیں۔ چنانچہ میٹنگ ہوئی۔ علامہ صاحب نے ان سے کہا کہ آپ کچھ دیر کے لئے یہ بھول جائیں کہ میں کیا ہوں اور آپ لوگ کیا۔ آپ مجھے بالکل اپنے جیسا سمجھیں۔ اتنا ہی آزاد خیال اور بے دین جتنے آپ خود ہیں۔ میرا حلیہ بھی بھول جائیں۔ جن سوالوں یا ریمارکس کو آپ بہت گستاخانہ سمجھتے ہیں وہ بھی بے تکلفی سے بیان کریں۔ اس کے بعد خالدی اور دوسرے دوستوں نے اپنے سوال اور اعتراضات بیان کئے۔ علامہ نے سب باتیں تحمل سے سنیں اور پھر کہا کہ میں آپ کی ان تمام باتوں کا جواب دوں گا مگر اس سے پہلے آپ میرے ان سات سوالوں کا جواب دے دیں۔ علامہ نے جو سات سوال کئے ان میں ان تمام اعتراضات کا جواب موجود تھا۔ یہ یونانی منطق اور علم کلام کا وار تھا جو علامہ نے کیا تھا اور لڑکے یہ وار سہہ نہ سکے۔ چنانچہ انہوں نے خود کو چاروں طرف سے گھرا ہوا پایا اور کچھ سمجھ نہ پائے کہ یہ کیا ہو گیا ہے۔ اس کے بعد علامہ نے پوچھا کہ کوئی بات یا اعتراض رہ گیا ہو تو بتائیں۔ لڑکوں نے کہا کہ نہیں اور یہ کہ وہ بالکل کلیئر (Clear) ہو گئے۔ جس کے بعد علامہ نے اجازت چاہی اور چلے گئے۔

امریکا کی سیر کے دوران میں نے محسوس کیا کہ سارا امریکا ایک سا ہے۔ یوں لگتا ہے ایک ہی فلم کا سیٹ ہے جو مختلف جگہوں پر لگا ہے۔ ہر شہر میں ایک سی سڑکیں، ہوٹلز کی ایک ہی چین، ایک ہی کمپنی کے ڈیپارٹمنٹل سٹورز، شکاگو اور نیویارک اس لحاظ سے مختلف ہیں یہاں اونچی اونچی عمارتیں ہیں جو دوسرے شہروں میں نہیں ہیں۔ نیویارک کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ دوسرے شہروں سے بہت بڑا ہے۔ اتنا بڑا کہ بقول شخصے اسے دو بار نیویارک نیویارک لکھنا پڑتا ہے۔ جہاں

تک سینٹ لوئیس کا تعلق ہے تو اس کے وسط میں ایک محراب بنی ہے جو اس کی الگ پہچان بناتی ہے۔ سینٹ لوئیس سٹیٹ میزوری میں واقع ہے۔ اور اس کا ایک صنعتی شہر ہے۔ یہاں کی ایک خصوصیت یہ ہے لوگ بڑے ملنسار ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ شہر بڑے شہروں سے دور ہے۔ اور ایک عجیب بات یہ ہے یہاں غیر ملکیوں کی بڑی عزت کی جاتی ہے۔ کم از کم جس زمانے میں، میں وہاں تھا یہی صورت حال تھی اب ۹/۱۱ کے بعد کیا حالات ہیں، معلوم نہیں۔

ہماری اور وہاں کی تہذیبی اقدار میں فرق جاننے کے لئے میں یہاں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ ایک روز میری ایک پڑوسن میرے پاس آئی اور کچھ کہنے کے بجائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں گھبرا گیا۔ پوچھا ڈیانا! کیا بات ہے؟ کیوں رو رہی ہو؟ بولی: مسٹر کاسمی! میں بے حد دکھی عورت ہوں اور میرا دکھ سننے والا بھی کوئی نہیں۔ تمہارے پاس اس لئے چلی آئی کہ تم مشرقی لوگ حساس دل رکھتے ہو اور دوسروں کے دکھوں میں شریک ہوتے ہو۔ میں نے پوچھا۔ کچھ بتاؤ تو سہی تم پر کیا مصیبت ٹوٹ پڑی ہے؟ بولی: مسٹر کاسمی، میری بدنصیبی کی داستان بڑی المناک ہے، میری بیٹی بیس برس کی ہو گئی ہے اور ابھی تک اس کا کوئی بوائے فرینڈ نہیں ہے اور نہ ہی شام کو وہ کلب جاتی ہے، نہ ڈانس کرتی ہے بس چپ چاپ گھر پر پڑی رہتی ہے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میرا دل جلتا ہے۔

میں نے اسے تسلی دے کر رخصت کیا کہ یہ معمولی نفسیاتی مسئلہ ہے۔ اب ہمارے ہاں یہ بات عجیب خیال کی جائے گی کہ ماں اس بات پہ پریشان ہو جائے کہ اس کی بیٹی کا کوئی بوائے فرینڈ نہیں اور وہ رات کو کلب نہیں جاتی لیکن سچی بات یہی ہے کہ اس سوسائٹی کے حوالے سے اس ماں کی یہ پریشانی سو فی صد درست تھی۔ اس لئے کہ وہاں اس بات کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا کہ لڑکی لڑکا جوان ہو اور اس کا کوئی بوائے یا گرل فرینڈ نہ ہو۔ اگر ایسا کوئی واقعہ ہو جائے تو اس واقعے کو غیر معمولی یعنی ابنارمل سمجھا جائے گا۔ بالکل ہمارے ہاں اس لڑکی کی طرح جس کے لئے کوئی رشتہ نہ آ رہا ہو تو یہ پریشانی کی بات سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح اگر ہمارے ہاں کوئی لڑکی کھلے بندوں کسی لڑکے سے تعلق بنائے اور اس کا چرچا ہو تو یہ بات غیر معمولی خیال کی جاتی ہے اسی طرح وہاں اگر کسی لڑکے یا لڑکی کا کسی سے تعلق نہ بنے تو اسے ابنارمل سمجھا جاتا ہے۔

اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ امریکا جا کر میں نے کیا پایا تو جہاں تک روپے پیسے کا تعلق ہے تو کمایا میں نے خاصا تھا لیکن مجھے جمع کرنے کی عادت نہیں۔ وہاں میں نے اچھا کھایا اور اچھا

پہنا۔ گھر میں نے اتنے ہی پیسے بھیجے جتنے قرض لئے تھے اور جب پاکستان واپس آیا تو میرے پاس نقد صرف پانچ سو روپے تھے۔ یہ رقم میں نے اباجی کو دے دی لیکن کچھ دنوں بعد جب ضرورت پڑی تو واپس لے لی۔ امریکا میں کمائی ہوئی رقم کا بیشتر حصہ میں نے اس طرح خرچ کیا۔ جب مناسب پیسے جمع ہو جاتے تو کسی شہر کی سیر کو نکل جاتا۔ واپسی پر بعد میں، میں نے وہ رقم جو بچ گئی تھی یورپ کی سیاحت پر خرچ کر دی اور جہاں تک شعور اور آگہی کا تعلق ہے تو مجھے اعتراف ہے کہ امریکا جانے سے پیشتر اپنے تمام تر مطالعے اور مشاہدے کے باوجود میں خاصا کنزرو تھا۔ امریکا میں قیام کے بعد جب میں واپس آیا تو بظاہر مجھ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی، نہ حلیے میں، نہ بول چال میں، نہ رویے میں لیکن میرے اندر ایک انقلاب آچکا تھا۔ وہاں جا کر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دنیا سائنس اور ٹیکنالوجی میں کتنی ترقی کر چکی ہے بلکہ کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے اور ہم کہاں کھڑے رہ گئے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے دیگر فوائد کے علاوہ امریکی اور یورپی لوگوں کی سوچ سائنٹفک ہے اور وہ اسی حوالے سے چیزوں کو دیکھتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں خیال اور خواب کی دنیا میں رہنے کے بجائے وہ حقائق کی دنیا میں جی رہے ہیں۔ جبکہ ہم اپنی خیالی دنیا میں بس رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جو ہمارے ایشوز ہونے چاہئیں ان پر ہم توجہ نہیں دیتے اور جو باتیں غیر اہم ہیں وہ ہمارے ہاں سب سے زیادہ اہمیت اختیار کر گئی ہیں۔

میں نے اپنے اندر اس تبدیلی کا اظہار ایک دم نہیں کیا بلکہ بہت آہستہ آہستہ کیا۔ وہ بھی اپنی تحریروں میں۔ اس زمانے میں، میں نے ایک سفر نامہ لکھا جو "شوقِ آوارگی" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ اس میں میرے ان خیالات کا عکس نظر آتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ہاں کی خرابیوں کی اصلاح نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم اس خرابی کی نشاندہی کرنے والے کی بات ہی نہیں سنتے۔ بلکہ ایسے حالات بنا دیتے ہیں کہ اس کے لئے بات کرنا یا اپنے خیالات کا اظہار کرنا ممکن نہ رہے۔ اگرچہ ایک شعور لکھنے والے صحافی پر حکومت کی طرف سے بھی دباؤ ہوتا ہے۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں اور میرا تجربہ یہ ہے کہ حکومت کی طرف سے دباؤ عوام کے دباؤ اور جبر کے مقابلے میں کم ہوتا ہے۔ جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنا بہت جرات کی بات ہے لیکن اس دور میں یہ اتنی زیادہ مشکل بات نہیں اور کہنے والے کو اس کی اتنی زیادہ قیمت ادا نہیں کرنا پڑتی جس قدر وہ بات کہہ کر کرنا پڑتی ہے جو عوام کے مزاج کے خلاف ہو۔ بلکہ ایک لحاظ سے دیکھئے تو آج جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنے والا تو ہر صورت میں فائدے میں رہتا ہے۔ مثلاً جب کوئی یہ کام کرتا ہے تو

اس کے دو نتیجے نکل سکتے ہیں۔ حاکم کو یہ بات پسند نہیں آتی تو وہ بلا کر رشوت کی پیش کش کرے گا تاکہ وہ اپنے اس کام سے باز رہے۔ اگر وہ اسے قبول کر لیتا ہے تو بھی وقتی طور پر فائدے میں رہتا ہے جبکہ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اسے جیل میں ڈال دے۔ اس صورت میں جب جیل سے باہر آئے گا تو عوام کا ہیرو بن جائے گا۔ گویا دونوں صورتوں میں فائدہ ہے لیکن اگر آپ عوام کے نظریات کے خلاف بات کرتے ہیں تو اس کا نتیجہ تحت بھگتنا پڑتا ہے اور آپ حکومت اور معاشرہ دونوں کی طرف سے راندۂ درگاہ بن جاتے ہیں چنانچہ میرے نزدیک جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنے کی نسبت جابر عوام کے سامنے کلمۂ حق کہنا زیادہ مشکل ہے۔

امریکا جانے سے پہلے میں اپنے اخبار کے لئے ایم اے او کالج کے پرنسپل کرامت حسین جعفری صاحب کا انٹرویو کرنے گیا تھا۔ باتوں میں اباجی کا ذکر چل نکلا۔ انہوں نے کہا "تم مولانا بہاء الحق قاسمی کے بیٹے ہو تو اس لحاظ سے میرے بھتیجے ہوئے۔ یہ بتاؤ کہ اگر تمہیں یہاں کالج میں لیکچر شپ مل جائے تو کیسا ہے؟" میں نے کہا "یہ بھی اچھا ہے۔" انہوں نے کہا "تو بس یہ سمجھ لو کہ آج سے تمہاری یہاں نوکری پکی۔ صبح آکر جوائن کر لو۔" میں نے بتایا کہ میں امریکا جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ انہوں نے کہا "ٹھیک ہے امریکا جاؤ لیکن جب واپس آؤ تو اسی کالج آؤ گے۔ جب تک تم نہیں آؤ گے تمہارے لئے یہ سیٹ خالی رہے گی۔" چنانچہ یہ سیٹ دو سال تک خالی رہی یعنی جب میں واپس آیا اس وقت تک۔ اسی قسم کی آفر مجید نظامی صاحب کی طرف سے بھی موجود تھی جنہوں نے میرے امریکا جانے سے پہلے کہا تھا کہ تم جب بھی واپس آؤ گے میرے اخبار کے دروازے تمہارے لئے کھلے ہوں گے۔ گویا میرے پاس دو ملازمتیں تھیں اور میں ان میں سے صرف ایک کر سکتا تھا۔ اس مسئلے کے حل کے لئے میں نظامی صاحب سے ملا اور انہیں ساری صورت حال بتا دی۔ انہوں نے پوچھا کہ میری کیا خواہش ہے؟ میں نے بتایا کہ مجھے ٹیچنگ کی جاب زیادہ پسند ہے۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے تو پھر جوائن کر لیں مگر اس کے ساتھ شرط یہ ہے کہ میرے اخبار کے لئے کالم لکھتے رہیں گے۔ مجھے یہ صورت حال بہت پسند آئی چنانچہ میں نے ہاں کر دی۔ یوں روزگار کے حصول کا مسئلہ بحسن وخوبی حل ہو گیا۔

اس کے بعد شادی کا مرحلہ آیا تو گھر والوں نے میری پسند کے متعلق پوچھا میں نے بتایا کہ میری کوئی پسند نہیں۔ آپ لوگ جہاں مناسب سمجھتے ہیں کر دیں۔ اس کے بعد رشتوں کی تلاش شروع ہوئی۔ کچھ رشتے پہلے سے آئے ہوئے تھے۔ ان میں ایک رشتہ ہمارے جاننے والوں کا

تھا۔ لڑکی کا باپ ایک بہت بڑی فرم کا منیجنگ ڈائریکٹر تھا۔ جبکہ لڑکی خود کنیئرڈ کی پڑھی ہوئی تھی۔ کار خود ڈرائیو کرتی تھی۔ لڑکی کی ماں ہمارے ہاں آئی اور اس نے خود اس معاملے میں بات کی اور خواہش ظاہر کی کہ رشتہ ہو جائے۔ اس کے ساتھ اس نے باتوں ہی باتوں میں بتایا کہ انہوں نے اپنے بڑے داماد کو کوٹھی بنا کر دی ہے جبکہ کار اس کے پاس پہلے سے موجود تھی اس لئے کار کی قیمت کے برابر پیسے نقد دے دیئے اور ظاہر ہے کہ یہ سب بتانے سے مقصود یہ تھا کہ شادی کی صورت میں مجھے بھی یہ سب کچھ دیا جا سکتا ہے۔ مجھے جب یہ باتیں بتائی گئیں تو میں نے کہا شادی کے ذریعے لڑکی کو میں نے بیاہ کر لانا ہے لیکن جو صورت حال بیان کی جا رہی ہے اس میں یوں لگتا ہے لڑکی مجھے بیاہ کر لے جائے گی۔ اس وجہ سے میں نے انکار کر دیا۔ اسی طرح ایک اور رشتہ آیا۔ لڑکی میٹریکولیٹ تھی مگر خاندان بہت امیر تھا۔ وہ لوگ اس زمانے میں کروڑ پتی تھے۔ اسی طرح کئی اور رشتے آئے اور جب میں مسلسل انکار کرتا رہا تو گھر والوں نے پوچھا کہ میری شرائط کیا ہیں تا کہ ان کے مطابق رشتہ تلاش کیا جائے۔ میں نے کہا ''بس اس قدر کہ لڑکی قبول صورت ہو۔ تعلیم یافتہ ہو اور اچھے خاندان سے ہو۔'' اس میں بھی میں نے وضاحت کر دی کہ تعلیم یافتہ سے مراد ڈگری ہولڈر نہیں ہے۔ ڈگری بے شک نہ ہو مگر باعلم ہو۔ اسی طرح اچھے خاندان سے مراد امیر لوگ نہیں ہیں بلکہ شریف اور مہذب لوگ ہیں۔ اس کے بعد کئی رشتے دیکھے ان میں جو رشتہ مجھ سمیت سب کو پسند آیا وہاں شادی کر لی۔

شادی کے حوالے سے میرا مشاہدہ اور تجربہ یہ ہے کہ شادی ایک ایسی چیز ہوتی ہے جس کے بارے میں پہلے سے پیش گوئی نہیں کی جا سکتی کہ یہ کامیاب رہے گی یا نہیں۔ میں نے بہت سی ایسی شادیاں دیکھی ہیں جو محبت کی تھیں مگر ناکام رہیں۔ اسی طرح بہت سی ایسی جو ارینجڈ تھیں مگر کامیاب رہیں۔ یہی صورت حال اس کے الٹ بھی ہے۔ یہ ایک لاٹری ہے جو جس کی قسمت ہو اس کی نکل آتی ہے۔ چنانچہ میرا خیال ہے کہ اس بات سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ یہ ارینجڈ ہے یا لو میرج۔ اگر تو میاں بیوی دونوں سمجھداری سے کام لیں گے تو یہ کامیاب رہے گی ورنہ ناکام۔ اور اللہ کا شکر ہے میری شادی انتہائی کامیاب رہی۔ دراصل میرے اندر لچک بہت ہے اور میں ہر قسم کے حالات سے سمجھوتہ کر لیتا ہوں۔ مثلاً میں امریکا سے واپس آیا تو سیدھی بات ہے ایک صاف ستھرے شاندار معاشرے اور اچھی بھلی ملازمت چھوڑ کر آیا تھا اور یہاں آ کر ہر روز اس طرح کے واقعات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو تکلیف دہ ہوتے ہیں مگر میں اس پر کبھی حرف شکایت لب پہ

نہیں لایا۔ اسی معاشرے سے گیا تھا اسی میں واپس آ گیا۔ اس طرح میں آواری میں کھانا کھا رہا ہوں یا باسی برکتے کے تنور پر دونوں حالتوں میں خوش رہتا ہوں۔ شکایت نہیں کرتا۔ یہی رویہ میں نے ازدواجی زندگی میں بھی رکھا اور یوں ایڈجسٹمنٹ میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔

میں سمجھتا ہوں کامیاب ازدواجی زندگی گزارنے کا راز صرف ایک چیز ہے وہ ہے Tolerance یعنی برداشت کی قوت عادت۔ اس کے علاوہ اور کوئی چیز اسے نہیں بچا سکتی۔ نہ محبت نہ دولت نہ کچھ اور۔ یہ برداشت دونوں اطراف سے ہونا ضروری ہے ورنہ کام نہیں چل سکتا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ موقع محل کی مناسبت سے کبھی ایک فریق برداشت کر جائے تو کبھی دوسرا۔

اپنے تخلیقی سفر کے متعلق میں بتاتا چلوں کہ ابھی میٹرک میں پڑھتا تھا کہ لکھنا شروع کر دیا۔ ایف اے کے دوران ہفت روزہ ''شہاب'' میں میرا کالم چھپنے لگا۔ ایم اے تک پہنچتے پہنچتے کوئی اخبار باقاعدہ طور پر تو جوائن نہیں کیا گیا مگر میں بتا چکا ہوں کہ ''نوائے وقت'' میں طالب علموں کے ایڈیشن کے لئے لکھتا تھا۔ بعد ازاں باقاعدہ طور پر بھی جوائن کر لیا اور اس کے ساتھ لکھنے کا سلسلہ بھی باقاعدہ ہو گیا ہے۔

اس فیلڈ میں آنے کی وجہ ایک تو گھر کا ماحول علمی تھا اور دیکھنے کو ہر طرف کتابیں اور سننے کو پڑھنے لکھنے کی باتیں ملتی تھیں۔ اس چیز کا بھی بہت اثر ہوا تاہم میرا خیال ہے کہ آدمی کی شخصیت کی تعمیر اور اس کا رجحان متعین کرنے میں جینز کا بہت دخل ہوتا ہے۔ ان کی وجہ سے چاہے اسے سوزوں ماحول نہ مل پائے اس کے باوجود اس میں اس شعبے کے لئے رجحان موجود ہوتا ہے۔ بس اسے ذرا تحریک دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارا خاندان ایک ہزار برس سے علمی خاندان ہے اور اس میں کسی نسل کے درمیان کوئی گیپ نہیں۔ ایک باپ عالم تھا تو بیٹا بھی عالم۔ اسی طرح اس کا بیٹا بھی۔ میں عالم دین نہیں بنا یعنی علم کا وہ شعبہ اختیار نہیں کیا جو میرے آباؤ اجداد کا تھا مگر میں علم ہی کی کسی اور شاخ سے منسلک ہوں۔ میری تین پھوپھیاں ہیں ان میں سے دو شعر کہتی تھیں۔ اسی طرح میرے ایک ہمشیرہ جب حج پر گئیں تو انہوں نے وہاں نعت کہی۔ یہ زندگی میں ان کی پہلی نعت تھی مگر موزوں اور بحر میں تھی۔ میری سب سے بڑی باجی بھی شاعرہ ہیں مگر وہ اپنا کلام چھپواتی نہیں ہیں۔ اسی طرح میرے بھائی ضیاء الحق قاسمی بزنس مین ہیں اور ان کی لائن ہی الگ ہے۔ ان کے لکھنے پڑھنے کا کبھی تذکرہ سننے میں نہیں آیا تھا لیکن انہوں نے یک دم شاعری شروع کر دی اور آج متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ اب عالم یہ ہے کہ کراچی کا کوئی قابل ذکر مشاعرہ

ان کے بغیر نہیں ہو پاتا اور آج جناح کے قارئین ان کو اب ایک کالم نگار کی حیثیت سے بھی جانتے ہیں۔

خیر میں اپنے متعلق یہ بتا رہا تھا کہ یہ لکھنے لکھانے کا سلسلہ دوران تعلیم ہی شروع ہو گیا تھا اس کی وجہ ہمارا خاندانی علمی پس منظر تھا۔ جب ایم اے او کالج میں تھا تو شعر کہتا تھا اور کالج کے یا بین الکلیاتی مشاعروں میں شرکت کرتا تھا۔ جب یونیورسٹی آیا تو یہاں میرے دوستوں میں امجد اسلام امجد، گلزار وفا چوہدری اور سرفراز سید وغیرہ تھے۔ ان دنوں ہم بیشتر غزل یا نظم کہنے کی بجائے ہجو گوئی کرتے تھے اور کبھی کسی کی ہجو کہتے تو کبھی کسی کی۔ اورینٹل کالج میں ہم پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھتے اور ہجو گوئی شروع ہو جاتی ان دنوں کی کئی کئی ہجویں مجھے آج بھی یاد ہیں۔ مثلاً میں نے یونیورسٹی کی ایک لڑکی پر ہجو کہی۔ جو میں آپ کو سناتا ہوں تاہم اس میں سے اس لڑکی کا نام حذف کر رہا ہوں۔ اس کے بجائے اے بی سی لگا دیا ہے۔ وہ ہجو یوں تھی۔

ہر اک کو ہے لفٹ کرائے اے بی سی
لیکن میرے پاس نہ آئے اے بی سی
کالج میں یوں چلتی ہے وہ اکڑ اکڑ کے
جیسے ہو اک اڑیل گائے اے بی سی
کون ہے اپنی بھونڈی شکل پہ اتنا نازاں؟
سب کی ہے مجہول رائے اے بی سی
اس کے پیچھے پھرے ہے احقر مونچھوں والا
رو رو کر یہ کہتا جائے اے بی سی

آخری شعر میں احقر دراصل احقر نظامی ہے جو ہمارا کلاس فیلو اور دوست تھا۔ یہ ہجو گوئی بس یونیورسٹی تک ہی رہی۔ البتہ مزاحیہ نظم کبھی کبھی ہو جاتی تھی مثلاً ایک زمانے میں ''نوائے وقت کے مالی حالات بہت خراب تھے۔ تنخواہیں، کالموں کا معاوضہ یک مشت ملنے کے بجائے قسطوں میں ملتا تھا اور جتنے پیسے ملتے ان سے بمشکل سگریٹ کا ایک پیکٹ آتا۔ اس زمانے میں میں نے ایک نظم کہی۔ جس کے آغاز میں اپنی مالی مشکلات کا رونا رویا۔ بتایا کہ کس طرح بل ادا نہیں ہو رہے۔ قرض خواہ تنگ کرتے ہیں۔ دفتر جا کر کیشیئر سے کہتے ہیں کہ وہ بتائے ہمارا کیا حساب ہے اور سارے پیسے نہیں تو کم از کم آدھے ادا کرے۔ اس پر کیشیئر حساب لگاتا اور پھر کہتا ہے۔

بنتے ہیں چار سو... ترے، فی الحال چار رکھ
''پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ''

دراصل میں تخلیقی حوالے سے جو بھی لکھتا ہوں اس میں مزاح کا عنصر ضرور ہوتا ہے اور مجھے یہ چیز کسی حد تک ورثے میں ملی ہے۔ ابا جی امرتسر سے پندرہ روزہ ''ضیاء الاسلام'' نکالتے تھے۔ جس میں ان کا فکاہیہ کالم ہوتا تھا۔ یہ طنز کا بہت خوبصورت نمونہ ہوتا تھا۔ اس وقت تو میں ابھی چھوٹا تھا۔ اس لئے پڑھ نہیں سکتا تھا۔ تاہم گھر میں اس کی فائل موجود ہے جو بڑے ہونے پر میں نے پڑھی۔ ان کالموں کے کئی ایسے فقرے مجھے اب تک یاد ہیں جو اپنے انداز' خوبصورت طنز اور ہلکا پھلکا مزاح لئے ہوئے تھے۔ مثلاً عرب پر جب نجد والوں کا قبضہ ہوا اور انہوں نے یہ کہہ کر مزاروں کو ڈھانا شروع کر دیا کہ یہ شرک ہے تو اس پر ابا جی نے جو فکاہیہ کالم لکھا اس میں انہوں نے لکھا ''یہ توحید نہیں، توحید کا ہیضہ ہے۔'' اسی طرح ایک اور موقع پر انہوں نے یہ فقرہ بھی کہا تھا کہ پہلے زمانے کے نوجوانوں کو دیکھ کر دہشت طاری ہوتی تھی جبکہ آج کل کے نوجوان کو دیکھ کر ''شہوت'' طاری ہوتی ہے۔ چنانچہ کچھ تو وراثت کا اثر تھا' کچھ حسن مزاح میری طبیعت میں شامل تھی۔ مجھے تو یاد نہیں مگر میرے بہن بھائی اور دوست بتاتے ہیں کہ میں بچپن میں بہت ''رونقی'' ہوتا تھا اور اپنی باتوں سے سب کو ہنساتا تھا۔

میری پہلی تصنیف ''روزن دیوار سے'' تھی جو ۱۹۷۸ء میں شائع ہوئی اور اسی برس کا آدم جی ایوارڈ بھی اسے ملا۔ البتہ ذاتی طور پر مجھے اپنا سفرنامہ ''شوق آوارگی'' بہت عزیز ہے۔ یہ کتاب ابھی شائع نہیں ہوئی تھی تو جب سفرناموں کا ذکر ہوتا تو اس میں ''شوق آوارگی'' کا ذکر ضرور کیا جاتا۔ یوں غالباً یہ واحد کتاب ہے جس کی شہرت اور تذکرہ اس کی اشاعت سے بھی پہلے شروع ہو گیا تھا۔ میری اب تک متعدد تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ مثلاً عطائیے، خندمکرر، جرم ظریفی، سرگوشیاں، ملاقاتیں ادھوری ہیں، گوروں کے دیس میں، حسب معمول، کالم والم اور تجاہل کالمانہ۔

ڈرامہ نگاری کی طرف میرے رجحان کا سبب میرے دوست بنے۔ انہوں نے مجھ سے کئی مرتبہ پوچھا کہ میں ڈرامہ کیوں نہیں لکھتا اور اصرار کیا کہ لکھوں۔ اس کے علاوہ ٹی وی کے کئی لوگوں مثلاً ضیاء جالندھری، آغا ناصر، کنور آفتاب احمد، ظہور بھائی وغیرہ نے بھی بار بار اصرار کیا۔ میرا ہمیشہ ایک ہی جواب ہوتا تھا یہ کہ مجھے ڈرامہ لکھنا نہیں آتا جبکہ ان کا اصرار ہوتا تھا کہ مجھے ڈرامہ

لکھنا آتا ہے اور بہت اچھا آتا ہے۔ ثبوت کے طور پر وہ میرے ہی کالموں کا حوالہ دے کر کہتے کہ ان میں سے ہر کالم میں مکمل ڈرامہ موجود ہے۔ خیر میں کسی نہ کسی طرح ٹالتا رہا۔ اسی دوران ایوب خاور کو اس شرط پر سیریل الاٹ ہوا کہ رائٹر عطاء الحق قاسمی۔ ایوب نے مجھ سے بات کی تو میں نے وہی جواب دیا کہ مجھے ڈرامہ لکھنا نہیں آتا۔ اس پر ایوب نے کہا ''تم لکھنا تو شروع کرو۔ نہ لکھ پائے تو نہ سہی۔'' خیر میں نے لکھنا شروع کیا یہ ''اپنے پرائے'' تھا جو میری ہی نہیں ایوب خاور کی بھی پہلی سیریل تھی۔ شروع میں ذرا مشکل پیش آئی۔ مگر آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہوتا گیا اور مجھے خود اس کام میں مزہ آنے لگا۔ جب میں نے چار قسطیں لکھ لیں اور یہ ریکارڈ بھی ہو گئیں تو انہیں دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا یہ دوسروں کی کیا خود میری توقع سے بھی زیادہ شاندار تھیں۔ سب کو یقین تھا کہ یہ ڈرامہ سپر ہٹ ہو گا اور شائد ایسا ہی ہوتا لیکن انہی دنوں ایک بڑا مس ہیپ ہو گیا۔ جن دنوں میرا ڈرامہ ریکارڈ ہو رہا تھا انہی دنوں کراچی میں انور مقصود کے ڈرامے کی ریکارڈنگ بھی ہو رہی تھی۔ جب دونوں کی چار چار قسطیں ریکارڈ ہو گئیں تو پی ٹی وی کے ایم ڈی ضیاء جالندھری نے کراچی جا کر انور کے ڈرامے کی چاروں قسطیں دیکھیں۔ اس ڈرامے میں ایک ہیجڑے کا کردار تھا جو سلیم ناصر کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ضیاء جالندھری ناراض ہوئے اور جھاڑ بھی پلا دی کہ یہ ہیجڑے کا کریکٹر کیوں رکھا گیا ہے لیکن کراچی ٹی وی والے دلیر لوگ ہیں انہوں نے کہا کہ چونکہ اس سیریل کی چار قسطیں ریکارڈ ہو چکی ہیں اس لئے اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ کاٹ چھانٹ کی تو ڈرامہ تباہ ہو جائے گا۔ ہاں یہ کر سکتے ہیں کہ اگلی قسطوں میں آہستہ آہستہ اس میں ایک کریکٹر کو بدل دیں۔ خیر ان کا معاملہ یوں نپٹ گیا۔ اس کے بعد ضیاء جالندھری لاہور آئے یہاں میرے ڈرامے کی قسطیں انہیں دکھائی گئیں۔ اس میں ایک کریکٹر تھا جو بات کرتے ہوئے اپنے بچا کا ہاتھ کھینچتا تھا۔ ضیاء صاحب نے ٹی وی کی پالیسی یا اپنی پسند کے مطابق کہا کہ یہ غلط بات ہے لہٰذا اسے بدل دیا جائے' بجائے اس کے کہ لاہور ٹی وی کراچی ٹی وی والوں کی طرح دلیری دکھاتا، ایم ڈی سے بحث کرتا اور اسے قائل کرتا، اس کے بجائے جی ایم نے پروڈیوسر کو بلا کر کہا کہ اس میں سے یہ سب سین کاٹ دو۔ اس پر پروڈیوسر، ایکٹر اور میں، سب لوگ بہت دل برداشتہ ہوئے۔ تاہم ایوب خاور کو اس کی بات ماننا پڑی چنانچہ وہ سین کاٹ دیئے گئے جس کے نتیجے میں چار قسطیں دو بن کر رہ گئیں۔ ظاہر ہے اس کے بعد تسلسل بھی نہ رہا اور ناظرین کو دیکھنے میں اس طرح مزہ بھی نہیں آ سکتا تھا۔ غرض لاہور ٹی وی نے اس سیریل کا بیڑہ غرق کرنے اور اسے ناکام بنانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ حیرت ہے کہ یہ

اس کے باوجود فلاپ ہونے سے بچ گئی لیکن اس تلخ تجربے کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا کہ آئندہ ٹی وی کے لئے کچھ نہیں لکھوں گا۔ لیکن پھر ایوب خاور نے اصرار کیا اور اس کا یہ اصرار اس قدر بڑھا کہ مجھے پھر ایک ڈرامہ لکھنا پڑا۔ یہ ''خواجہ اینڈ سن'' تھا اور یہ عوام کو جس قدر پسند آیا وہ تو سب جانتے ہی ہیں۔ میرے لئے خوشی کی بات یہ تھی کہ ایک روز پروین شاکر کا فون آیا اس نے بتایا کہ دہلی سے آئی ہے اور ایئر پورٹ سے بول رہی ہے کیونکہ اسے سیدھے اسلام آباد جانا ہے۔ فون اس غرض سے کیا ہے کہ بھارت میں قرۃ العین حیدر سے ملاقات ہوئی تھی اور وہ پورے پندرہ منٹ ''خواجہ اینڈ سن'' کی تعریف کرتی رہی تھیں۔ یہ میرے لئے بڑا اعزاز تھا۔ اس لئے کہ میں تو خود قرۃ العین حیدر کا مداح اور ان سے مرعوب تھا۔

میرے ڈراموں کی پسندیدگی کی ایک بڑی وجہ میرا یہ تجزیہ ہے کہ ہمارے بیشتر ٹی وی ڈرامے گلیمر کے بل پہ چلانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان میں ماحول اور کردار دونوں دولت مند طبقے کے ہوتے ہیں۔ ۲۰، ۳۰ کنال کی کوٹھیاں، سیلون کاریں، منہ ٹیڑھا کر کے بولنے والے الٹرا ماڈرن لڑکے لڑکیاں۔ بے شک یہ لوگ ہمارے ہی ملک میں بستے ہیں لیکن اول تو وہ جس کلچر کی نمائندگی کر رہے ہوتے ہیں وہ ہمارا کلچر نہیں۔ دوسرا یہ لوگ ایک فی صد سے بھی کم ہیں جو ایسی پر آسائش زندگی گزار رہے ہیں۔ باقی ننانوے فی صد مڈل کلاس کے یا لوئر کلاس کے لوگ ہیں۔ یعنی غریب۔ ان کے گھر چھوٹے چھوٹے۔ خوشیاں چھوٹی چھوٹی۔ معمولی چیزوں کو ترستے ہوئے یہ لوگ پہلے ہی احساس محرومی کا شکار اور فرسٹریٹڈ ہیں۔ جب انہیں ۲۰ کنال کی کوٹھیاں، ڈرائنگ روم، وسیع لان، سیلون کاریں دکھائی جاتی ہیں تو ان کی محرومیاں فزوں تر ہوتی جاتی ہیں اور وہ ڈیپریشن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ چاہنے لگتے ہیں کہ کسی طرح پیسہ کمائیں اور اس طبقے میں شامل ہو جائیں لیکن جب ایسا نہیں ہو پاتا تو پھر یہ ذہنی مریض بن جاتے ہیں۔ پیسہ کمانے کے ناجائز ذرائع ڈھونڈتے ہیں۔ قتل کرتے، ڈاکے ڈالتے اور ناجائز دھندے کرتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ صورت حال قابل رشک نہیں۔ انہیں اس سے بچانے کے لئے ضروری ہے کہ ایسے ماحول اور ایسے کردار دکھائے جائیں جو انہی کے اردگرد کے ماحول اور لوگوں جیسے ہوں تاکہ ان پر ایک تو اس نوع کا ڈیپریشن طاری نہ ہو دوسرے یہ کہ بجائے غیر ملکی کلچر دکھانے کے انہیں اپنا کلچر دکھایا جائے۔ چنانچہ میں نے اپنے ڈراموں میں اندرون شہر کا ماحول دکھایا کیونکہ جب یہ طے ہے کہ اپنا کلچر اور پھر ننانوے فی صد آبادی کی معاشی حالت والا ماحول دکھانا ہے تو پھر یہ ماحول اندرون شہر کا بھی ہو سکتا

ہے۔ کسی گاؤں کا بھی یا کسی اور علاقے کا بھی۔ اب سوال یہ ہوا کہ اندرون شہر ہی کا کیوں؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جب انتخاب کے لئے مختلف چیزیں ہوں تو ان میں سے کوئی ایک منتخب کر لی جاتی ہے اور میں نے اندرون شہر کا انتخاب کر لیا۔ اس کے بجائے کوئی دوسرا ماحول منتخب کرتا تو اس پر بھی اسی طرح کا اعتراض ہو سکتا تھا ویسے ذاتی طور پر مجھے یہ ماحول بہت Fascinate کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ لوگ اور بے چھل ہیں۔ کھلے ڈلے ہیں۔ ان کے ظاہر باطن میں کوئی فرق نہیں۔ ان میں تصنع نہیں۔ منافق نہیں۔ زندگی مصنوعی نہیں۔ جس طرح گزارنا چاہتے ہیں اسی طرح گزارتے ہیں اور اس پر شرمندہ نہیں ہوتے۔ اپنی دھرتی اپنے کلچر سے وابستہ۔ ڈراموں کے علاوہ میں نے شاعری میں بھی یہ بات بیان کی ہے۔

ولیم، پیٹر، ڈکس، تھامسن، ہیری سے کیا لینا؟

ہمیں تو اپنے ماجھے گامے اچھے لگتے ہیں

اس کی وجہ ان کی اوریجنلٹی ہے اور اوریجنلٹی مجھے اس قدر عزیز ہے کہ مجھے تو وہ لوگ بھی پسند نہیں جن کی مادری زبان پنجابی ہو مگر وہ آپس میں بھی اس کے بجائے اردو میں بات کر رہے ہوں۔ صاف ظاہر ہے وہ تصنع سے کام لے رہے ہیں۔ یہاں میں یہ واضح کر دوں کہ میں اردو کے خلاف نہیں ہوں۔ یہ ہماری قومی زبان ہے اور مجھے بے حد عزیز ہے لیکن میری مادری زبان پنجابی ہے اور مجھے جب کوئی دوسرا پنجابی ملتا تو میں اس سے پنجابی کے بجائے اردو میں بات کیوں کروں؟ ایسا کیا جائے تو صاف ظاہر ہے تصنع ہوگا۔

میں ۱۹۷۱ء میں امریکہ سے واپس آیا تھا۔ اس کے بعد دس بارہ برس وطن ہی میں رہا۔ اسی کے عشرے میں بیرون ملک سفر کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوا اور میں دنیا کے بہت سے ممالک گیا۔ ان میں یورپ، امریکہ، خلیج کے ممالک اور چین انڈونیشیا، سنگاپور اور بھارت وغیرہ شامل ہیں۔ ۱۹۸۶ء میں ایک مزے کی بات یہ ہوئی کہ مشہور پامسٹ، ایم اے ملک نے میرا ہاتھ دیکھ کر کہا کہ تم بہت سفر کرو گے۔ میں نے کہا "ملک صاحب! یہ آپ نے کون سی انوکھی بات بتائی ہے؟ یہ تو ایسا ٹیوا ہے جو بچہ بھی لگا سکتا ہے، اس لئے کہ میں تو پہلے ہی بہت سفر کر چکا ہوں اور کر بھی رہا ہوں۔ اس پر انہوں نے کہا کہ جتنے سفر پہلے کئے ہیں وہ ان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ اس کے بعد اتنے مختلف ممالک میں سفر کرنا پڑیں گے کہ تم تنگ آ جاؤ گے۔ چنانچہ اس کے بعد واقعی میں نے بہت سفر کئے اور اب تک مسلسل سفر کی حالت میں ہوں۔ ۸۷ء میں امریکہ گیا' ۹۲ء میں پھر

وہیں، اس کے علاوہ دو دفعہ چین خلیج کے ممالک میں، اس کے علاوہ عمرہ بھی کیا۔

خلیج کے ممالک میں مجھے متحدہ عرب امارات' قطر' مسقط اور سعودی عرب جانے کا موقع ملا ان ممالک میں مشاعروں کی غرض سے جانا ہوا لیکن سعودی عرب میں مشاعروں کے ساتھ ساتھ عمرے کی سعادت بھی حاصل کی۔ جس برس عمرہ کرنے گیا، وہاں ایک عجیب واقعہ ہوا میرے ساتھ کراچی کے ایک دوست شاعر بھی تھے۔ جب ہم جدہ ایئر پورٹ پر اترے تو عربی لباس میں ملبوس ایک پاکستانی شخص ہمیں آ کر ملا اور دعا سلام کے بعد چھوٹتے ہی کہنے لگا ہمیں آپ لوگوں کی آمد کا علم ہوا تھا چنانچہ حاضر ہو گیا۔ گزارش یہ ہے کہ جدہ میں ایک مشاعرہ ہے آپ سے درخواست ہے کہ سیدھے وہیں تشریف لے چلیں، سب انتظام مکمل ہے۔ ہم نے بتایا کہ ہم مشاعرہ پڑھنے نہیں عمرہ ادا کرنے آئے ہیں اور بس ابھی احرام باندھنے ہی والے ہیں، وہ بولا "عمرہ تو بعد میں بھی ہو جائے گا آپ پہلے مشاعرے میں چلیں۔ آپ کو اس کا معقول معاوضہ ادا کیا جائے گا۔ اس پر مجھے غصہ آ گیا اور میں نے اسے خوب سنائیں، چنانچہ وہ چپ چاپ واپس چلا گیا جبکہ ہم نے احرام باندھے اور عمرے کی ادائیگی کے لئے چل پڑے۔

خانہ کعبہ پہنچ کر میری عجیب کیفیت تھی، یہ ایک بالکل انوکھا تجربہ تھا جس کی لذت سے میں پہلے بالکل ناآشنا تھا۔ سچی بات یہ ہے میرا خیال تھا کہ ہم آزاد خیال لوگ ہیں گناہوں سے ہمارے دل سیاہ ہو چکے ہیں لہٰذا کیفیت کیا طاری ہوگی؟ لیکن جب احرام باندھا اور حرم شریف کی طرف چلے تو عجیب بات یہ ہوئی کہ آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنا شروع ہو گئے اس قدر زیادہ کہ رکنے کا نام لیتے تھے۔ معلوم نہیں یہ اپنے گنہگار ہونے پہ ندامت تھی، خدا کے گھر پہنچنے کی خوشی تھی، اپنی کم مائیگی کا احساس تھا یا یہ سب کچھ تھا بہر حال آنسو تھے کہ تھمنے میں نہیں آتے تھے۔

ایک اور بات ایسی ہوئی کہ جو اگر میرے تجربے میں نہ آتی تو میں کبھی بھی اس پہ یقین نہ کرتا، کراچی میں میری ایک بھانجی رہتی ہے۔ جن دنوں میں عمرے پہ جا رہا تھا وہ بیمار تھی۔ بیماری عجیب تھی کہ ایک بازو سوج گیا تھا اور ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اب اس کا ایک ہی علاج ہے کہ بازو کاٹ دیا جائے اور اگر ایک ہفتے کے اندر اندر آپریشن نہ کرایا تو زہر جسم میں داخل ہو جائے گا اور پھر موت واقع ہو سکتی ہے۔ میں نے سن رکھا تھا کہ حرم شریف کو دیکھ کر جو پہلی دعا مانگی جائے وہ قبول ہو جاتی ہے۔ چنانچہ میں آنکھیں بند کر کے چل رہا تھا اور ساتھی سے کہا تھا کہ جب خانہ کعبہ سامنے آ جائے تو مجھے بتا دینا، اس نے ایسا ہی کیا۔ میں نے آنکھیں کھول کر کعبہ شریف دیکھا اور دو دعائیں

مانگیں، ایک اپنی بھانجی شاہدہ کے لئے اور دوسری اپنے دوست احمد حسن حامد کی نابینا بیٹی کے لئے، عمرے کی ادائیگی سے فارغ ہو کر جب میں کراچی پہنچا اور اپنی بھانجی کے گھر گیا تو دیکھا وہ بالکل صحت مند ہے۔ میں نے پوچھا کیسے ٹھیک ہوگئیں؟ اس نے بتایا کہ چند دن پہلے پھوڑے کا منہ بن گیا اور پھر اس میں سے گندا مواد نکلنے لگا، مواد اتنا بدبودار تھا کہ خود میری برداشت سے بھی باہر تھا۔ اتنا مواد نکلا کہ بالٹی بھر گئی اور اس کے بعد میں بھلی چنگی ہوگئی۔ میں نے پوچھا ''یہ کب کی بات ہے؟'' جواب میں اس نے جو دن اور وقت بتایا وہ وہی تھا جب میں نے حرم شریف کو دیکھ کر دعا مانگی تھی تاہم میں نے اپنے دوست کی بیٹی کے لئے دعا مانگی تھی وہ قبول نہ ہو پائی۔

بطور سیاح سعودی عرب کے متعلق میری یہ رائے ہے کہ یہ ایک خوبصورت ملک ہے۔ خصوصاً جدہ دیکھ کر مجھے بہت حیرت ہوئی، وہاں پاکستانیوں نے اتنی رونق لگا رکھی ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب شام کو کسی جگہ موسیقی کی محفل یا مشاعرہ نہ ہو رہا ہو۔ غرض کوئی نہ کوئی تقریب ہوتی رہتی ہے۔ یہاں میری ملاقات ایک ایسے شخص سے بھی ہوئی جو ہے تو عرب مگر اردو شاعری کرتا ہے۔ اس کا نام عمر العیلاس ہے۔ اردو کا ایک اور عرب شاعر ڈاکٹر زبیر فاروق ہے جو دبئی میں ہے، مجھے اس کا ایک شعر جو بہت اچھا لگا، یاد ہے۔

دشمن دلیر ہوتا تو آتا مزہ مجھے
فاروق ڈر رہا ہوں کہ بزدل کی زد میں ہوں

خلیجی ممالک کے حوالے سے بتاتا چلوں کہ وہاں کے حکمرانوں کا عالمی سیاست میں جو کردار ہے اس سے بادشاہت و آمریت کو نکال دیں تو یہ ملک بہت اچھے ہیں۔ بہت پر سکون زندگی ہے، رزق کی فراوانی ہے، یہاں کوئی مقامی باشندہ غریب نہیں ہے، قانون کی پابندی ہے، ٹریفک کے قوانین، صحت کے قوانین پر پوری طرح عمل ہو رہا ہے، وہ تمام سہولتیں موجود ہیں جو یورپ کے لوگوں کو حاصل ہیں۔ اس معاملے میں وہاں کی انتظامیہ نے طور طریقے بھی انہیں لوگوں کے اپنائے ہیں۔

چین دو مرتبہ گیا ہوں، پہلی مرتبہ ہمارا ٹور پندرہ روز کا تھا جبکہ دوسری مرتبہ محض ایک ہفتے کا، دونوں مرتبہ جا کر بے حد خوشی ہوئی۔ چینی کلچر بہت رچ ہے اور کئی باتوں پر سیاح کو بے حد حیرت ہوتی ہے مثلاً وہاں کے جس شہر کے بارے میں دریافت کیا معلوم ہوا کہ کم از کم پانچ ہزار سال پرانا ہے۔ ہر شہر اسی قدر یا اس سے بھی زیادہ قدیم نکلا، نتیجہ یہ کہ تنگ آ کر ہم نے شہروں کی

تاریخ کے بارے میں پوچھنا ہی چھوڑ دیا۔ ہزاروں برس پرانے بادشاہوں کے مقابر بھی دیکھے، ایک شہنشاہ کا مقبرہ دیکھنے گئے تو وہاں بادشاہ کی قبر کے ساتھ ایک صندوق دھرا تھا اور ساتھ ایک قبر اور بھی تھی، پوچھا یہ کیا ہے؟ گائیڈ نے بتایا کہ صندوق میں سونا چاندی اور جواہرات ہیں کہ مرنے کو اگلی دنیا میں ان کی ضرورت پیش آ جائے جبکہ دوسری قبر میں ایک کنیز کو دفن کیا گیا تھا مقصد اس کا بھی وہی تھا کہ اگلے جہان یا دوبارہ زندہ ہونے کی صورت میں بادشاہ کی خدمت کر سکے۔

چین کے سفر کے دوران میں ماؤ کے مقبرے پر گیا اور وہاں ہاتھ اٹھا کر تین دفعہ الحمدللہ اور قل شریف پڑھا اور ماؤ کے لئے دعا کی۔ چینی اب بھی ماؤ کو پسند تو کرتے ہیں مگر پسندیدگی کا لیول اب وہ نہیں جو ستر کے عشرے تک تھا، حالانکہ یہ بہت عجیب بات ہے۔ اس کے ساتھ دوسری بات یہ ہوئی کہ وہ جوان کی مطمئن، پرسکون اور قناعت سے پر زندگی تھی وہ اب رفتہ رفتہ ختم ہوتی چلی جا رہی ہے اور اسے ختم کرنے میں مغرب کا بہت ہاتھ ہے، اس کے ٹورسٹ وہاں جا رہے ہیں۔ مصنوعات درآمد کی جا رہی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی فلمیں، یہ سب چیزیں مل کر ان سے ان کا اطمینان چھین رہی ہیں۔ نئی نسل مطمئن نہیں، فرسٹریشن بڑھ رہی ہے چینی عوام بہت تیزی سے مغربی کلچر کے اثرات قبول کر رہے ہیں۔ مغرب کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنا اثر و نفوذ اپنے کلچر کے ذریعے کرتا ہے۔ اس کے بعد اس کے سرمایہ دارانہ نظام کی باری آتی ہے جو انسان سے قناعت چھین لیتا ہے۔ سادہ زندگی کو پیچیدہ بنا دیتا ہے۔ خواہشوں میں اضافہ کر دیتا ہے اور انسان کو مشینوں کا غلام بنا کر رکھ دیتا ہے اور چین میں بھی یہ عمل شروع ہو چکا ہے۔

چینیوں کی مساوات کے حوالے سے بتاتا چلوں کہ اب وہ ان میں پہلے کی سی مساوات نہیں رہی، ۱۹۸۰ء میں شنگھائی میں ہمیں ایک ارسٹوکریٹ چینی ادیب سے ملوایا گیا، جو تھری پیس سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کا تعارف کراتے ہوئے اس بات کا خاص طور پر ذکر کیا گیا کہ اس کے پاس موٹر سائیکل بھی ہے اور کتا بھی، چونکہ عام چینی بائیسکل یا بس پر سفر کرتے ہیں اس لئے موٹر سائیکل کا ہونا امارت کی نشانی ہے جبکہ کتے کے بارے میں بتانے سے مقصود یہ تھا کہ وہ اتنا امیر ہے کہ اس نے کتا پکا کر کھا نہیں لیا بلکہ اسے پال رکھا ہے۔

یوں تو چینیوں کی بہت سی باتیں اور چیزیں ایسی تھیں جن پر رشک آ سکتا تھا اور آیا بھی مثلاً صفائی نظم و ضبط وغیرہ۔ تاہم چین میں جس شخص پہ سب سے زیادہ رشک آیا وہ کوئی چینی نہیں ایک پاکستانی تھا جو ہمارے ساتھ وفد میں شامل تھا۔ یہ ''نیشن'' کے نصرت جاوید تھے جن کی بہت

گھنی ڈاڑھی ہے اور جب چین میں انہوں نے اس کے ساتھ شیروانی پہنی تو وہ شرعی ڈاڑھی کی حیثیت اختیار کر گئی اور وہ صحافی کے بجائے اسلامی جمعیت طلباء کے ناظم نظر آنے لگے۔ چونکہ چینی لوگوں کے چہرے پر بال بہت کم اگتے ہیں اور وہاں گھنی ڈاڑھی ایک نئی اور خاص چیز تھی لہٰذا ان کی ڈاڑھی کو سب غور سے دیکھتے اور اسے بہت پذیرائی حاصل ہوئی۔ اس پر فطری بات ہے ہمیں رشک آتا، تاہم اس وقت تو انتہا ہو گئی جب ایک چینی حسینہ نے ان کی ڈاڑھی کو باقاعدہ ٹٹول کر دیکھا اور خاصی دیر اپنی نرم و نازک انگلیوں سے اسے سہلاتی رہی۔ اس پر مجھے رشک کیا باقاعدہ حسد محسوس ہوا اور صرف مجھے ہی نہیں بلکہ وفد کے دوسرے ارکان کو بھی، حالانکہ ان میں بھی کئی مثلاً محمد صلاح الدین مرحوم اور لیاقت بلوچ شامل تھے اور ان کی ڈاڑھیاں بھی تھیں مگر جو بات نصرت کی ڈاڑھی میں تھی وہ ان کی ڈاڑھیوں میں کہاں؟ خود مجھ پر اس سانحے کا یہ اثر ہوا کہ اس کے بعد میں جتنے روز چین میں رہا سیفٹی ریزر کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔

اردو کو ایک غیر ملکی زبان کی حیثیت سے چین میں بہت مناسب مقام حاصل ہے۔ یونیورسٹی لیول تک پڑھائی جاتی ہے اور بہت سے چینی پڑھتے اور بولتے ہیں، ان میں کئی شاعر بھی ہیں مثلاً چانگ شی شیوان جو اردو میں اپنا تخلص انتخاب عالم کرتے ہیں۔ یہ اتنا خوب صورت اور حیران کن حد تک شاندار شاعر ہے کہ اس کا شمار اردو کے اچھے شعراء میں ہو سکتا ہے یعنی ان میں نہیں جو غیر ملکی ہیں مگر اچھے اردو شعر کہتے ہیں بلکہ پاکستان اور ہندوستان کے اچھے شاعروں میں۔ ان کا ایک شعر ہے۔

خزاں گزیدہ چمن میں بہار باقی
کہ تخمِ گل پہ مرا اعتبار باقی ہے

تخمِ گل کا اس قدر خوب صورت استعمال میں نے اردو شاعری میں اس سے پہلے کہیں نہیں دیکھا۔

دیوار چین کی سیر کے متعلق بتاتا چلوں کہ وہ بہت شاندار ہے۔ خصوصاً اس لئے بھی کہ اس روز موسم بہت خوشگوار تھا۔ ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے، جب ہم وہاں پہنچے تو ہمارے علاوہ ہزاروں دوسرے سیاح بھی موجود تھے۔ موسم اتنا خوب صورت، لوگ خوب صورت، ہر طرف اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے، پیرہن پہنے خوب صورت چہرے گھوم پھر رہے تھے، ایک خوب صورت پروں والی تتلی نے ہمارے آگے اڑنا شروع کر دیا، بچے تتلی کے پیچھے لپکے جبکہ بڑے

بھی اسے خوشی اور اشتیاق سے دیکھ رہے تھے۔ تب ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ایک چینی مزدور جس نے بند گلے کا کوٹ اور ماؤ کیپ پہن رکھی تھی۔ اس خبیث نے کوٹ اتارا اور اسے جھلا کر تتلی پہ دے مارا، تتلی زخمی ہو کر نیچے گر گئی۔ یہ اتنا افسوس ناک واقعہ تھا کہ تمام سیاح جمع ہو گئے اور انہوں نے تتلی کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ ایک بچے نے تتلی کو اٹھایا اور اپنی ہتھیلی پہ رکھ کر اسے سانسوں کی گرمی پہنچائی اس سے تتلی کو کچھ افاقہ ہوا اور اس کے حواس قائم ہوئے۔ چنانچہ اس نے پر ہلائے اور فضا میں اڑ گئی۔ یہ دیکھ کر چھوٹے بڑے سب بچوں کی طرح خوش ہوئے اور انہوں نے ایک بھرپور نعرہ لگایا۔ اس منظر نے دیوار چین کی سیر کو یادگار بنا دیا۔ یہ واقعہ نہ ہوتا تو یہ سیر ایک عجیب سی بات کے حوالے سے یاد رہتی۔ وہ یہ کہ ہمیں دیوار چین پر ٹائلٹ استعمال کرنے کی ضرورت پیش آئی تو دیکھا کہ ان کے دروازے ہی نہیں ہیں، یعنی بنائے ہی نہیں گئے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے جو ایک پرائیویسی اور پردے کی ضرورت ہوتی ہے وہ پوری نہیں ہوتی تھی اور آدمی کو اسی طرح کی بہادری دکھانا پڑتی ہے جو ہمارے دیہات میں یا کبھی کبھار شہروں میں تنگ آمد بجنگ آمد قسم کی صورت حال میں نظر آتی ہے۔

انڈونیشیا کی سیاحت کا حال بھی بہت دلچسپ ہے۔ وہاں کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ لوگ مذہبی ہیں۔ مگر سرکاری اور عوامی دونوں سطح پر مذہبی رواداری موجود ہے۔ جکارتہ کی سب سے بڑی مسجد استقلال کے ساتھ ایک مندر اور ایک گرجا گھر بھی بنایا گیا ہے جو رواداری اور ٹالرینس (Tolerance) کا مظہر ہے۔ مجھے جس بات نے سب سے زیادہ حیران کیا وہ یہ کہ نماز کے وقت مسجدوں میں بہت رش ہوتا ہے اور پھر مردوں کے علاوہ خواتین بھی پچھلی صفوں میں نماز ادا کرتی ہیں۔ ایک روز عشاء کی نماز ادا کرنے مسجد گیا ہوا تھا۔ پچھلی صف میں منی سکرٹوں میں ملبوس دو عورتیں بھی نماز کے لئے کھڑی تھیں، کولہوں سے نیچے ٹانگیں بالکل ننگی تھیں، جب نماز شروع ہوئی تو انہوں نے ٹانگوں پر کپڑا لپیٹ لیا تاہم سلام پھیرنے کے بعد اسے اتار دیا، اس سے ہم دو نتیجے نکال سکتے ہیں، ایک یہ کہ مغرب کی پیروی کے باوجود لوگوں کی مذہب سے وابستگی موجود ہے۔ انہوں نے اسے ترک نہیں کیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ مذہب کی انہوں نے اپنی ایک تشریح کی ہے۔ ہماری طرح وہ پردے وغیرہ کے قائل نہیں ہیں۔

میں نے دنیا کے مختلف ممالک میں مذہب کے حوالے سے اور بھی بہت سی عجیب باتیں دیکھی ہیں۔ مثلاً امریکا سے واپس آتے ہوئے ترکی کے قصبے ارض روم میں گھومتے ہوئے میں نے

ایک گراؤنڈ میں والی بال کھیلتے نوجوانوں سے مسجد کا پتا پوچھا تو وہ کھیل چھوڑ چھاڑ کر قافلے کی صورت میں میرے ساتھ مجھے مسجد دکھانے چل پڑے۔ان میں ایک تیرہ چودہ سال لڑکا بھی تھا جس نے مجھ سے پوچھا''پاکستان''یعنی پاکستان سے آئے ہو؟ میں نے کہاہاں، پھراس نے پوچھا ''مسلمان''؟ میں نے پھر ہاں میں جواب دیا اب اس نے ایک اور سوال کیا۔''حنفی''؟ میرے لئے یہ عجیب سوال تھا تاہم میں نے اس کا جواب بھی اثبات میں دیا۔اس پر اس نے خوش ہو کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور کہا''الحمدللہ۔الحمدللہ۔''اس کے بعد ہم سب نے وضو کیا مگر جب میں نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہوا تو دیکھا کہ وہ سب جو وضو تک میرے ساتھ شریک تھے اب غائب ہو چکے ہیں۔ وہ بچہ بھی جس نے میرے صرف مسلمان ہونے کو کافی خیال نہیں کیا تھا بلکہ میرے حنفی ہونے کی تصدیق بھی چاہی تھی۔

ایسا ہی ایک واقعہ ہالینڈ میں ایمسٹرڈیم میں پیش آیا بلکہ وہ اس سے بہت زیادہ عجیب۔ وہاں ہم جس ہوٹل میں ٹھہرے اس کا منیجر مصری تھا اور مسلمان بھی جب اسے معلوم ہوا کہ ہم بھی مسلمان ہیں تو بہت خوش ہوا اور ہمارے لئے ہر ممکن سہولت فراہم کرنے کی کوشش کی، سب سے دل چسپ''سہولت''وہ تھی جو اس نے اگلے روز ناشتے پر مہیا کی۔ہم نے فرائی انڈوں اور توس کا آرڈر دیا تھا۔اس نے ناشتے کے ساتھ ایک پلیٹ بھی پیش کی جس میں گوشت کے ٹکڑے سجے ہوئے تھے۔مجھے اس گوشت کی سرخ رنگت سے کچھ شبہ سا ہوا۔اس سے پوچھا''یہ بکرے کا گوشت ہے یا گائے کا؟''جواباً اس نے لہجے میں ممکن حد تک خلوص بھر کر کہا۔''یا اخی! یہ سور کا گوشت ہے جو میں نے اپنے مسلمان بھائیوں کے لئے خصوصی طور پر تیار کرایا۔''اسی طرح جب میں امریکا میں تھا تو ایک روز رات گئے میرا ایک دوست میرے فلیٹ پر آیا جہاں میں سو رہا تھا، دستک پر اٹھا تو دیکھا اس کی بغل میں ایک امریکی لڑکی ہے۔دونوں کے منہ سے شراب کے بھبکے اٹھ رہے ہیں۔میں نے پوچھا''خیریت تو ہے؟ اتنی رات گئے کیوں جگایا؟''اس پر اس دوست نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بتایا کہ وہ بھوک سے بے حال ہو رہا ہے مگر کہیں کھانا نہیں کھا سکتا۔اس لئے کہ اس بات کا اعتبار نہیں کہ وہاں ذبیحہ ملتا ہوگا۔اپنی داستان غم سنا کر اس نے مجھ سے درخواست کی کہ اگر مجھے ایسے کسی ریستوران کا علم ہو جہاں حلال گوشت ملتا ہو تو براہ کرم اس کا پتا بتاؤں۔

میں جب ۱۹۷۱ء میں امریکا سے لوٹا تو میری لمبی لمبی قلمیں اور لمبے لمبے بال تھے اور میں نے جینز پہن رکھی تھی۔ترکی میں مجھے ایک ترک نے اسی طرح پوچھا

''پاکستان؟''

میں نے کہا''ہاں''،اس نے پھر پوچھا

''مسلمان؟''

میں نے پھر اثبات میں جواب دیا،اس پر اس نے زور زور سے سر ہلا کر کہا''نہ نہ''اور ساتھ ہی میرے حلیے کی طرف اشارہ کیا کہ مسلمانوں کا حلیہ ایسا ہوتا ہے؟ مجھے دل میں بہت ہنسی آئی اور میں سوچ ہی رہا تھا کہ اسے کیا جواب دوں اور اپنے مسلمان ہونے کا کس طرح یقین دلاؤں کہ اچانک مجھے ایک ترک لڑکی نظر آئی جس نے منی سکرٹ اور چھوٹا بلاؤز پہن رکھا تھا۔میں نے اس کی طرف اشارہ کر کے پوچھا''مسلمان؟''

اس نے کہا''ہاں''

میں نے اس کے لباس کی طرف اشارہ کر کے کہا''نہ نہ''کہ یہ بھی مسلمانوں والا لباس کہاں ہے،اس پر وہ ترک بہت ہنسا۔آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا اور بولا''مسلمان کاردش کاردش''اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے مجھے ایسے کئی تجربات ہوتے رہتے ہیں۔

انڈونیشیا کے دورے سے واپسی پر ہم سنگاپور میں ٹھہرے،یہ ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ ہمارے ایک شہر کراچی جتنا بڑا،تاہم صاف ستھرا اور خوشحال ہے۔اس کی ترقی انسان کو بہت متاثر کرتی ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ ابھی چند سال پہلے تک یہ ہم سے بہت پیچھے تھا۔جبکہ اب یہ بہت آگے نکل چکا ہے۔اس ترقی کی بہت سی وجوہ ہیں۔ان میں ایک تو تعلیم ہے،دوسری قیادت مخلص ہے مگر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مذہب سیاست سے بالکل جدا اور الگ ہے۔اسے وہ سیکولر علمی فضا حاصل ہے جو علوم وفنون کی پرورش اور ترقی کے لئے ضروری ہوتی ہے خصوصاً سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے لئے یہی اس کی ترقی کا راز ہے۔

سیاحت کے اس تذکرے کے بعد میں واپس زندگی کے شب و روز کی طرف آتا ہوں۔میں نے جیسا کہ بتایا کہ امریکا سے آنے کے بعد میں نے ٹیچنگ اختیار کی اور نوائے وقت کی کالم نگاری بھی چلتی رہی۔یہ سلسلہ تب تک چلتا رہا جب تک میں ناروے میں بطور سفیر کے نہیں گیا اور جب میں پرویز مشرف صاحب کے آنے پر ناروے سے واپس آیا تو حکومت نے مجھے آٹھ ماہ تک جوائننگ نہیں دی۔میں او ایس ڈی کے طور پر رہا۔پھر FC کالج میں میری پوسٹنگ ہوئی۔وہاں میرا خیال ہے میں نے ایک سال کام کیا۔اس کے بعد میں نے Pre

Mature ریٹائرمنٹ لے لی۔ ایک واقعہ اس کا سبب بنا تھا وہ یہ کہ میں نجی دورے پر امریکا جا رہا تھا اس کے لئے بطور سرکاری ملازم مجھے N.O.C چاہیے تھا اور ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ سے چھٹیاں بھی چاہیے تھیں۔ اس وقت وزیر تعلیم اختر سعید صاحب تھے۔ وہ میرے بڑے پرانے دوست تھے۔ اب سرکاری کارروائی کے طور پر بہت تجل خرابی ہوتا تھی۔ باقاعدہ فائل بنی تھی۔ انہوں نے مہربانی یہ کی کہ کہا یہ فارملیٹی میں خود ہی کرا لوں گا انہوں نے ایک متعلقہ آفیسر کی ڈیوٹی لگادی۔ اس کا ایک دن مجھے فون آیا کہ قاسمی صاحب باقی تو سارا کام ہوگیا ہے لیکن آپ کا N.O.C ضرور چاہئے۔ میں حیران تھا کہ مجھے N.O.C کی کبھی ضرورت نہیں پڑی مگر تازہ واقعات کے نتیجے میں اس کی مجھے ضرورت پڑ رہی تھی۔ یاد رہے یہ ۹/۱۱ سے پہلے کا واقعہ ہے۔ وہ کہنے لگے کہ ایجوکیشن سیکرٹری کے ساتھ بات ہوگئی ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ سب کچھ تیار پڑا ہے۔ N.O.C آ جائے گا تو میں بیرون ملک چھٹی Sign کر دوں گا۔ مجھے معلوم ہوا کہ N.O.C پر ایک ایس پی sign نہیں کر رہا اور وہ کہہ رہا ہے کہ میرا نام ECL میں شامل ہے۔ میں نے سوچا میں ایس پی کے پاس جانے سے پہلے پتا تو کرلوں کہ ECL میں میرا نام ہے بھی کہ نہیں۔ میں نے اسلام آباد فون کیا۔ اس وقت خوش قسمتی سے میرے یونیورسٹی فیلو تسلیم نورانی صاحب وہاں لگے ہوئے تھے۔ وہ سیکرٹری داخلہ تھے۔ وہ مجھے فون پر نہ ملے کہیں گئے ہوئے تھے۔ ایڈیشنل سیکرٹری مجھے مل گیا۔ ان کو میں نے کہا کہ یہ میرا مسئلہ ہے اور میں یہ جاننا چاہتا ہوں۔ کہنے لگے کہ آپ پانچ منٹ بعد فون کرلیں۔ میں نے دوبارہ فون کیا تو کہنے لگے نہیں آپ کا نام ECL میں شامل نہیں ہے۔ میں نے کہا پھر آپ مہربانی کریں، فیکس میرے گھر میں لگی ہے، میں ہوں تو اپنے گھر سے باہر ہی لیکن آپ فیکس کردیں کہ میرا نام اس لسٹ میں شامل نہیں ہے۔ انہوں نے فیکس کردی۔ میں نے گھر فون کرکے فیکس آنے کی تصدیق کی۔ پھر میں متعلقہ ایس پی صاحب کے پاس گیا۔ چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی والے صاحب تھے۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو انہوں نے میرے داخل ہونے کا نوٹس ہی نہ لیا۔ میں چند سیکنڈ کھڑا رہا۔ انہوں نے مجھے بیٹھنے کے لئے بھی نہ کہا۔ میں خود ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ مجھے کہنے لگے کہ میں کام کر رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ میں بھی کام ہی کے حوالے سے آپ کے پاس آیا ہوں۔ کہنے لگے آپ باہر نہیں جاسکتے آپ کا نام ECL میں شامل ہے۔ میں نے کہا میرا نام ECL میں شامل نہیں ہے۔ کہنے لگے میرے پاس Lates information ہے۔ میں نے کہا میرے پاس آپ سے بھی زیادہ lates

information ہے۔ ابھی یہ بات ہو ہی رہی تھی کہ میرے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے فون دیکھا تو تسلیم نورانی صاحب ہی کا فون تھا۔ وہ کہنے لگے کہ تمہارا فون آیا تھا میں اس وقت موجود نہیں تھا۔ بتاؤ مسئلہ کیا تھا؟ میں نے بتایا کہ یہ مسئلہ اور اس وقت ''دربار'' میں میں حاضری دے رہا ہوں۔ کہنے لگے میری بات کراؤ۔ خدا جانے انہوں نے ان سے کیا بات کی۔ ساتھ ہی ایس پی صاحب نے بل دی تو چپڑاسی اندر آیا۔ اس کو انہوں نے دو چار سنائیں اور پھر کہا کہ تمہیں پتا نہیں کتنی بڑی شخصیت اس وقت میرے پاس بیٹھی ہے۔ بدبخت بغیر کہے چائے نہیں لے کر آتے ہیں۔ وہ بھاگ کر گیا اور چائے لے آیا۔ انہوں نے اسے پھر اچھی خاصی سنائیں اور کہا اے بیوقوف خالی چائے بسکٹ ساتھ ہوتے ہیں۔ وہ چار پانچ بسکٹ پلیٹ میں لے آیا۔ انہوں نے اسے پھر سنائیں اور کہا بھائی اس طرح نہیں ہوتا۔ سلیقے کے ساتھ چائے پلاتے ہیں۔ پھر انہوں نے اپنی دراز کھولی اس میں دو تین بسکٹوں کے پیکٹ تھے اور ان بسکٹوں کے ساتھ ہی میرا N.O.C تیار تھا۔ انہوں نے وہ میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ کہنے لگے میں کسی دن گھر حاضر ہوں گا۔ میں نے کہا ضرور تشریف لائیں۔ اس وقت میں نے فیصلہ کیا کہ میں نے اب گورنمنٹ سروس نہیں کرنی۔ چنانچہ کچھ عرصے بعد میں نے کالج سے ریٹائرمنٹ لے لی۔

امریکا سے واپس آنے کے بعد پھر روٹین کی زندگی تھی۔ مجید نظامی صاحب کافی عرصے سے مجھے کہہ رہے تھے کہ آپ فل ٹائم کالمسٹ کیوں نہیں بن جاتے۔ میں نے کہا جی ٹھیک ہے۔ انہوں نے مجھے اچھی معقول تنخواہ پر بطور کالمسٹ رکھ لیا۔ اور میرا خیال ہے کہ زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ ایک ایسی وجہ بنی جس کی تفصیلات میں جانا میں مناسب نہیں سمجھتا کہ مجھے ''جنگ'' جانا پڑ گیا۔ لیکن میں حتمی طور پر واضح کردوں کہ میں ہرگز ہرگز پیسوں کی خاطر جنگ میں نہیں گیا تھا۔ اگر میں نے پیسوں کی خاطر جنگ میں جانا تھا تو ۲۵ برس پہلے جب نکلا تو شکیل الرحمان صاحب کی آفر تھی کہ میں جنگ جوائن کرلوں اور اس وقت مجھے نوائے وقت سے بہت تھوڑے پیسے ملتے تھے اور وہ اس سے کئی گناہ زیادہ آفر مجھے کر چکے تھے لیکن میں نہیں جانا چاہتا تھا اور اس دفعہ بھی میں نے نہیں جانا تھا لیکن اس بار میری انا کو ٹھیس پہنچی تھی اور میں جانے پر مجبور تھا۔ بات کی تفصیل اس لئے زبان پر نہیں لانا چاہتا کہ ادارے اور مجید نظامی صاحب کے ساتھ میری دلی وابستگی تھی بھی اور ہے بھی۔ اس کے علاوہ نظریاتی ہم آہنگی بہت زیادہ موجود ہے۔ اگر میں وہ بات بیان کروں تو یہ ایک طرح کی شکایت زبان پر لانے والی بات ہوگی جو کہ میں نہیں لانا چاہتا۔

اب کچھ ''معاصر'' کی بات ہو جائے۔ یہ میں ۱۹۷۹ء سے نکال رہا ہوں۔ معاصر ایک literly میگزین ہے۔ Pure literly اور سو فیصد نان کمرشل، بلکہ نان کمرشل بھی اس کے لئے proper لفظ نہیں ہے کیونکہ میں نے اگر ہزار پرچہ چھاپا ہے تو ہزار میں سے تین سو میں مارکیٹ میں دیتا ہوں اور سات سو میں مفت بھیجتا ہوں اور پوری دنیا کی لائبریریوں میں بھی بھیجتا ہوں۔ دراصل مجھے ادب سے عشق ہے چنانچہ یہ ادبی، جریدہ، معاصر، سہ ماہی جو ۱۹۷۹ء سے نکل رہا ہے اور کم از کم ہر پرچے پر میرے تیس ہزار روپے جیب سے خرچ ہو جاتے ہیں۔ چالیس فی صد اس میں اشتہارات کی ادائیگی ہوتی ہے۔ ساٹھ فی صد کی ادائیگی نہیں ہوتی۔ جہاں تک معاصر کے ادبی مقام کا تعلق ہے تو آپ ادبی حلقوں سے پوچھیں وہ آپ کو بتائیں گے کہ ادبی پرچوں میں یہ کہاں اسٹینڈ کرتا ہے۔ یہ ایک سیکولر پرچہ ہے، البتہ اس میں، میں کوئی ایسی تحریر چھاپنے کے لئے تیار نہیں جو خواہ ادب کا کتنا ہی بڑا شاہکار ہو لیکن وہ پاکستان کے خلاف ہو، مزید یہ کہ بہت ساری چیزیں اس میں ایسی چھپتی ہیں جن کے ساتھ مجھے اتفاق نہیں ہوتا لیکن اگر کوئی نظم یا افسانہ پاکستان کے خلاف ہے تو وہاں میں ''لبرل'' نہیں ہو سکتا۔ میری اس سوچ کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں بھارت دشمنی کو حب الوطنی خیال کرتا ہوں۔ البتہ مجھے تسلیم ہے کہ کسی زمانے میں، میں ایسا ہی سمجھتا تھا لیکن اب میرا خیال یہی ہے کہ اختلافات کے ساتھ ساتھ بھارت کے ساتھ اچھے روابط ہونے چاہئیں اور اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان ایک بنیادی مسئلہ موجود ہے اور جب تک وہ حل نہیں ہوتا تب تک اتنی یگانگت جس کا مظاہرہ اب کیا جا رہا ہے، مناسب نہیں ہے۔ یہ شادی سے پہلے ہنی مون منانے والی بات ہے اور یہ رویہ غیرت و حمیت کے خلاف ہے۔ دیکھیں نا جس طرح ہم دوستوں کے درمیان ہوتا ہے کہ اگر ہمیں دوسرے کی ذرا سی بھی بات بری لگے تو ہم ملنا جلنا چھوڑ دیتے ہیں، گفتگو چھوڑ دیتے ہیں لیکن بھارت کے ساتھ معاملہ یہ ہے کہ ہم اس سے جنگیں لڑ چکے ہیں اور صورت حال یہ ہو کہ کشمیری اپنی عصمتوں، اپنی جانوں کی قربانیاں دے رہے ہیں اور بے پناہ دکھوں میں سے گزر رہے ہوں اور جہاں سات لاکھ انڈین فوجی بیٹھے ہوں اور کسی زمانے میں ان کشمیریوں کو ابھارنے والے بھی ہم ہوں، بھڑکانے والے بھی ہم خود ہی ہوں اور بعد میں ہم پیچھے ہٹ جائیں اور دوستی دوستی کا نعرہ لگانا شروع کر دیں تو میں اس چیز کا بالکل قائل نہیں ہوں۔ اس دوستی میں کسی کے ساتھ بے وفائی شامل ہے۔

میں جب غالباً تھائی لینڈ میں تھا وہاں میری چینی سفیر سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے

یہ اچھی بات کہی تھی کہ تم لوگ مسئلہ کشمیر کو زندہ رکھو مگر ساتھ ہی تعلقات کو کشیدہ نہ کرو۔ یہاں تک تو میں اس بات کا قائل ہوں کہ کشمیر کی اہمیت کو ہم اجاگر کرتے رہیں۔ کشمیر کے مسئلے کو ٹھنڈا نہ کریں لیکن ساتھ ساتھ یہ جو ہم نے ناروا پابندیاں لگائی تھیں کہ طویل عرصے سے کتابیں نہیں آ رہیں، رسالے نہیں، ادیب اور دانشور نہیں آ جا سکتے، جن کے رشتے دار ہیں دونوں طرف، وہ ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے کو ترستے ہیں یہ ایک Abnormal situation تھی۔ اس حوالے سے Normalization کی ضرورت تھی، یہاں تک تو ٹھیک ہے۔ لیکن آج یہ ہو رہا ہے کہ وہ ادھر آتے ہیں اور آ کر لاہور میں ایک ڈرامہ سٹیج کرتے ہیں اور اس ڈرامے میں پاکستان کے خلاف بکواس کرتے ہیں۔ یہ بھلا دوستی کیسے قرار دی جا سکتی ہے؟ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس ڈرامے کا رائٹر اتنا معقول آدمی تھا کہ اس نے ڈرامہ سٹیج کرنے سے پہلے کہا کہ جناب اس ڈرامے میں یہ یہ چیزیں موجود ہیں یہ ہمارے انڈین ناظرین کے لئے تھا اگر آپ کہیں تو ہم یہ نکال دیتے ہیں مگر ہمارے منتظمین نے کہا: نہیں نہیں، ہم بڑے لبرل لوگ ہیں۔ کوئی ضرورت نہیں اس کے نکالنے کی۔ میرے خیال میں یہ لبرل ازم نہیں بے غیرتی ہے۔ اسی طرح ہمارے کچھ بے غیرت Normalization کے چکر میں وہاں جا کر پاکستان کے خلاف بکواس کرتے ہیں۔ یہ چیزیں میرے نزدیک "over" ہے۔ میری بات کا حاصل یہ ہے کہ ہمیں اپنے قومی مفاد اور قومی غیرت کو ملحوظ رکھتے ہوئے حالات کو normalize کرنا چاہئے اور اسی کو میں حب الوطنی سمجھتا ہوں اور یہی حب الوطنی، معاصر کا رہنما اصول ہے۔ اس کے علاوہ یہ پرچہ سو فی صد سیکولر ہے۔

اب ذرا میری صحافیانہ یادوں کا ذکر ہو جائے۔ پاکستان کی تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں گزرا جس میں ہم صحافت کو مکمل طور پر آزاد کہہ سکتے ہوں۔ پہلا دور میں نے دیکھا ایوب صاحب کا، دوسرا دور میں نے دیکھا بھٹو صاحب کا پھر ضیاء الحق صاحب کا دور آیا اس کے بعد بے نظیر نواز شریف، دو دو دفعہ برسر اقتدار رہے۔ اور آج کل ماشاءاللہ جنرل صاحب کا دور دیکھ رہا ہوں۔ بظاہر کوئی دور ایسا نہیں جب یہ نہ کہا گیا ہو کہ لکھنے کی مکمل آزادی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ مکمل آزادی دنیا میں کہیں بھی نہیں اس میں سب سے زیادہ جو پریشر ہوتا ہے وہ خود اخبار کے مالکان کا ہوتا ہے۔ اخبار کے مالکان کی بھی مجبوری ہوتی ہے۔ ایک حد تک ان کو Advice بھی ملتی ہے۔ انہوں نے اپنے اشتہاروں کے بل Clear کروانا ہوتے ہیں۔ ہمارے لکھنے والوں کا یہ معاملہ ہے کہ کھلم کھلا اپنا اظہار خیال کرتے ہیں۔ دراصل ہمارا اور مالکان کا معاملہ تو وہ گانے والا معاملہ ہوتا ہے کہ تمہاری دو

نکیا کی نوکری اور میرا لاکھوں کا سامان جائے! چنانچہ اس میں قطع و برید ہر دور میں ہوتی رہی ہے اور پھر یہ دیکھ کر لکھنے والا خود بھی سمجھ جاتا ہے۔ یوں پچاس فی صد سچ بولا جاتا ہے۔

میں ۷۰ء سے لے کر ۷۷ء تک مسلسل بھٹو حکومت کے خلاف لکھتا رہا ہوں، لیکن سچی بات پوچھیں تو مجھے آج افسوس ہے کہ اتنا خلاف کیوں لکھا۔ اگر مجھے اس وقت شعور ہو جاتا کہ کچھ طاقتیں ذوالفقار علی بھٹو کو اس کے غلط کاموں کی سزا نہیں دے رہیں بلکہ اس کے اچھے کاموں کی سزا دے رہی ہیں تو میں ایک لفظ بھی خلاف نہ لکھتا بلکہ میں ان کی حمایت میں سینہ تان کر کھڑا ہو جاتا لیکن اس وقت مخالف لوگ جذباتی ہو چکے تھے اور تحریک نظام مصطفیٰؐ کو ہم نے یہ سمجھا کہ شاید یہ ظلم اور جبر کے خلاف ایک تحریک ہے کیونکہ جب یہ سنتے کہ سلیمان ایم این اے کی بیٹی اغوا ہو گئی ہے یا میاں طفیل محمد پر تشدد ہو رہا ہے تو میرا خون کھولتا تھا۔ یہ ہمیں پتا نہیں تھا کہ تحریک نظام مصطفیٰؐ کے پیچھے سی آئی اے ہے۔ اگر اس وقت اس بات کا شعور ہوتا تو میں جس مزاج کا آدمی ہوں اور جس حریت پرور خاندان کے ساتھ میرا تعلق ہے۔ میں کبھی بھی یہ کام نہ کرتا۔ خیر، اس دور میں وقار انباری صاحب نے مجھے ایک دن بلایا اور مجھے کہنے لگے کہ آپ نے ... نہیں، بلکہ مجھے وہ تم کہا کرتے تھے، ہم بھی بابے (وقار انبالوی) کو ''تم'' کہا کرتے تھے۔ بہت بے تکلفی ہوتی تھی ... کہنے لگے تمہارے لئے ایک پیغام ہے۔ میں نے پوچھا کس کا؟ کہنے لگے FSF کے سربراہ مسعود محمود کا۔ میں نے کہا: کیا پیغام ہے؟ کہنے لگے اس کا پیغام مختصر ہے اور یہ ہے کہ اسے کہہ دینا کہ زندگی خوبصورت ہے اور تم ابھی نوجوان ہو۔ سیدھی قتل کی دھمکی دی تھی۔ اس وقت میں بالکل جوان تھا۔ بہت گرم خون تھا میرا۔ میں نے جواب میں اسے گالیاں دیں اور کہا: وقار صاحب، جس طرح آپ نے یہ پیغام پہنچایا ہے؟ اسی طرح میرا پیغام بھی پہنچانا ہے، اسی زبان میں۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ سترہ دنوں کے بعد حکومت ختم ہو گئی ورنہ اس وقت میں یہ کہانی نہ سنا رہا ہوتا۔

بھٹو صاحب کے دور کا ایک واقعہ مجھے یاد آ رہا ہے اور یہ واقعہ ان کی حکومت ختم ہونے کے بعد پیش آیا۔ اسلام آباد میں ہوٹل میں کانفرنس تھی۔ وہاں مجھے ایک لمبا سا آدمی ملا۔ گہرا سانولا رنگ، سر پر ٹوپی اور سوٹ پہنا ہوا۔ میرے پاس آیا اور کہنے لگا: آپ نے مجھے پہچانا؟ میں آرمی

انٹیلی جنس میں میجر تھا۔ میں نے کہا اچھا! مجھے آپ کے اس تعارف کا معلوم نہ تھا۔ کہنے لگا: میرے پاس آپ کا ایک عالم آیا تھا۔ اس کا عنوان تھا ''ہیرو، کامیڈین اور ولن''۔ مجھے اس پر ریمارکس دینے کے لئے کہا گیا۔ میں نے اس پر لکھا کہ اس پر کارروائی کرنا ''آ بیل مجھے مار'' کے مترادف ہو گا۔

یہ کالم میں نے قومی اتحاد کی تحریک نظام مصطفیٰؐ کے دوران لکھا تھا اور بہت خوفناک کالم تھا۔ بھٹو صاحب پر تھا اور میں نے اس میں لکھا تھا کہ اداکار اسلم پرویز پہلے فلموں میں بطور ہیرو آتا تھا۔ لوگوں نے اسے ہیرو کے طور پر Reject کر دیا پھر اس نے ہلکے پھلکے کامیڈی کے کردار ادا کئے۔ لوگوں نے پھر بھی اسے قبول نہ کیا اور آج کل وہ فلموں میں بطور ولن آ رہا ہے۔ قتل عام کر رہا ہے، یہ کر رہا ہے، وہ کر رہا ہے۔ اس کے بعد جو کچھ بھی ملک میں ہو رہا تھا، وہ میں نے سارا بیان کر دیا۔ نظام صاحب نے مزید احتیاط کی اور اس پر اسلم پرویز کی تصویر بھی لگا دی اور کو نے پر لکھا دیا ''فلمی دنیا'' لیکن یہ محض ایک کارروائی تھی۔ اس زمانے میں لوگوں کے شعور کا یہ عالم تھا کہ جب کالم چھپا اور میں صبح باہر نکلا تو ہماری گلی میں ریڑھی پر تربوز لگانے والا کہنے لگا: ''قاسمی صاحب! آج تو بھٹو صاحب کی خوب خبر لی ہے۔'' میں نے کہا خدا سے ڈرو بھائی وہ تو اسلم پرویز کے بارے میں تھا۔ کہنے لگا: ''رہنے دیں، مجھے پتا ہے سب کچھ۔'' اسلم پرویز کے ساتھ ملا تو بڑی گرمجوشی سے گلے ملا۔ میں نے کہا آپ ناراض تو نہیں؟ کہنے لگا میرے بارے میں ہوتا تو میں ناراض ہوتا۔

اس کے بعد ضیاء صاحب کا دور آیا۔ ضیاء صاحب کو میں نے ایک دن کے لئے بھی ذہنی طور پر قبول نہیں کیا۔ چنانچہ ۷۷ء میں وہ آئے تھے اور میرے کالم On the record موجود ہیں۔ ۷۹ء میں جب قومی اتحاد کی حکومت بنی تو جنرل صاحب نے آرمی ہاؤس راولپنڈی میں ایک افطار ڈنر دیا۔ میں بھی اس میں مدعو تھا۔ اس میں میرا خیال ہے، کوئی ڈیڑھ دو سو آدمی ہوں گے۔ میں ضیاء جالندھری کے ساتھ کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ ضیاء جالندھری اس وقت ٹی وی کے ایم ڈی تھے۔ جنرل صاحب وردی میں داخل ہوئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اچانک ان کی نظر اس طرف پڑی جہاں میں کھڑا تھا۔ وہ باقی سارے آدمی چھوڑ کر سیدھا میرے پاس آ گئے۔ میں سمجھا شاید ضیاء جالندھری صاحب کو ملنا چاہتے ہیں لیکن پھر مجھے اپنے خیال پر ہنسی آئی کہ ضیاء صاحب کی تو حیثیت ہی کوئی نہیں۔ یہ تو ایم ڈی ہیں اور وہ ایک چیف مارشل ایڈمنسٹریٹر۔ پھر میں نے دیکھا کہ جنرل صاحب مسکراتے ہوئے میری طرف آ رہے ہیں تو میں نے آگے بڑھ

کر ہاتھ ملایا۔ انہوں نے ہاتھ ملانے کے بجائے معانقہ کر لیا اور ساتھ ہی جملہ چست کیا کہ قاسمی صاحب، تصویر میں تو آپ ماشاءاللہ بڑے جوان نظر آتے ہیں۔ میں ہنس پڑا۔ میرے کندھے تھپتھپا کر کہنے لگے کہ دل چھوٹا نہ کریں آپ ماشاءاللہ ویسے بھی جوان ہیں۔ ابھی میں کچھ کہنے کو سوچ ہی رہا تھا کہ ساتھ ہی انہوں نے اگلا جملہ کہا: قاسمی صاحب، وہ آپ کا اسلام کیا ہوا؟ وہ آپ کا پاکستان کیا ہوا؟ مجھے سمجھ نہ آئی کہ ضیاء صاحب کہنا کیا چاہتے ہیں۔ اگلے ہی لمحے، خدا کا شکر ہے کہ بات میری سمجھ میں آ گئی۔ وہ کہنا یہ چاہتے تھے کہ بھٹو کے تو تم اسلام اور پاکستان کی وجوہ کی بناء پر خلاف تھے اور میں اب محافظ اور محافظ پاکستان آ گیا ہوں اور تم میرے بھی اسی طرح خلاف ہو۔ میں نے کہا سر میں نے ماضی میں جو کچھ بھی لکھا اپنے خدا اور ضمیر کو حاضر و ناظر جان کر لکھا اور آئندہ بھی جو لکھوں گا وہ خدا اور ضمیر کو حاضر و ناظر جان کر لکھوں گا۔ ساتھ ہی مجھے کہنے لگے کہ آپ کھانا کھا کر جایئے گا نہیں، آپ سے باتیں کریں گے۔ جب سب لوگ چلے گئے تو ہم لان میں بیٹھ گئے۔ اس وقت اندھیرا ہو چکا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میرے ساتھ صدیق سالک مرحوم ادارے کے بروہی صاحب تھے، جنرل صاحب نے میرا ہاتھ پکڑا اور لان میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ مختلف امور پر باتیں کرتے رہے۔ میرا خیال ہے کوئی ۲۵ منٹ ہم نے لان میں چہل قدمی کی ہوگی۔ پھر اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے کہ قاسمی صاحب میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیں۔ میں نے کہا: جی ایک ہے۔ دراصل ان دنوں میرے عزیز دوست سراج منیر کے والد مولانا متین ہاشمی کو دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری ریسرچ سیل بند کر کے فارغ کر دیا گیا تھا۔ میں نے کہا لائبریری میں ایک ریسرچ سیل قائم تھا، علمی کام کر رہا تھا، آپ کی حکومت نے اسے بند کر دیا۔ میری خواہش ہے کہ آپ اسے بحال کر دیں۔ انہوں نے سالک صاحب کو بلایا اور کہا: ''سالک! یہ فوری کر دو اور چوبیس گھنٹے کے اندر اندر مجھے اس کی اطلاع دو۔'' چنانچہ جب ہم لاہور پہنچے تو مولانا متین ہاشمی کو وہ گھر سے آ کر لے گئے اور وہاں دوبارہ بٹھا دیا۔ میں نے بعد میں شکریہ ادا کیا تو کہنے لگے آپ اور خدمت بتائیں۔ میں نے کہا میں نے بتا بھی دی اور آپ نے وہ کام کر بھی دیا۔ جواب میں بولے، نہ نہ، آپ نے میرے گناہوں میں کمی اور ایک نیکی میرے نامہ اعمال میں درج کی۔ اس کے لئے اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔ آپ مجھے کوئی خدمت بتائیں! میں نے پھر وہی جواب دیا اور جب انہوں تیسری دفعہ خدمت کا کہا اور میری طرف سے جب وہی جواب ملا تو وہ خاموش ہو گئے۔ غالباً وہ سمجھ گئے کہ یہ ''پرندہ'' دانہ و دام کے چکر میں آنے والا نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے اور یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ میں نے پوری زندگی کوئی سرکاری پلاٹ نہیں لیا۔ میں نے آدھی زندگی کرایے کے گھر میں گزار دی۔ باقی زندگی میں نے نو مرلے ۸۰ فٹ کے ایک گھر میں گزاری اور اب جا کر مجھے ریٹائرمنٹ کے پیسے ملے اور نا روے سے جو کچھ بچت ہوئی اس سے ایک گھر بنایا ہے۔ حکومت سے نہ کوئی پلاٹ لیا، نہ کوئی اور مراعات، کچھ نہیں Never in my life لوگ مجھے کہتے ہیں کہ آپ نے زندگی میں بڑی محنت کی ہے، بہت کام کیا ہے جس کے صلے میں اللہ نے آپ کو یہ سب کچھ دیا لیکن میں پوری دیانتداری سے محسوس کرتا ہوں کہ میں نے زندگی میں نہ کوئی ایسی محنت کی ہے اور نہ ایسی کامیابی حاصل کی اور یہ میں بوجہ انکسار نہیں کہہ رہا بلکہ امر واقعہ ہی یہی ہے۔ جب لوگ کہتے ہیں کہ آپ نے بڑی محنت کی ہے تو مجھے خیال آتا ہے کہ کہنے والے کا اشارہ ان حالات کی طرف ہوگا جب میں نوائے وقت میں سب ایڈیٹر تھا۔ سنڈے ایڈیشن اور دوسرے صفحات کے ایڈیشن میں نے جڑوانے ہوتے تھے۔ اس مقصد کے لئے میں ساری ساری رات پیسٹر اور دوسرے عملے کے ساتھ کام کرتا اور جب میں تھک جاتا تو جس میز پر کاپی جڑواتا تھا اسی پر سو جاتا تھا اور کئی دفعہ صبح چار بجے شدید سردی میں، میں موٹر سائیکل پر ماڈل ٹاؤن اپنے گھر آتا تھا یا ان کا اشارہ اس محنت کی طرف ہو سکتا ہے جب میں نے کوئی کتاب لکھی تھی یا ساری ساری رات جاگ کر ڈرامے لکھے۔ لیکن پھر میں سوچتا ہوں کہ اگر یہ محنت تھی تو پھر یہ مجھے محسوس کیوں نہیں ہوئی۔ اس کی ایک ہی وجہ میری سمجھ میں آتی وہ یہ کہ یہ سارے کام میری مرضی کے تھے۔ ان میں سے کوئی کام ایسا نہیں تھا جو مجھے ناگوار تھا، مجھ پر بوجھ تھا۔ میری سب سے بڑی خوش قسمتی یہی ہے کہ اگر میں پڑھاتا رہا ہوں تو یہ بھی میرا شوق تھا۔ مجھے پڑھانے میں لطف آتا تھا۔ اگر میں کالم لکھتا ہوں تو مجھے کالم لکھنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ اگر میں نے سفر نامہ لکھا ہے تو مجھے اس میں بھی لذت ملی ہے۔ ڈرامہ لکھنے بیٹھا تو اس میں گم ہو جاتا تھا۔ میں نے ان میں سے کوئی کام بھی چونکہ ڈیوٹی سمجھ کر نہیں کیا، اس لئے مجھے لگتا ہے کہ میں نے ساری عمر کچھ بھی نہیں کیا۔ کوئی محنت نہیں کی۔ میں نے اپنی زندگی میں جو کچھ حاصل کیا، اس کے لئے میں نے کوئی منصوبہ بندی نہیں کی۔ Never in my life میرا شدید احساس ہے کہ کوئی غیبی ہاتھ ہے جو میرے راستے کے کانٹے صاف کر دیتا ہے اور میرے لئے راستہ ہموار ہو جاتا ہے۔ مثلاً میں جب میٹرک میں پڑھتا تھا تو اس وقت Math لازمی تھا اور میں اگر ساری عمر بھی لگا رہتا تو میں اس Math کی وجہ سے میٹرک پاس نہیں کر سکتا تھا۔ اب ہوا یہ کہ ایوب خان کی حکومت تھی،

محکمہ تعلیم نے ایک سال کے لئے Math کو اختیاری کر دیا اور یوں میں میٹرک پاس کر گیا۔ اسی طرح میرا تعلیمی ریکارڈ کوئی اتنا اچھا نہیں تھا۔ میٹرک میں میری سیکنڈ کلاس، ایف اے میں غالباً تھرڈ کلاس، بی اے میں پھر سیکنڈ کلاس اور ایم اے بھی سیکنڈ کلاس نمبروں سے پاس کیا۔ میں اگر کالج کی نوکری کے لئے پبلک سروس کمیشن کے سامنے جاتا تو میں کبھی بھی لیکچرار کے لئے Select نہ ہو سکتا تھا۔ اب ہوا یہ کہ میں ایم اے او کالج میں بطور لیکچرار گیا جو کہ ایک پرائیویٹ کالج تھا اور اس کی تفصیل میں پہلے بتا چکا ہوں۔ اس کے کچھ عرصے بعد ہی حکومت نے سارے کالج Nationalize کر دیئے اور یوں میں پبلک سروس کمیشن میں Appear ہوئے بغیر گورنمنٹ سرونٹ بن گیا۔ اسی طرح میں نے زندگی میں جو بھی ملازمتیں کیں، مجھے جو بھی کام ملے، چاہے کالم نگاری ہو یا ڈرامہ نگاری، ان میں سے کسی کے لئے میں نے کبھی کوشش نہیں کی۔ خود بخود راستے میرے لئے ہموار ہوتے گئے اور میں یہ کام کرتا گیا۔ حتیٰ کہ جب مجھے ناروے میں سفیر مقرر کیا گیا تو اس میں بھی نہ میری کوئی خواہش تھی اور نہ میری کوئی پلاننگ۔ ہوا اس طرح کہ جب بے نظیر دور میں میاں نواز شریف صاحب اپوزیشن لیڈر تھے اور میں چونکہ شروع ہی سے اپوزیشن مائنڈڈ رہا ہوں، ایوب خان کے دور میں ایوب کی حکومت کے خلاف تھا۔ بھٹو کے دور میں بھٹو حکومت کا ناقد تھا۔ ضیاء الحق کے دور میں اس کی حکومت کے خلاف تھا۔ بے نظیر کی حکومت میں بے نظیر پر تنقید کی۔ اب جب نواز شریف صاحب اپوزیشن میں آئے تو میں اُس وقت اپوزیشن کا ساتھی تھا اور میں نے بہت کھل کر اپوزیشن کا ساتھ دیا۔ چنانچہ جب بے نظیر کی حکومت ختم ہوئی اور دوبارہ الیکشن ہوئے اور اس کے رزلٹ آنا شروع ہوئے تو میں جس جماعت کو سپورٹ کر رہا تھا وہ جیت رہی تھی اور اس کی کامیابی کی خبریں سن کر مجھے بڑی خوشی ہو رہی تھی اور میرا دل چاہا کہ جس طرح ساری دنیا اس وقت ماڈل ٹاؤن پہنچی ہوئی ہے اور لوگ میاں نواز شریف کے ساتھ بیٹھ کر رزلٹ دیکھ رہے ہیں اور مبارک بادیں دے رہے ہیں، میں بھی جاؤں۔ پھر میں نے سوچا کہ یہ مناسب نہیں۔ اگلے دن الیکشن جیتنے پر تمام لوگ ماڈل ٹاؤن مبارک باد دینے جا رہے تھے۔ ایک بہت بڑا ہجوم نواز شریف صاحب کی کوٹھی کے باہر تھا اور ان میں وہ لوگ بھی تھے جنہوں نے ہمیشہ ان کی مخالفت کی تھی اور الیکشن میں بھی ان کے مخالف رہے تھے مگر میں مبارک باد دینے کے لئے نہ گیا۔ اس کے بعد جب میاں نواز شریف صاحب وزیراعظم بنے تو تقریب حلف وفاداری ہوئی۔ اس کا مجھے دعوت نامہ آیا لیکن میں اس میں بھی شامل نہ ہوا۔ اس کے کوئی ایک دو ہفتے بعد کی بات

ہے کہ میں شام کو گھر آیا تو میری خالہ ساس جو کہ راولپنڈی رہتی ہیں اور اس وقت لاہور آئی ہوئی تھیں، کہنے لگیں کہ بیٹے، میاں نواز شریف صاحب کا فون آیا تھا۔ میں نے کہا کس طرح فون آیا تھا؟ انہوں نے کہا کہ جب میں نے فون اٹھایا تو بولنے والا کہہ رہا تھا کہ میں نواز شریف بول رہا ہوں۔ میں نے کہا، نہیں ایسا نہیں ہوتا۔ جب وزیراعظم فون کرتا ہے تو پہلے چار پانچ سیکرٹری بات کرتے ہیں اور لائین Clear کرواتے ہیں، بڑا لمبا چوڑا چکر ہوتا ہے۔ ابھی یہ بات ہو ہی رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے فون اٹھایا تو بالکل ویسے ہی کہا گیا کہ میں نواز شریف بول رہا ہوں اور قاسمی صاحب سے بات کرنی ہے۔ میں نے کہا، میں عطاء الحق قاسمی بول رہا ہوں۔ میاں صاحب ہنس کر کہنے لگے کہ قاسمی صاحب میں نے سوچا کہ آپ مصروف آدمی ہیں، لہٰذا میں ہی آپ کو مبارک باد دے دوں۔ میں نے کہا میاں صاحب، آپ کا کیا خیال ہے، مجھے آپ کی کامیابی کی خوشی نہیں ہوئی؟ مجھے بہت خوشی ہوئی ہے لیکن میرے اظہار کا اپنا ایک طریقہ ہے۔ کہنے لگے کہ قاسمی صاحب آپ کل مجھے کچھ وقت دے سکتے ہیں؟ میں ہنس پڑا اور کہا کہ میاں صاحب وقت تو اب آپ دیا کریں گے۔ آپ وزیراعظم ہیں۔ کہنے لگے نہیں آپ بتائیں کہ کل کس وقت آ سکتے ہیں؟ میں بولا: میاں صاحب آپ اس تکلف میں نہ پڑیں، آپ اپنا شیڈول دیکھ کر مجھے بتائیں کہ میں کس وقت آؤں۔ کہنے لگے کل گیارہ بجے آ جاؤ۔ میں وقت کے مطابق پہنچ گیا۔ اُس وقت بھی لوگوں کا ہجوم تھا۔ میاں صاحب مجھے بڑے تپاک سے ملے اور پھر سب کے سامنے وہی جملہ دہرایا جو انہوں نے فون پر کہا تھا کہ قاسمی صاحب بڑے مصروف آدمی ہیں، میں نے سوچا خود ہی ان کو مبارک باد دے دیں۔ اس کے بعد مجھے ایک صوفے پر لے کر بیٹھ گئے۔ کہنے لگے کہ قاسمی صاحب میں چاہتا ہوں کہ آپ کی ذمہ داریوں میں کچھ اضافہ کیا جائے۔ میں نے کہا میاں صاحب، آپ کو یاد ہوگا جب جکارتہ میں غیر جانبدار ملکوں کی کانفرنس ہوئی اور جہاز میں، میں بھی آپ کے ساتھ تھا۔ آپ نے مجھے اپنے کیبن میں بلا کر یہی بات کہی تھی اور میں نے کہا تھا کہ میں نے پہلے ہی بہت ساری ذمہ داریاں سنبھالی ہوئی ہیں اور مزید ذمہ داری سنبھالنے کی میں خواہش نہیں رکھتا۔ میاں صاحب کہنے لگے، میں اس وقت آپ کی باتوں میں آ گیا تھا، اس دفعہ میں نہیں آؤں گا۔ بتائیں آپ کی خدمات کس شعبے کے سپرد کی جائیں۔ میں نے کہا: میرے ذہن میں کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ انہوں نے اصرار کیا۔ میں نے بتایا کہ میرا یقین کریں میں بالکل خالی الذہن ہوں۔ میں نے کبھی ایسی بات سوچی ہوتی تو آپ کو بتاتا۔ میں نے تو کبھی اس بارے میں سوچا ہی

نہیں۔ کہنے لگے، ساتھ والے کمرے میں میری میٹنگ ہے۔ میں میٹنگ میں جا رہا ہوں اور پندرہ منٹ بعد میں واپس آؤں گا۔ آپ یہیں تشریف رکھیں اور سوچ کر رکھیں۔ وہ واپس آئے تو میرا ذہن اسی طرح خالی تھا۔ میں نے کہا میاں صاحب، مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ تب مجھے کہنے لگے آپ پی ٹی وی کا چیئرمین بننا پسند کریں گے؟ میں نے کہا: نہیں۔ کہنے لگے کیوں؟ میں نے کہا: یہ تو نرا ہارٹ اٹیک ہے۔ وفاقی اور صوبائی حکومت کو گلا رہتا ہے کہ ہماری کوریج نہیں ہو رہی۔ کہنے لگے، پھر آپ کچھ تو بتائیں، اندرون ملک یا بیرون ملک۔ جب انہوں نے بیرون ملک کہا تو میرے اندر کا سیاح جاگ اٹھا۔ میں نے کہا چلیں بیرون ملک ٹھیک ہے۔ کہنے لگے: کہاں؟ میں ناروے اکثر جایا کرتا تھا۔ یہ ملک مجھے پسند تھا۔ میں نے کہا: ناروے۔ انہوں نے اسی وقت آرڈر کر دیا۔ یہ سارا کچھ مجبوری کے عالم میں ہوا یعنی اس میں میری خواہش کو کوئی دخل نہیں تھا۔ جب میں باہر نکلا تو میرے اندر شدید کشمکش ہو رہی تھی کہ میں نے یہ بات بھی کیوں مان لی۔ جب میں گھر گیا اور بتایا کہ اس طرح مجھے ناروے میں سفیر لگا رہے ہیں تو گھر میں بھی رونا دھونا شروع ہو گیا۔ گھر والوں نے کہا کہ باہر جانے کی کوئی ضرورت نہیں، ہم اپنے ملک ہی میں ٹھیک ہیں۔ اب مجھے سپورٹ مل گئی کیونکہ میں بھی اندر سے یہی چاہتا تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ میں اپنے دوست تسلیم نورانی سے مشورہ کروں۔ وہ اس وقت پنجاب کے ایجوکیشن سیکرٹری تھے۔ چنانچہ میں نورانی صاحب کے پاس گیا اور بتایا کہ مجھے یہ پیشکش کی گئی ہے۔ بتائیں کہ مجھے قبول کرنی چاہئے کہ نہیں؟ نورانی صاحب نے کہا میرے خیال میں آپ کو یہ قبول نہیں کرنی چاہئے۔ میں نے پوچھا کیوں؟ انہوں نے کچھ وجوہات بتائیں۔ میں نے کہا کہ مجھے آپ کے دلائل اور رائے سے پورا اتفاق ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں اب پڑھا پڑھا کر تنگ آ چکا ہوں اور اپنا کچھ ادبی کام بھی کرنا چاہتا ہوں۔ آپ ایسا کریں کہ مجھے پنجاب میں ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ میں کسی کونے میں بٹھا دیں۔ جہاں ایک کرسی، میز اور ٹیلی فون ہو۔ جہاں بیٹھ کر میں کچھ عرصے کے لئے پڑھانے کے بجائے لکھنے پڑھنے کے کام کروں۔ کہنے لگے بالکل ٹھیک ہے۔ انہوں نے اسی وقت میرے لئے ڈائریکٹر چلڈرن کمپلیکس کے آرڈر کر دیئے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے یہ بھی پوچھا کہ بھابھی اب بھی پڑھاتی ہیں؟ میں نے کہا ہاں۔ تو کہنے لگے بھابھی کے نام پر میں ایک مکان بھی الاٹ کر دیتا ہوں۔ ایجوکیشن والوں کے پاس بہت سے گھر ہیں۔ انہوں نے قذافی سٹیڈیم کے پاس ٦ کنال کا گھر بھی الاٹ کر دیا۔ میں اس بندوبست پر بہت خوش ہوا۔ اس دوران میں گھر آیا

اور بتایا کہ میں سفارت کی پیشکش سے انکار کرنے لگا ہوں اور اس کے بجائے یہ ہو گیا ہے جو میری مرضی کے مطابق ہے۔ گھر والے بھی بڑے خوش تھے۔ میں گھر سے باہر کسی کام کے لئے نکلا تو مجھے راستے میں مجیب الرحمٰن شامی صاحب مل گئے۔ شامی صاحب کو میں نے ساری بات بتائی۔ کہنے لگے: آئیں کہیں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔ جب ہم بات کرنے لگے تو انہوں نے کہا کہ آپ اپنی زندگی کا بہت غلط فیصلہ کر رہے ہیں۔ آپ کو یہ نہیں کرنا چاہئے۔ انہوں نے بڑے زبردست دلائل دیئے کہ آپ کو کیوں جوائن کرنا چاہیے۔ میں پھر کنفیوز ہو گیا۔ میں گھر آیا اور بتایا کہ شامی صاحب یہ کہہ رہے تھے۔ میری بیوی کہنے لگی کہ میں شامی صاحب سے متفق نہیں ہوں۔ میرا خیال یہی ہے کہ نورانی صاحب نے جو کہا، وہی ٹھیک ہے۔ میں نے کہا: اب میں یوں کرتا ہوں کہ مجید نظامی صاحب کے پاس جاتا ہوں۔ وہ میرے بڑے محترم ہیں۔ میں ان سے مشورہ نہیں لیتا بلکہ ان کا فیصلہ سن لیتا ہوں۔ جو وہ کہیں گے، میں وہی کر لوں گا۔ چنانچہ میں نے نظامی صاحب سے وقت لیا اور ان کے گھر پہنچ گیا۔ میں نے انہیں ساری بات بتائی اور کہا کہ میں آپ سے مشورہ طلب کرنے نہیں بلکہ آپ کا فیصلہ سننے آیا ہوں۔ اب بتائیں میں بطور سفیر جوائن کروں یا نہ کروں؟ نظامی صاحب نے کہا: آپ جوائن نہ کریں۔ میں نے کہا بالکل ٹھیک ہے، میں ابھی میاں صاحب کو اطلاع کرتا ہوں۔ میں نے فون اپنی طرف کیا اور ابھی تین نمبر ہی ڈائل کئے تھے کہ پتا نہیں نظامی صاحب کے ذہن میں کیا بات آئی، انہوں نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا اور کہنے لگے، ابھی رک جائیں۔ میں رک گیا۔ غالباً نظامی صاحب فیصلے کے لئے کچھ وقت لینا چاہتے تھے۔ چنانچہ میں واپس آ گیا۔ اگلی صبح کا جب اخبار آیا تو The News میں ڈبل کالمی سرخی لگی ہوئی تھی کہ عطاء الحق قاسمی کو ناروے میں سفیر مقرر کر دیا گیا ہے۔ میں بڑا پزل ہوا کیونکہ لوگوں کے مبارک باد کے فون بھی آنا شروع ہو گئے تھے۔ میں نے پتا کیا کہ یہ خبر کس نے لگائی ہے۔ معلوم ہوا کہ فلاں صحافی نے یہ خبر دی ہے۔ میں نے اسے فون کیا اور پوچھا کہ یہ خبر آپ نے لگائی ہے؟ کہنے لگا: جی ہاں۔ میں نے پوچھا آپ کا Source کیا ہے؟ کہنے لگا: آپ کو تو پتا ہے کہ صحافی اپنا Soruce کبھی نہیں بتاتا۔ میں نے کہا یار تم میرے لئے صحافی تھوڑے ہو بلکہ دوست ہو۔ مجھے بتاؤ۔ کہنے لگا: پہلے آپ یہ بتائیں کہ کیا یہ خبر صحیح ہے یا غلط؟ میں نے کہا: میں بعد میں بتاؤں گا پہلے بتائیں کہ یہ خبر آپ نے کہاں سے لی ہے۔ اس نے بتایا کہ میرا سگا ماموں فارن آفس میں ڈائریکٹر ہے اور یہ خبر انہوں نے دی ہے۔ اب آپ بتائیں یہ خبر ٹھیک ہے؟ میں نے کہا: ہاں ٹھیک

ہے۔ اس کے بعد جب میں گھر آیا تو گھر میں لوگوں کے گلدستے آئے ہوئے تھے۔ لوگ خود مبارک باد دینے کے لئے بیٹھے ہوئے تھے۔ کوئی پچاس لسٹیں فون کی تھیں کہ ان لوگوں نے مبارک باد دی ہے۔ اس کے بعد اگر میں جوائن نہ کرتا تو اس مادہ پرست دور میں کسی نے یہ یقین نہیں کرنا تھا کہ ایک آدمی کو سفارت مل رہی ہے اور وہ انکار کر رہا ہے۔ لوگوں نے یہی کہنا تھا کہ حکومت نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا ہے۔ ان حالات میں، میں نے وہ سفارت قبول کی اور اب میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر میں یہ سفارت قبول نہ کرتا تو یہ میری زندگی کا ایک Blunder ہوتا۔ اس کے لئے میں میاں نواز شریف صاحب کا ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے ایک نئے تجربے سے دوچار کرایا اور میں نے ان کو سرخرو بھی کیا۔ میں نے اپنی سفارت کے دوران میں جو کام کئے فارن آفس بھی اس کا معترف ہے بلکہ None Career diplomats کوئی ایک دو ہی ہوں گے جن کی صلاحیتوں کا فارن آفس والوں نے اعتراف کیا ہو اور ان خوش قسمتوں میں سے ایک میں بھی ہوں۔ اس طرح زندگی کے فیصلے خود بخود ہوتے رہے ہیں۔ غائبانہ طور پر میرے راستے کے کانٹے دور ہوتے رہے اور میرے راستے میں پھول آتے رہے ہیں۔ اب اگر آپ پوچھیں کہ کیا میں اپنی زندگی سے مطمئن ہوں تو میں الحمدللہ، الحمدللہ سو فی صد مطمئن ہوں۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ دوبارہ اگر آپ کو پیدا کیا جائے تو آپ کیا بننا پسند کریں گے تو میں کہوں گا کہ میں عطاء الحق قاسمی ہی بننا پسند کروں گا۔ مجھے کوئی پچھتاوا نہیں ہوا اور اب بھی میرے دل میں کوئی خواہش نہیں اگر ہے تو بس یہ کہ جس ملک نے مجھے یہ سارا کچھ دیا ہے، اس ملک کی خاطر جو کچھ بھی کر سکتا ہوں، وہ کروں۔

بیگم شفیقہ ضیاء الحق

بیگم شفیقہ ضیاء کا انٹرویو ممتاز مفتی صاحب کے بعد میری دوسری کاوش تھا۔ یہ انٹرویو بھی معمول سے ہٹ کر تھا اور یہ بیگم صاحبہ کا آخری انٹرویو تھا' یہ انٹرویو بعدازاں بی بی سی لندن پر پڑھا گیا اور بے شمار کتابوں اور رسائل میں نقل ہوا۔

......

میرے والد ڈاکٹر تھے، حصول روزگار کے لئے مشرقی افریقہ میں مقیم تھے۔ میں وہیں پیدا ہوئی جب ذرا سیانی ہوئی تو وہ مجھے جالندھر کے ایک اسلامی مدرسے میں چھوڑ گئے جہاں میں نے دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ میٹرک تک تعلیم پائی۔ دوسری تیسری جماعت میں پڑھتی تھی تو قائداعظم محترمہ فاطمہ جناح کے ساتھ ہمارے سکول آئے، میں نے چند سہیلیوں کے ساتھ مل کر ''تمہیں آنے والو ہمارا اسلام'' کا ترانہ گایا جس کے بعد میں نے تقریر کی تو قائداعظمؒ بہت متاثر ہوئے انہوں نے مجھے شاباش دی۔ میٹرک کے بعد میں دوبارہ مشرقی افریقہ چلی گئی وہاں چار برس رہنے کے بعد ۱۹۵۰ء میں میری شادی ہوگئی۔ ضیاء صاحب کے خاندان سے ہمارا ملنا ملانا زیادہ نہیں تھا۔ بچپن میں انہیں بس ایک آدھ بار دیکھا تھا۔ شادی میرے والد کی مرضی سے ہوئی، ضیاء صاحب مجھ سے آٹھ برس بڑے تھے۔ میرا سسرال بھارت سے لٹ لٹا کر پاکستان پہنچا تھا۔ میانوالی میں ان لوگوں کو کچھ زمین الاٹ ہوئی لیکن وہ بنجر تھی اس سے کوئی آمدنی نہیں ہوتی تھی لہذا ہم لوگوں کو تنخواہ پر گزارہ کرنا پڑتا تھا۔ ہم کنجوس نہیں تھے' کھل کر خرچ کرتے تھے لیکن خدا کا شکر تھا کبھی پیسے کی تنگی نہیں آئی، ضیاء صاحب سائیکل پر دفتر جاتے تھے بعدازاں انہوں نے قسطوں پر موٹر سائیکل خرید لی۔

ضیاء الحق جالندھر میں پیدا ہوئے، ان کے والد جی ایچ کیو میں ملازم تھے' ان کی زیادہ تر تعلیم دہلی اور شملہ میں ہوئی' میٹرک کے بعد کراچی گئے مجھے اکثر بتایا کرتے تھے۔ ایک دن وہ گزر رہے تھے تو انہوں نے دیوار پر ایک پوسٹر دیکھا جس پر ٹینک بنا ہوا تھا' وہ پوسٹر سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے فوج میں بھرتی ہونے کا فیصلہ کرلیا، اپلائی کیا اور کامیاب ہوئے، دوسری جنگ عظیم کے دوران برما کے محاذ پر لڑتے رہے، تقسیم کے بعد آخری ''ٹیچ'' میں پاکستان آئے جن

دنوں ہماری شادی ہوئی ان کی پوسٹنگ کوہاٹ میں تھی اس وقت وہ کیپٹن تھے۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد ان کا تبادلہ نوشہرہ ہو گیا جہاں میں ان کے پاس شفٹ ہو گئی، دو سال بعد ہمارا پہلا بیٹا اعجاز الحق نوشہرہ ہی میں پیدا ہوا۔

ضیاء الحق کو ہر بچے کی پیدائش پر بہت خوشی ہوتی تھی۔ انہوں نے اعجاز الحق کی پیدائش پر سب دوستوں کو لڈو کھلائے بعد ازاں بچیوں کی پیدائش پر بھی انہوں نے اسی طرح خوشیاں منائیں۔ اکثر کہا کرتے تھے "بیٹیاں اور بیٹے مجھے یکساں عزیز ہیں" ہمارے گھر کا ماحول بہت اچھا تھا وہ گھر آ کر خوب باتیں کرتے بچوں کو روزانہ شاپنگ کے لئے لے کر جاتے' جب بچے سو جاتے تو پڑھنے بیٹھ جاتے' انہیں مطالعے کا بہت شوق تھا ان کے پاس دنیا جہاں کی کتابوں کا ذخیرہ تھا، ہر موضوع پر کتاب پڑھ لیتے تھے۔ اب بھی ان کی لائبریری کتابوں سے بھری پڑی ہے، لوگوں کی ان کے بارے میں رائے ہے کہ وہ "مولوی ٹائپ" تھے جبکہ ان میں مولویوں والی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ سیدھے سادھے مسلمان تھے۔ نماز باقاعدگی سے پڑھتے تھے۔ انہوں نے ہمیں ہر قسم کی آزادی دے رکھی تھی۔ کبھی کسی بات پر روکا ٹوکا نہیں' بچوں کو پڑھاتے بھی تھے لیکن ان کی مصروفیات کی وجہ سے بچوں پر زیادہ محنت مجھے کرنا پڑی جسے میں نے الحمدللہ نبھایا۔

ضیاء الحق کو گھومنے پھرنے کا بہت شوق تھا۔ ہم لوگ دو مرتبہ لندن سے "بائی روڈ" پاکستان آئے۔ ایک مرتبہ وہ امریکہ سے لندن آئے اور میں لندن پہنچ گئی وہاں سے ہم کار پر نکل کھڑے ہوئے۔ دوسری مرتبہ جب وہ اردن میں ٹریننگ دے رہے تھے تو وہاں سول وار شروع ہو گئی۔ میں بچوں کے ساتھ لندن اپنے بھائی کے پاس چلی گئی وہ بھی وہیں آ گئے۔ ہم لندن سے جرمنی گئے جہاں ہم نے "مرسڈیز" گاڑی خریدی۔ بعد ازاں اسی گاڑی پر ہم لمبے سفر پر نکل کھڑے ہوئے۔ اردن میں ہم نے بڑا شاندار وقت گزارا۔ شاہ حسین، ملکہ مونا اور پرنس حسن ہماری بہت عزت کرتے تھے۔ وہ لوگ ضیاء الحق کو بہت پسند کرتے تھے اکثر ہم لوگ ان کی طرف چلے جاتے۔ ملکہ مونا اور ملکہ نور دونوں بڑی شاندار خواتین تھیں۔ بڑی رواں اور خوبصورت عربی بولتی تھیں۔ پرنس حسن کی بیوی تو خیر تھی ہی پاکستانی اس سے گفتگو کر کے بڑا لطف آتا۔

۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران میں کوئٹہ میں تھی۔ ضیاء الحق لاہور آئے ہوئے تھے تو اچانک جنگ چھڑ گئی' اس کے بعد ہمارا ان سے رابطہ منقطع ہو گیا۔ پورے ۲۲ دن میں کوئٹہ میں پریشان رہی ہر وقت دل کو ایک دھڑکا لگا رہتا تھا لیکن اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے ۲۲ دن بعد ان سے

ملاقات ہو گئی جبکہ ۱۹۷۱ء کی جنگ کی اطلاع ہم لوگوں کو اردن میں ملی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اس دن ہمارے گھر پرنس حسن کا کھانا تھا کھانے کے بعد اچانک مرد حضرات ایک طرف ہو گئے ان کی سرگوشیوں اور چہرے کے تنے ہوئے اعصاب سے ہم خواتین کو تشویش ہوئی۔ مہمانوں کے جانے کے بعد جنرل ضیاء الحق نے مجھے بتایا" پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ شروع ہو گئی ہے مجھے فوراً پاکستان پہنچنا ہے اگر یہاں سے کوئی طیارہ ادھر نہ گیا تو دمشق سے روانہ ہونا پڑے گا۔" ضیاء صاحب جلدی پاکستان آ گئے اور مجھے اردن میں ٹھہرنا پڑا، پاکستان میں ان کی پوسٹنگ ملتان کر دی گئی۔ جنگ کے بعد وہ مستقلاً ملتان رہے پہلے ڈو کمانڈر بنے، پھر کور کمانڈر اور پھر یہیں سے چیف آف آرمی سٹاف بن کر راولپنڈی گئے۔

جنرل صاحب پیٹ کے بڑے پکے تھے۔ انہوں نے زندگی بھر دفتر کی کوئی بات گھر نہیں بتائی شاید آپ کو یقین نہ آئے کہ وہ اپنی ترقی تک کی خبر مجھے نہیں دیتے تھے۔ مجھے ان کی زیادہ تر "پروموشنز" کی خبریں مبارکباد کے ٹیلی فونز اور خطوط سے ملیں میں عموماً ایسے واقعات کے بعد ان سے لڑ پڑتی تھی لیکن وہ ہنس دیتے تھے۔ انہیں لالچ بالکل نہیں تھا وہ صدر بنے تو میں نے رو پیٹ کر انہیں بار بار تنگ کر کے اسلام آباد میں اپنا گھر بنوایا کیونکہ اس وقت تک ہمارے پاس سر چھپانے کے لئے اپنی چھت تک نہیں تھی۔ وہ دراصل زمین جائیداد کے قائل نہیں تھے۔ وہ کہتے تھے یہ سب کچھ بچے خود کر لیں گے۔ ان سب کو کون الگ الگ گھر بنا کر دے۔ افسوس ان کی شہادت کے بعد ان لوگوں نے پانچ گھروں کی تصاویر اخبارات میں شائع کر دیں جن میں ہمارا ذاتی گھر صرف ایک تھا باقی سب عزیز رشتے داروں کے تھے۔

جنرل ضیاء الحق کو اچانک آرمی چیف بنا دیا گیا۔ ان سے ۸ جرنیل سینئر تھے، آرمی میں یہ اصول نہیں ہے کہ چیف بناتے وقت سنیارٹی کا خیال رکھا جائے' جرنیلوں سے کسی بھی شخص کو چنا جا سکتا تھا۔ موجودہ آرمی چیف جنرل عبدالوحید کا تقرر بھی اسی اصول کے تحت ہوا ہے ان پر بھی ۸ سینئر جرنیل موجود تھے جو چناؤ میں نہیں آئے تو پھر جنرل ضیاء کے تقرر کو پتہ نہیں ان لوگوں نے کیوں ہوا بنا دیا۔ جب جنرل ضیاء آرمی چیف بنے تو کیا وہ سوچ سکتے تھے کہ ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ ایسا ہو گا یا وہ ایسا کریں گے؟ بھٹو کے ساتھ جو کچھ ہوا عدالت کے ذریعے ہوا جنرل صاحب خود جا کر ان کا مقدمہ تو نہیں سنتے تھے اور نہ ہی فیصلہ کرتے تھے۔

۵ جولائی ۱۹۷۷ء کے دن جب ملک میں مارشل لاء لگایا گیا میں لندن میں تھی میری بیٹی

''زین'' کے دل کا آپریشن تھا امراض قلب کے ماہر جنرل ذوالفقار میرے ساتھ تھے، ۴ جولائی کو زین کو اچانک بخار ہو گیا ہم لوگ بہت پریشان تھے بہرحال آپریشن ہو گیا۔ وہیں ہسپتال میں برطانیہ میں پاکستان کے سفیر مسٹر دولتانہ نے مجھے بتایا پاکستان میں اہم تبدیلیاں آئی ہیں پتہ نہیں کس نے ''ٹیک اوور'' کیا ہے اس وقت تک انہیں کچھ علم تھا اور نہ ہی مجھے ہاں البتہ میرے علم میں یہ بات ضرور تھی کہ نوابزادہ نصراللہ، پروفیسر غفور، آرمی اور بھٹو آپس میں مذاکرات کرتے رہے ہیں۔ ان مذاکرات کا کیا نتیجہ نکلا تھا مجھے اس وقت تک کچھ علم نہیں تھا، زین کے آپریشن کے بعد اسے نمونیا ہو گیا چنانچہ مجھے دو ماہ تک لندن رہنا پڑا اس دوران جنرل صاحب کا روزانہ فون آتا اگر کبھی فون نہ آیا تو خط ضرور ملتا تھا لیکن فون اور خط میں انہوں نے پاکستان میں آنے والی کسی تبدیلی کا ذکر تک نہیں کیا۔

مارشل لا لگانا آسان کام نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ کسی ایک بندے کے بس کی بات ہوتی ہے یہ ٹیم ورک ہوتا ہے۔ جنرل صاحب کے ساتھ آرمی کے بے شمار لوگ تھے کیونکہ اگر مارشل لا ناکام ہو جاتا تو وہ جان سے گئے تھے۔ پنڈی واپس آ کر میں آرمی چیف ہاؤس میں ٹھہر گئی جبکہ جنرل صاحب ایوان صدر میں اپنے دفتر' رات کو وہ ایوان صدر سے آرمی چیف ہاؤس آ جاتے۔ میری واپسی پر خوشامدیوں کا تانتا بندھ گیا۔ ان لوگوں کی تو آپ بات ہی نہ پوچھیں بعد ازاں بھٹو صاحب کے لئے بیرونی سربراہان کی طرف سے سفارشیں شروع ہو گئیں۔ اردن کے شاہ حسین سے ہمارے تعلقات بڑے اچھے تھے انہوں نے اس حوالے سے بھٹو کی رہائی کی درخواست کی، لیبیا سمیت دوسرے عرب ممالک سے بھی ٹیلیفون اور خطوط موصول ہوئے۔

بھٹو صاحب بہت اچھے شخص تھے، بہت بڑے لیڈر تھے، پڑھے لکھے اور ذہین، بولنے اور ملنے میں بہت شاندار لیکن جو قسمت میں ہوتا ہے اسے کون ٹال سکتا ہے جب پکڑ آ جاتی ہے تو... بیگم بھٹو بھی بڑی زبردست خاتون ہیں ضیاء الحق کے چیف بننے سے بہت پہلے راولپنڈی، کھاریاں اور ملتان میں میری ان سے کئی ملاقاتیں ہوئیں، وہ اچھی تھیں بااخلاق تھیں۔ بھٹو کی پھانسی سے قبل ہمیں کچھ پتہ نہیں تھا، کیا ہو رہا ہے ہاں البتہ اخبارات میں یہ ضرور پڑھتی تھی کہ فلاں بھٹو سے ملاقات کے لئے جا رہا ہے فلاں آ رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔ میں عموماً صبح فجر کی نماز کے بعد سو جاتی ہوں، جنرل صاحب جب دفتر جانے لگتے تو مجھے جگا کر بتاتے اور چلے جاتے، بھٹو کی پھانسی کے دن بھی وہ معمول کے مطابق دفتر گئے ان کے جانے کے بعد میں نے اخبارات پڑھے تو مجھے

معلوم ہوا، سچ مانیں بہت افسوس ہوا، بڑی طبیعت پریشان ہوئی یوں محسوس ہوا جیسے پورا ملک اُداس ہے۔ اس روز جنرل صاحب دیر تک دفتر رہے، یہ ان کے لئے بڑا مشکل دور تھا گھر واپس آئے تو نہ ہم نے ذکر کیا اور نہ انہوں نے کچھ کہا لیکن میرا خیال ہے انہیں افسوس تھا کیونکہ وہ انسان تھے ظالم تو نہیں تھے، اس سے قبل انہوں نے کبھی اشارتاً بھی بھٹو کی پھانسی کے حوالے سے بات نہ کی۔

جنرل ضیاء الحق، بھٹو اور ان کے خاندان کی بہت عزت کرتے تھے جب بے نظیر بھٹو انہیں گالیاں دیتیں اور بچے انہیں کہتے کہ ''ابو وہ آپ کو گالیاں دے رہی ہیں'' تو وہ ہنس کر کہتے'' وہ میری بیٹی ہے جو چاہے کہے'' انہوں نے کبھی بھی بھٹو خاندان کو برے الفاظ سے یاد نہیں کیا، اسی لئے جب ڈاکٹر نے نصرت بھٹو کو ملک سے باہر بھیجنے کا مشورہ دیا تو انہوں نے بڑے آرام سے اجازت دے دی۔

میں خود سمجھتی ہوں وہ نوے دن کے لئے آئے تھے لیکن عرصہ لمبا ہوتا چلا گیا یہ تو پتہ نہیں کہ ان پر کیا دباؤ تھا کیا بات تھی یا کیا مسائل تھے، مجھے اس بارے میں کچھ علم نہیں لیکن مجھے اتنا ضرور معلوم ہے وہ عام آدمی کے لئے بڑے اچھے سربراہ تھے۔ عام آدمی انہیں روک سکتا تھا جب صدر تھے تو گزرتے ہوئے کوئی جنازہ دیکھتے تو رک کر اسے کندھا ضرور دیتے۔ ان میں انکساری کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ میں ان کے انتقال کے بعد امریکہ گئی تو لوگوں نے ان کے حوالے سے وہی عزت دی۔ لندن میں بھی لوگ مجھے سابقہ گرم جوشی سے ملتے ہیں، آرمی کے تمام لوگ ان سے محبت کرتے تھے عام سپاہی بھی انہیں ''باباجی، باباجی'' کہہ کر پکارتا تھا۔ ان کے دور میں سارا ماحول بدل گیا' بچیاں سر ڈھانپ کر سکول جاتی تھیں، اسلامی اقدار کو ترویج ملی لیکن ان کی شہادت کے بعد دوبارہ شرائیں شروع ہو گئیں۔

جنرل صاحب بیک وقت صدر، وزیراعظم اور آرمی چیف رہے لہٰذا انہیں بہت کام کرنا پڑتا بعض اوقات پوری پوری رات کام کرتے رہتے، کم سوتے زیادہ جاگتے، عموماً ایک اور دو بجے کے دوران سوتے صبح سویرے جاگ جاتے۔ روزانہ خبرنامہ ضرور سنتے تھے اگر وقت نہ ملتا تو ٹی وی سے ان کے لئے خبرنامہ کی ٹیپ آ جاتی۔ نواز شریف کو بہت پسند کرتے تھے شاید انہوں نے دیکھا یہ اچھا پڑھنے والا بچہ ہے لہٰذا اسے سیاست میں لے آئے، نواز شریف سے تعارف جنرل جیلانی نے کرایا تھا۔

امریکہ جنرل ضیاء کے بہت خلاف تھا، جنرل صاحب اپنی مرضی کرتے تھے، سٹینڈ لے

لیتے تھے، امریکہ کو ان سے بہت فائدے پہنچے، روس ٹوٹ گیا، افغانستان میں روس کو شکست دی، مقصد پورا ہونے کے بعد امریکیوں نے ان کو مروا دیا، امریکی ہمیشہ دوستوں کا گلا کاٹتے ہیں، جنرل صاحب اسلامی بلاک بنانا چاہتے تھے۔ طیارے کی تباہی کا پروگرام پہلے سے طے تھا بس وہ لوگ موقع کی تاک میں تھے خود جنرل صاحب کو بھی معلوم تھا کچھ نہ کچھ ہوگا۔ اسلم خٹک میرے پاس کئی مرتبہ آئے اور محتاط رہنے کی تلقین کی۔ کئی بزرگوں نے بھی آنے والے خطرات سے آگاہ کیا لیکن کسی سربراہ کے لئے ہوائی سفر سے پرہیز ممکن نہیں ہوتا، ان کے طیارے میں کوئی ایسی چیز رکھی گئی تھی جس نے سب کو مفلوج کر دیا، پہلے پائلٹ مفلوج ہوا پھر دوسرے تمام لوگ اور وہ بے چارے تو طیارہ تباہ ہونے سے پہلے ہی ختم ہو چکے تھے، اس روز وہ معمول کے مطابق مجھے جگا کر گئے سب کچھ نارمل تھا۔ کوئی بات عجیب یا خلاف معمول نہ تھی لیکن پھر ان سے کبھی ملاقات نہ ہوئی، نہ لاش دیکھی، ان کا پوسٹ مارٹم تک تو ہونے نہیں دیا گیا' ان کا جنازہ بھی میں نے ٹی وی پر دیکھا، ان کی شہادت میں کوئی ایک شخص نہیں بہت سے لوگ ملوث ہیں اس میں ایئر فورس ہے، آرمی ہے اور بہت سے لوگ ہیں۔ صرف اسلم بیگ کا نام نہیں لیا جا سکتا' کس کس کو پکڑیں، فوج میں تو ایکسیڈنٹ ہو جائے تو واقعے کا پوسٹمارٹم کر کے رکھ دیا جاتا ہے انکوائریاں شروع ہو جاتی ہیں لیکن اس سانحہ میں اتنے جرنیل مر گئے پھر انکوائری کیوں نہیں ہوئی؟ میں نے احتجاج کیا تو مجھے جواب ملا' صدر کینیڈی کے قاتل کا پتہ نہ چل سکا تو جنرل ضیاء کا کیسے چلے گا'' ہماری قسمت دیکھیں ان کی شہادت کے بعد بے نظیر کی حکومت آ گئی اس نے انکوائری کرانا تھی؟ لیکن میرا ایمان ہے اللہ ضرور پوچھے گا کیونکہ انسان بھول بھی جائیں لیکن وہ نہیں بھولتا۔ بہت لوگوں کو حقائق کا علم تھا ایئر فورس کے کئی ینگ آفیسر میرے پاس آئے انہوں نے بہت کچھ بتایا لیکن بعدازاں ان کی دور دور پوسٹنگ کر دی گئی۔ اسحاق خان گیارہ برس تک شہید کے ساتھ رہے اچھی اچھی پوسٹوں پر کام کیا لیکن انہوں نے انکوائری کے لئے کیا کیا؟ میں اور میرے بچوں نے جب بھی ان سے بات کی انہوں نے جواب نہ دیا خاموش رہے، ہم نے حمید گل کو بھی خوب پکڑا لیکن انہوں نے بھی منہ نہ کھولا لیکن وہ منہ کیوں کھولیں؟ کیونکہ جس نے بھی منہ کھولا اسے موت آ گھیرے گی، لیکن مجھے کوئی پرواہ نہیں کیونکہ میرے خاوند نے شہادت کا رتبہ پایا، مجھے کئی لوگوں نے بتایا کہ انہوں نے مرحوم صدر کو مکہ مدینہ میں دیکھا ہے، ہر شخص نے انجام کو پہنچنا ہے جو یہاں نہیں بتاتے انہیں وہاں بتانا پڑے گا۔ نواز شریف نے بھی مرحوم کے لئے کچھ نہیں کیا جب ان کی حکومت آئی تو اعجاز نے بہت

شور مچایا خود میں نے کہا لیکن نواز شریف نے کہا بندیال صاحب انکوائری کر رہے ہیں، کسی نے کچھ نہیں کیا، کسی نے کچھ نہیں، ہمارے لئے ان کی شہادت ہی سب سے بڑا اعزاز ہے، ان کی قبر کتنی اچھی جگہ بنی، سب اللہ کی مہربانی ہے۔

مجھے سیاست بالکل پسند نہیں، اعجاز الحق کو لوگوں نے مجبور کیا یہ سیاست میں آ گیا' ٹھیک ہے اب آ گیا ہے تو سیاست کرے لیکن وہ چھوٹا انوار الحق، میں نے اسے کئی مرتبہ سمجھایا تم اپنا کام کرو لیکن وہ بھی سیاست میں گھسا ہوا ہے۔ سیاست میں ایک اصول ضرور ہونا چاہیے۔ بندہ جس کے ساتھ ہو پھر اسی کے ساتھ رہے۔ کبھی ادھر، کبھی ادھر والی بات اچھی نہیں۔ جب اسحاق خان اور نواز شریف کا معاملہ شروع ہوا تھا تو میں نے اعجاز الحق سے کہہ دیا تھا کہ تم نے نواز شریف کے ساتھ رہنا ہے۔

لوگ اب بھی صدر کی بیوی سمجھ کر میرے پاس آتے ہیں۔ ان بے چاروں کا خیال ہوتا ہے کہ میں پہلے کی طرح صاحب اختیار ہوں اور ان کی مدد کروں گی، مجھے بہت افسوس ہوتا ہے لیکن اب بھی خدا کا دیا بہت کچھ ہے میں ان لوگوں کی جس قدر ممکن ہو مدد کرتی ہوں۔ کچھ لوگ جو سرکاری عہدوں پر فائز ہیں حکومت کے خوف سے مجھے نہیں ملتے، کہتے ہیں ہماری گاڑیوں کے نمبر نوٹ کئے جاتے ہیں اور میں ہنس پڑتی ہوں..... میں اپنا مقدمہ خدا کی عدالت میں پیش کرتی ہوں کیونکہ وہی بہتر انصاف کرنے والا ہے۔

● ..... ● ..... ●

ایئر مارشل ذوالفقار علی خان

ایئر مارشل ذوالفقار علی خان پاکستان فضائیہ کے سربراہ اور امریکہ میں پاکستان کے سفیر رہے' ان کی زندگی بھی ایک دلچسپ سیاسی افسانہ تھی' یہ میری زندگی کا تیسرا انٹرویو تھا۔

......

میں ۱۰ دسمبر ۱۹۳۰ء کو لاہور میں پیدا ہوا میرے والد سول سروس میں تھے میرے بچپن کے دوران ان کی زیادہ تر پوسٹنگ مشرقی پنجاب میں رہی لہٰذا بچپن فیروز پور، کرنال اور روپڑ میں گزرا' میں جب ۱۴ برس کا ہوا تو مجھے ملٹری کالج جہلم میں داخل کرا دیا گیا، جہاں میرے بے شمار کلاس فیلوز میں جنرل اقبال اور جنرل غلام محمد بھی شامل تھے۔ وہ دور بہت زبردست تھا۔ ہم ہندو مسلمان اور سکھ مل کر پڑھتے تھے' ہمارے اساتذہ بھی مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے تھے' ان میں کچھ سویلین تھے اور کچھ یونی فارم میں۔ ہم روز صبح سویرے جاگتے تھے' سردیاں ہوں یا گرمیاں' ٹھنڈے پانی سے نہاتے تھے۔ کلاس رومز بڑے شاندار تھے' لائبریری زبردست تھی' پڑھائی میں بہت دل لگتا تھا۔ ہر دوپہر کھانے کے بعد ایک گھنٹے کی ریسٹ ضروری تھی اور شام کو ہم لوگ ہوم ورک کے لئے کلاس رومز میں اپنی مخصوص نشستوں پر بیٹھ جاتے تھے، جہاں استاد نہیں ہوتے تھے لیکن ہمیں ایمانداری سے ہوم ورک کرنا پڑتا تھا۔ بہت خوبصورت تھا بچپن ان مخصوص اور خوش قسمت لوگوں کی طرح جن کا بچپن واقعی شاندار ہوتا ہے۔

پاکستان بننے سے چند روز قبل میرے والد انبالہ کے ایس پی تھے وہاں سے ان کی پوسٹنگ گورداسپور ہو گئی' وہ اپنی فیملی کو انبالہ چھوڑ کر چلے گئے۔ چند روز بعد ملک تقسیم ہو گیا اور مشرقی پنجاب میں فسادات شروع ہو گئے۔ انبالہ میں والدہ اور چھوٹے بہن بھائی اکیلے تھے۔ میرے والد کے ایک دوست جو آرمی میں تھے' ہماری فیملی کو کار میں بٹھا کر دہلی لے آئے، جہاں سے وہ لوگ رائل ائیر فورس کے طیارے پر لاہور آ گئے۔ میں ان دنوں جہلم میں تھا، وہاں ہمیں فسادات کی خبریں مل رہی تھی۔ بڑی پریشانی ہوئی بہرحال فیملی کے خیریت سے پہنچنے کے بعد حالات معمول پر آ گئے۔ ۱۴ اگست ۴۷ء سے قبل گورداسپور پاکستان میں شامل تھا لیکن اچانک اسے بھارت کے

حوالے کر دیا گیا۔ میرے والد وہاں کے ایس پی تھے انہیں اس فیصلے سے بڑا جذباتی صدمہ پہنچا بعدازاں وہ بارڈر کراس کر کے پاکستان آ گئے یہاں آ کر وہ ایس پی سیالکوٹ رہے پھر ایس پی جھنگ بنے اور ۵۴ء میں ریٹائرڈ ہو گئے۔

میں نے ۴۸ء میں ایئر فورس جوائن کر لی۔ ٹریننگ کے بعد دسمبر ۵۰ء میں مجھے کمیشن ملا۔ پاکستان ایئر فورس کے اعلیٰ معیار کی وجہ سے صرف ۱۲ لڑکے پاس آؤٹ ہوئے ان میں سے چند چھوٹے عہدوں پر ریٹائر ہو گئے۔ چند کا ایئر کریش ہو گیا اور صرف میں ہائی رینک تک پہنچ سکا۔ میری پہلی پوسٹنگ فائٹر سکواڈرن ۹ میں ہوئی وہاں ڈیڑھ برس نوکری کے بعد میں فلائنگ انسٹرکٹر کے کورس پر چلا گیا۔ وہاں سے واپسی کے بعد رسالپور میں فلائنگ انسٹرکٹر لگ گیا۔ اس دور میں پاکستان ایئر فورس کے پاس صرف چار سکواڈرن تھے، جن میں تین فائٹر اور ایک ٹرانسپورٹ سکواڈرن تھا۔ تینوں فائٹر سکواڈرن پشاور میں ہوتے تھے جبکہ ایک میران شاہ میں، اس کا نام ''واچ اینڈ وارڈ'' تھا اور اس کا کام قبائلی علاقوں میں کسی بھی گڑبڑ کی صورت میں پولیٹیکل اتھارٹیز کی معاونت کرنا تھا۔ پھر جب جیٹ آ گئے تو میران شاہ کا سکواڈرن ختم کر دیا گیا۔ ۱۹۵۵ء میں مجھے ایف ۸۶ کی ایڈوانس فائٹر ٹریننگ کے لئے امریکہ بھیج دیا گیا۔ میرے ساتھ ایئر فورس کے چار اور آفیسر بھی تھے۔ ۵۵ء کے آخر میں ہم لوگ ٹریننگ لے کر واپس آ گئے اور ۵۶ء میں ہمیں امریکہ نے ایف ۸۶ طیارے اور دیگر دفاعی سامان دیا جس کے بعد پاکستان ایئر فورس مزید بہتر ہو گئی۔

۵۸ء کا مارشل لاء لگا تو میں سکواڈرن لیڈر تھا۔ اس دوران ہمیں آرمی نے قطعاً اعتماد میں نہیں لیا۔ نیوی کی صورتحال بھی ہم لوگوں سے مختلف نہیں تھی بس ہمیں اتنی اطلاع ملی کہ فیلڈ مارشل ایوب خان نے مارشل لاء لگا کر اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور بس ... اور ویسے بھی ہمیں مارشل لاء کے بارے میں زیادہ پتہ نہیں ہوتا، کیونکہ یہ ہمارا کام نہیں ہم لوگ صرف اور صرف اپنی پیشہ ورانہ مہارت تک محدود رہتے ہیں نہ ہمارے پاس سولجر ہوتے ہیں نہ ہتھیار لہٰذا ہم مارشل لاء قسم کی سرگرمیوں پر توجہ نہیں دے سکتے یہ آرمی کا کام ہے، جن کے پاس افرادی قوت ہوتی ہے، ہتھیار ہوتے ہیں، خود جنرلز بھی جب مارشل لاء لگانا چاہتے ہیں تو ہمیں بے ضرر سمجھ کر اعتماد میں لینے کی کوشش نہیں کرتے۔

۱۹۶۴ء میں مجھے ایئر اتاشی بنا کر دہلی بھیج دیا گیا۔ ۶۵ء کے وسط میں پاکستان اور بھارت کے درمیان تناؤ کی صورتحال پیدا ہو گئی۔ سرحدی سرگرمیاں تیز ہو گئیں۔ بھارتی

دارالحکومت میں رہ کر ہمیں صاف محسوس ہو رہا تھا کہ پاکستان اور بھارت میں جلد جنگ ہو گی۔ مقبوضہ وادی میں ہمارا فوجی ڈویژن گھس چکا تھا۔ بھارتی وزیراعظم لال بہادر شاستری لال قلعے میں کھڑے ہو کر صاف کہہ رہے تھے کہ جنگ کے لئے جگہ اور وقت کا انتخاب ہم کریں گے۔ سفارتی تقریبات میں بھی ہر شخص کے منہ پر پاک بھارت تناؤ کے قصے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ہم لوگ روزانہ دریائے جمنا کے کنارے کھڑے ہو جاتے اور ریلوے کراسنگ پر فراٹے بھرتی درجنوں ٹرینیں دیکھتے جن میں ٹینک، توپیں اور فوجی جوان لدے ہوتے تھے اور ان ٹرینوں کا رخ پاکستان بارڈر کی طرف ہوتا تھا اور ہم روزانہ ہی رپورٹ تیار کر کے پاکستان بھیجتے تھے۔ خود ہمارے ہائی کمشنر میاں ارشد محمود نے کئی خط لکھے جن میں بھارت کی جنگی تیاریوں اور بارڈر پر سرگرمیوں کا احوال تفصیلاً درج ہوتا تھا لیکن پاکستان میں ہماری رپورٹوں کو درخور اعتنا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ میں آج تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ ہماری حکومت نے جنگ کی مکمل تیاری کیوں نہیں کی؟ ہو سکتا ہے ہمارے اندازوں کے مطابق جنگ نہ ہوتی لیکن تیاری تو ہمارا فرض تھا۔ اب یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ہم لوگوں نے بالکل تیاری نہیں کی تھی کچھ تیاری تھی، لیکن اتنی نہیں تھی جتنی ہونی چاہیے تھی۔ ان دنوں بھارتی حکومت ہمارے ہائی کمشنر کو تقریباً روزانہ بلا کر ''پروٹسٹ نوٹس'' دیا کرتی تھی جب وہ واپس آتے تو ہم ان کے منتظر ہوتے اور وہ ہماری بے چینی دیکھ کر آتے ہی تفصیلاً بات چیت شروع کر دیتے۔

۶ ستمبر ۶۵ء کو بھارت نے ہم پر حملہ کر دیا، جس کے فوراً بعد ہم سب کو ''ہاؤس ریسٹ'' کر دیا گیا۔ صرف ہمارے ہائی کمشنر میاں ارشد محمود کو پاکستان ہاؤس میں رہنے کی اجازت دی گئی، جبکہ ہم لوگوں کو ہائی کمشنر آفس میں محصور کر دیا گیا جہاں ہم ایک ماہ سے زیادہ عرصہ تک بند رہے۔ وہ دن ہماری زندگی کے مشکل اور بے چین دنوں میں سے چند تھے کیونکہ ہر وقت دل کو ایک دھڑکا سا لگا رہتا تھا ہمارے پاس ریڈیو کے علاوہ کوئی ایسا ذریعہ نہیں تھا، جس سے ہمارا بیرونی دنیا سے رابطہ ہو سکتا، چنانچہ ان دنوں جو کچھ بی بی سی نے کہا، وائس آف امریکہ نے نشر کیا یا وائس آف جرمنی سے جو کچھ کہا گیا ہمارے پاس اسے تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ کبھی کبھار ریڈیو پاکستان کی نشریات بھی سننے کو مل جاتی تھیں، جس سے دل کو ڈھارس ہوتی تھی۔

آرمڈ فورسز کی تمام تر کوششوں کے باوجود پاکستان جنگ نہیں جیت سکا۔ ہم اسے فتح نہیں کہہ سکتے، کیونکہ جنگ کے بعد حالات وہی رہے۔ دراصل ۶۵ء کی جنگ ہمارے لحاظ

اندازوں کی ایک طویل سیریز تھی۔ ہمارا پہلا اندازہ تھا کہ اگر ہم نے کشمیر میں کچھ لوگ بھیج دیے تو کشمیری اٹھ کھڑے ہوں گے۔ ہمارا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ ہمارا دوسرا غلط اندازہ آپریشن جبرالٹر تھا۔ ہمارا خیال تھا ہم میجر جنرل اختر ملک کی قیادت میں جو فوجی ڈویژن مقبوضہ کشمیر بھیج رہے ہیں، اس کا ردعمل کشمیر تک محدود رہے گا اور بھارت اس کی بنیاد پر بین الاقوامی سرحد عبور کر کے پاکستان پر ہرگز حملہ نہیں کرے گا، لیکن ہمارا اندازہ غلط ثابت ہوا اور بھارت نے حملہ کر دیا۔ جنگ شروع ہونے کے بعد بھی غلطیاں جاری رہیں مثلاً شروع کی پلاننگ میں ایئر فورس اور نیوی سے مشورہ نہیں کیا گیا۔ نیوی کو ہو سکتا ہے کچھ علم ہو لیکن ہم لوگوں کو بالکل علم نہیں تھا۔ یہ جنگ دراصل پاکستان کے اندازوں کی ناکامی ہے۔

معاہدہ تاشقند سے پاکستانی عوام کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی جذباتی ٹھیس پہنچی، لیکن اگر عقلی سطح پر دیکھا جائے تو اس وقت ہمارے پاس کوئی دوسری چوائس نہیں تھی اس جنگ میں صرف دو آپشن تھے ایک صلح دوسری لڑائی۔ ہم لڑائی زیادہ دیر تک افورڈ نہیں کر سکتے تھے کیونکہ بھارت میں لڑائی کا زیادہ دم خم تھا۔ وہ ہم سے بڑا ملک تھا اس کے پاس فوجی زیادہ تھے بارود اور اسلحہ زیادہ تھا، جبکہ ہمارے پاس ان دونوں چیزوں کی کمی تھی اور اگر ہم لڑائی کو طول دیتے تو ہمارے پاس اسلحہ ختم ہو جاتا اور اس کے بعد ہم کس بنیاد پر صلح کی بات کرتے۔ اس کی مثال بالکل یوں ہے کہ دو آدمی آپس میں لڑتے ہیں ایک دوسرے کو زیر کر لیتا ہے تو وہ کہتا ہے آؤ صلح صفائی کی باتیں کریں تو کیا دوسرا یہ بات مان لے گا، لہٰذا صلح کے لئے برابری کی سطح ضروری تھی، لہٰذا ہم نے دوسری چوائس فوراً مان لی یہی اس وقت عقل مندی کا تقاضا تھا۔

۶۶ء کے آخر میں دہلی سے واپس پاکستان آ گیا۔ چند ماہ بعد مجھے ڈھاکہ میں بیس کمانڈر بنا دیا گیا۔ میں اپریل ۶۷ء میں ڈھاکہ پہنچا تو وہاں کی دنیا ہی کچھ اور تھی۔ میں پہلے پی اے ایف بیس کی بات کرتا ہوں۔ ڈھاکہ کے بیس مغربی پاکستان کے کسی بھی بیس سے مطابقت نہیں رکھتا تھا وہاں صرف ایک فائٹر سکواڈرن تھا۔ ملک کو بنے بیس برس ہو چکے تھے ان ۲۰ برسوں میں مغربی پاکستان کے بیسز نے جتنی ترقی کی ڈھاکہ میں اس کا شائبہ تک نظر نہیں آتا تھا۔ سارے نظام فرسودہ تھے۔ معیار انتہائی پست تھا۔ ہزار افراد کے لئے صرف ۸ میرڈ کوارٹر تھے۔ ڈیڑھ سو ایئر مین کے لئے سنگل بیرک تھی۔ باقی سارا عملہ ٹینٹوں میں رہتا تھا۔ مغربی پاکستان میں ہر بیس کے لئے جدید ترین انجن شاپ تھی اور ایئر فورس کے قانون کے مطابق جو شخص کھلی فضا میں جہاز کا

انجن کھولتا اس کا کورٹ مارشل ہو جاتا تھا لیکن مشرقی پاکستان میں انجن شاپ کا نام و نشان تک نہیں تھا لہٰذا چھوٹی موٹی خرابی کی صورت میں ''بھاشابٹ'' میں انجن کھول لیا جاتا تھا' جس کی چھتیں برسات میں ٹپکتی تھیں دوسرا پورے مشرقی پاکستان کی حفاظت کے لئے ۲۰ یا ۲۲ طیارے تھے جبکہ بھارت کی ایئر فورس نے ہمیں تین اطراف سے گھیر رکھا تھا۔ یہ حالات دیکھ کر میرا دل بہت دکھا اور میں نے ۲۲ اگست ۶۷ء میں ائر مارشل رحیم خان کو ایک تفصیلی خط لکھا جو بعد ازاں حمود الرحمان کمیشن میں پیش کیا گیا میں نے لکھا۔

There are secessionist tend-encies existing in East Pakistan- India will try to take advantage of it. India has very strong defensive positions in West Pakistan, and goes out for all quick victory in East Pakistan. What will be our Military response? Our theory that defence of East Pakistan lies on West Pakistan is totally wrong. we have only one Air field and one Squadron in East Pakistan where as Indians have Air field to our East, to our North and they gave Aireraft carrier so they can even attack in our South. We do not have any Raddar and early warning system. We can be struck from all the four directions without any warning. In stch an event our Air force will not Last more than 24 hours.

میرے اس خط کے پیچھے کسی قسم کی انٹیلی جنس رپورٹ نہیں تھی۔ یہ میرا ذاتی تجزیہ تھا اور میرے جیسا کوئی بھی شخص جو ۶۷ء میں ڈھاکہ ہوتا وہ ان حالات کی روشنی میں مستقبل کی پیشین گوئی کر سکتا تھا بشرطیکہ وہ محب وطن ہو اور اس میں کہنے کا حوصلہ ہو۔

ڈھاکہ میں اپنی ذمہ داریاں سنبھالنے کے چند روز بعد میں ڈھاکہ آفیسرز کلب گیا، جہاں کوئی ڈنر تھا۔ وہاں ایک بنگالی خاتون میرے پاس آئی اور اس نے کہا ''تم ایئر فورس کے نئے کمانڈر ہو'' میں نے کہا ہاں تو وہ بڑی نفرت سے بولی ''تم لوگ شہر پر جہاز اڑا کر ہمیں دھمکانا چاہتے ہو'' اس کے یہ ریمارکس سن کر مجھے بڑا دکھ پہنچا اور میں نے اسے کہا ہم اپنے لوگوں کو کیوں دھمکائیں گے پھر میں نے اسے سمجھایا کہ ہمارے ایئر فیلڈز ڈھاکہ شہر کے اندر ہیں لہٰذا ہمیں مجبوری کی حالت میں شہر آنا پڑتا ہے یہ ایک واقعہ تھا جس میں عقل مندوں کے لئے بہت سے

اشارے مضمر ہیں۔ بنگالیوں کے دلوں میں مغربی پاکستان کے لئے نفرت بڑی حد تک بڑھ چکی تھی' مجھے ایک واقعہ بڑی اچھی طرح یاد ہے ہمارا ایک جہاز طوفان میں پھنس گیا اس کے دو پائلٹ تھے ایک پنجابی دوسرا بنگالی۔ دونوں کھیتوں میں گر گئے' پنجابی کی پشت پر گہرا زخم آیا' دیہاتی بنگالی پائلٹ کو اٹھا کر لے گئے جبکہ پنجابی زخمی حالت میں کھیت میں پڑا رہا اور کسی ایک شخص نے بھی اسے پانی تک نہیں پلایا یہاں تک کہ امدادی ہیلی کاپٹر وہاں پہنچ گیا۔ میرے دور انئے میں تین ائرمینوں کو مار دیا گیا۔ ایک سینما دیکھ کر آ رہا تھا اور بنگالیوں کے ہتھے چڑھ گیا تیسرا بھی یوں ہی مارا گیا۔

ہمارا بنگالیوں کے ساتھ رویہ بہت خراب تھا۔ آپ اس ملک میں رہتے ہیں اور میں روز آپ کی بے عزتی کروں تو آپ اس کو اپنا ملک کہیں گے؟ نہیں' تو بنگالی پھر ہمارے ساتھ کیسے رہ سکتے تھے ہم نے وہاں جو حالات پیدا کر دیئے تھے ان میں کئی مجیب الرحمان پیدا ہو جاتے تو بعید نہیں تھا۔ ہمارا رویہ اس قدر ہتک آمیز تھا کہ مغربی پاکستان کے کئی انصاف پرست آفیسر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے تھے کہ "اگر ہم بنگالی ہوتے تو فوراً الگ ہو جاتے" ۶۷ء میں ہی حالات اس قدر بگڑ چکے تھے کہ نچلے گریڈوں پر کام کرنے والے افسروں اور عملے کو علیحدگی کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ہم نے ان دنوں ایک ونگ کمانڈر کو فیرویل پارٹی دی تو اس نے رخصت ہوتے وقت کہا میں اگر اگلی مرتبہ یہاں آیا تو مجھے یقیناً پاسپورٹ کی ضرورت پڑے گی۔

بھارت نے نومبر ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا تو کئی مشیروں نے اعلیٰ حکام کو مشورہ دیا مغربی پاکستان کو اس بنیاد پر جنگ میں نہیں کودنا چاہیے لیکن ہم لوگوں نے کہا کہ ہمارے ملک پر حملہ ہو چکا ہے' لہٰذا ہمیں فوراً جواب دینا چاہیے اگر ایسا نہ کیا گیا تو کل کو سندھ پر حملہ ہوا تو پنجاب ساتھ نہیں دے گا اور اگر پنجاب پر چڑھائی کی گئی تو سرحد ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے گا۔ اسی کشمکش میں دو ماہ گزر گئے۔ بالآخر دسمبر کے آخر میں مغربی پاکستان کی طرف سے بھارت پر حملے کا فیصلہ کیا گیا۔ میں ان دنوں ڈائریکٹر آپریشنز تھا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ پاک فضائیہ حملے کا آغاز کرے گی۔ ہمارا جہاز شام کو باڈر کراس کر کے بھارتی علاقے میں بم گرائے گا اور اس کے بعد آرمی حملہ کر دے گی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ہمارا طیارہ بھارت پر حملے کے لئے تیار کھڑا تھا۔ ہم لوگ پائلٹ کو ہدایات دے رہے تھے وہاں صدر پاکستان جنرل یحییٰ خان تشریف لے آئے اور میں نے دیکھا وہ نشے میں بری طرح دھت تھے۔ میرا دل ڈوب گیا اور میں نے اپنے آپ سے کہا دیکھو یہ وہ شخص ہے جو پاکستان کا سربراہ ہے یہی وہ شخص ہے جو افواج پاکستان کا سپریم کمانڈر ہے اور اس

کے ایک اشارے پر ہمارے لاکھوں جوان جنگ میں کودنے والے ہیں اور یہ ...

۷۱ء کی جنگ میں بھارت کی دفاعی منصوبہ بندی بہت بہتر تھی کیونکہ انہوں نے بھرپور تیاری کے ساتھ یہ حملہ کیا تھا۔ ۶۵ء کی جنگ میں ہمارا دفاعی تناسب کم تھا لیکن ۷۱ء میں یہ "گیپ" بہت بڑھ گیا' کیونکہ ان لوگوں نے ۶۵ء کے بعد ہنگامی سطح پر تیاریاں شروع کر دی تھیں' ان کے مقابلے میں ہمارے وسائل بہت کم تھے اگر ہم اپنا دفاعی بجٹ بھارت کے برابر کر دیتے تو پاکستان کی ساری معیشت تباہ ہو کر رہ جاتی' ان کے جوان لاکھوں کی تعداد میں زیادہ تھے۔ ان کے پاس ایک ہزار لڑاکا جہاز تھے انہوں نے مشرقی پاکستان میں ۸ ڈویژن فوج اور فضائیہ کے ۱۰ اسکواڈرن لگا رکھے تھے' جبکہ ان کے مقابلے میں ڈھاکہ میں ہمارا صرف ایک سکواڈرن تھا۔ مغربی پاکستان کی طرف ان کی دفاعی پوزیشنز اس قدر مضبوط تھیں کہ ہمیں انہیں توڑنے کے لئے اکثر محاذوں پر ۳ اور بعض جگہوں پر ۴ گنا فورس کی ضرورت تھی' کچھ ہم نے لڑائی میں بھی دیر کر دی تھی' رہی سہی کسر مشرقی پاکستان کی فوجی قیادت نے پوری کر دی۔ اگر ہم مشرقی پاکستان میں اپنی فوجی طاقت پھیلانے کے بجائے ڈھاکہ میں محصور ہو جاتے تو ہم زیادہ عرصہ تک لڑ بھی سکتے تھے اور ہماری شکست بھی اتنی بدترین نہ ہوتی' اگر آپ ڈھاکہ کا نقشہ دیکھیں تو اسے دریائے ڈھاکہ نے گھیر رکھا ہے اور یہ دریا بالکل سمندر جیسا ہے' اسے عبور کرنا کسی بھی آرمی کے لئے ممکن نہیں۔ علاوہ ازیں سرحد سے ڈھاکہ تک راستے میں بھی کئی دریا پڑتے ہیں' جنہیں عبور کرنے کے لئے وقت اور مہارت کی ضرورت ہے' اگر ہم بھارت کو ان مسائل کا شکار کر دیتے تو ہمیں بہت سا وقت مل جاتا لیکن افسوس یہ سب کچھ نہ ہو سکا۔

بنگلہ دیش کی علیحدگی کا معاملہ "پوائنٹ آف نو ریٹرن" تک پہنچ چکا تھا۔ یہ کسی ایک فرد کی غلطی نہیں تھی' اس کے پیچھے غلطیوں اور حماقتوں کی ایک طویل قطار ہے اور ۷۱ء تک پہنچتے پہنچتے یہ معاملہ بے قابو ہو چکا تھا اور اس وقت خود مجیب الرحمان بھی چاہتا تو ملک نہیں بچ سکتا تھا کیونکہ شدت پرستی اس کی مجبوری بن چکی تھی' ادھر مغربی پاکستان میں سب کو علم تھا کہ بنگالی ہمارے ساتھ نہیں رہیں گے' لیکن وہ اس کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ بنگالی ۶ نکات پیش کرتے۔ یحییٰ خان وغیرہ انہیں پڑھتے اور کہتے اچھا تم الگ ہونا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے ہو جاؤ کیونکہ اس صورت میں یہاں ان کی کھالیں اتر جاتیں' کچھ لمحے ایسے ہوتے ہیں جن کے نتائج کا آپ کو علم ہوتا ہے لیکن آپ کچھ نہیں کر سکتے۔ حالات کا ساتھ دینا آپ کی مجبوری بن جاتا ہے شاید

یحییٰ خان کے لئے بھی۔

اے، وجنگ کے حوالے سے مجھے ایک بات بہت تنگ کرتی ہے، ان دنوں ہمارے کچھ حکام اعلان کیا کرتے تھے کہ ہم پاک سرزمین کی ایک انچ زمین دشمن کو نہیں دیں گے لیکن جب انہوں نے ہتھیار ڈالے تو ڈھاکہ میں جنرل اروڑہ کا پرتپاک استقبال کیا گیا میں ان دنوں اپنے جنرلوں کے بیان سن سن کر حیران ہوتا تھا ٹھیک ہے ایک جوان کا مورال بلند ہونا چاہیے کہ دشمن کے دس فوجی بھی آ گئے تو میں اکیلا نبٹ لوں گا لیکن جب آپ اعلیٰ عہدے پر ہوتے ہیں جہاں لاکھوں افراد کی زندگیاں ایک شخص کے اشارہ چشم سے بندھی ہوتی ہیں تو آپ کو حقیقت پسند ہونا چاہیے۔ پھر دشمن کی زبردست تیاری اور دفاعی بالادستی دیکھنے کے باوجود آپ خوابوں کی دنیا میں زندگی گزار رہے ہیں کیوں؟ مجھے آج تک اس کی سمجھ نہیں آئی۔

مجھے آج بھی یاد ہے جی ایچ کیو کے آپریشن سنٹر میں ہم لوگ بیٹھے تھے ہمارے کمانڈر چیف ایئر مارشل رحیم خان باہر آئے اور کہا ''شوز از اوور'' اور اس کے بعد پاکستان دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ہماری آرمی کا ایک بڑا حصہ جنگی قیدی بن گیا اور ایک قوم تاریخ کے اندھیروں میں گم ہو گئی۔

اس جنگ میں میرا چھوٹا بھائی کیپٹن نوازش علی خان ڈھاکہ کے کسی محاذ پر ہمیشہ کے لئے ہمارا ساتھ چھوڑ گیا۔ والدہ کو اس کی شہادت کا سن کر بہت صدمہ ہوا ہم بڑی کوششوں کے باوجود اس کی لاش دریافت نہ کر سکے پھر کچھ عرصہ بعد کسی نے آ کر والدہ سے کہہ دیا کہ اس نے ریڈیو پر اس کا انٹرویو سنا تھا اور وہ شہید نہیں ہوا، بلکہ جنگی قیدی ہو کر بھارت کے قبضے میں ہے تو دوبارہ آس سی لگ گئی۔ میرے بڑے بھائی جنرل سعادت علی خان نے بڑی دوڑ دھوپ کی لیکن آخر میں یہ اطلاع غلط ثابت ہوئی اے، کی جنگ جہاں پاکستان کی تاریخ پر انمٹ نقوش چھوڑ گئی وہاں اس نے ہماری زندگی کی کتاب پر بھی ایک گہرا دکھ تحریر کر دیا۔

جنگ کے بعد ذوالفقار علی بھٹو نے اقتدار سنبھال لیا۔ وہ بہت ذہین' تیز اور موقع شناس تھے۔ انہوں نے دیکھا قوم بالکل ہمت ہار چکی ہے تو انہوں نے دوبارہ اسے حوصلہ دیا۔ ملک میں اسلامی سربراہی کانفرنس بلائی' یورپ اور امریکہ سے رابطہ منقطع کر کے اسلامی بلاک بنانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ پاکستانی دوبارہ باوقار قوم بننے لگے۔ پھر ۷۴ء میں بھارت نے ایٹمی دھماکہ کر دیا تو پاکستانی مورال دوبارہ زمین پر آ گرا۔ یہ دیکھ کر بھٹو نے ایٹمی طاقت بننے کا اعلان کر

دیا۔ ہم نے ایٹمی پلانٹ کے لئے دوڑ دھوپ شروع کر دی قوم ایک بار پھر پاؤں پر آ کھڑی ہوئی۔ میں صرف اس وجہ سے بھٹو کی عزت کرتا تھا اور کرتا رہوں گا کیونکہ میرا ذاتی خیال ہے، اگر اے، کی جنگ کے بعد پاکستان کو کوئی کمزور لیڈر ملتا تو آج پاکستان جنوبی ایشیا میں سری لنکا، بھوٹان، مالدیپ، بنگلہ دیش اور نیپال جیسا ملک ہوتا صرف بھٹو کی وجہ سے آج پاکستان برصغیر میں بھارتی دباؤ کا مقابلہ کرنے والا واحد ملک ہے۔

بھٹو سے میری پہلی ملاقات ۷۲ء میں لاہور کے گورنر ہاؤس میں ہوئی۔ میں ان دنوں سرگودھا کا بیس کمانڈر تھا۔ مصطفیٰ کھر گورنر پنجاب تھے تو انہوں نے سرگودھا کے افسران کو ڈنر دیا وہاں بھٹو سے تعارف ہوا انہوں نے سرگودھا بیس کے بارے میں پوچھا بعد ازاں ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ۷۶ء میں جب امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر پاکستان آئے تو بھٹو نے مجھے کہا ''تم بھی میرے ساتھ گورنر ہاؤس لاہور چلو اور کسنجر سے دفاعی ساز و سامان کے لئے بات کر لو'' بھٹو امریکہ سے کچھ دفاعی سامان خریدنا چاہتے تھے۔ میں ان کے ساتھ چلا گیا وہاں کسنجر سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھ سے دفاعی ضروریات کے بارے میں پوچھا' میں نے بتا دیا ہمیں ایئر کرافٹ کے علاوہ اینٹی شپنگ میزائلز، اینٹی ٹینک میزائلز اور لیزر گائیڈڈ بم چاہیے تو کسنجر نے کہا ٹھیک ہے تم یہ سب کچھ لے لو لیکن ایٹمی پلانٹ چھوڑ دو تو میں نے جواب دیا سر میں ائر چیف ہوں میری معلومات صرف فضائیہ تک محدود ہیں۔ اس سلسلے میں وزیراعظم ہی فیصلہ کر سکتے ہیں تو ڈاکٹر ہنری کسنجر بھٹو کی طرف مڑے اور کہا۔

Prime Minister.

We Have Taken A Lenient View About Your Reprocessing Plant But We Did Not Know What Would Be The Attitude Of the Next Government

مجھے محسوس ہوا کہ ایٹمی پلانٹ کے حوالے سے بھٹو پر شدید دباؤ ہے۔ واپسی پر میں نے بھٹو کو خط لکھا کہ آپ ہتھیاروں کے بدلے ایٹمی پروگرام ترک نہ کیجئے گا، کیونکہ یہ ہماری بقاء کی ضمانت ہے۔

حمود الرحمان کمیشن کی رپورٹ تیار ہوئی تو آرمی اور نیوی نے بھٹو سے کہا کہ اسے نہیں چھپنا چاہیے لیکن میں نے زور دے کر کہا کہ رپورٹ عوام کے سامنے آنی چاہیے کیونکہ جب عام

جوان یا چھوٹے آفیسر کی غلطی پر اس کا کورٹ مارشل ہو جاتا ہے تو پھر ایسے جرنیلوں کے چہرے عوام کے سامنے کیوں نہیں لائے جاتے جنہوں نے پاکستانی تاریخ کی بدترین غلطیاں کیں۔ میں نے جب زور دیا تو بھٹو نے مجھے لاڑکانہ طلب کیا میں ہیلی کاپٹر پر وہاں گیا تو وہ لان میں ٹہل رہے تھے مجھے بھی ساتھ بلا لیا۔ وہاں بھٹو نے پوچھا تم حمود الرحمان رپورٹ کی اشاعت پر زور کیوں دے رہے ہو۔ تو میں نے کہا سر رپورٹ شائع نہ ہوئی تو آرمڈ فورسز میں کورٹ مارشل کی غیر جانبداری مشکوک ہو جائے گی تو انہوں نے کہا جب آرمی اور نیوی رپورٹ خفیہ رکھنے پر زور دے رہی ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں تم یہ معاملہ ختم کر دو پھر جب میں مایوس ہو کر وہاں سے واپس آنے لگا تو بھٹو نے کہا لیکن ایئر چیف مارشل میں تمہیں یہ بتا دوں میرے بعد لوگ کہیں گے بھٹو نے رپورٹ اس لئے شائع نہیں کرائی تھی کہ وہ خود اس میں ملوث تھا اور ہم دونوں نے قہقہہ لگایا۔

ایئر مارشل اصغر خان نے حکومت کے خلاف سروسز چیف کو خط لکھے اور وہ بھٹو تک پہنچ گئے تو انہوں نے مجھے بلا کر حکم دیا تم فوراً اصغر خان کا کورٹ مارشل کرو۔ میں یہ سن کر حیران ہو گیا لیکن میں نے انہیں سمجھایا' سر اصغر خان ایئر فورس سے ریٹائر ہو چکے ہیں' ان کا اب فضائیہ سے کوئی تعلق نہیں اور اگر انہوں نے کوئی جرم کیا ہے تو ان کے خلاف عوامی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے۔ جنرل ضیاء جو اس وقت وہاں تھے نے فوراً کہا۔ سر پتہ نہیں ایئر چیف مارشل کورٹ مارشل سے کیوں ہچکچا رہے ہیں، جبکہ اصغر خان کے خلاف ثبوت بھی موجود ہیں۔ مجھے جنرل ضیاء کے یہ ریمارکس بہت بُرے لگے اور میں نے کہا آپ نے اب تک کتنے ریٹائرڈ جرنلوں کا کورٹ مارشل کیا ہے جبکہ بہت سے اس کے حقدار بھی تھے۔ بھٹو یہ سن کر مسکرائے اور کہا آپ اصغر خان کا کورٹ مارشل کیوں نہیں کرنا چاہتے؟ میں نے عرض کیا سر اصغر خان ریٹائر ہو چکے ہیں۔ دوسرا ایئر فورس میں ان کی بہت عزت ہے' میرے اس اقدام سے فضائیہ پر بُرے اثرات مرتب ہوں گے۔ انہوں نے کہا ویل ایئر چیف مارشل اگر آپ محسوس کرتے ہیں کہ یہ فضائیہ کے لئے برا ہو گا تو میں آپ کو اس کے لئے کبھی نہیں کہوں گا۔

۷۷ء کے شروع میں جب نسیم ولی خان نے پشاور سے پی این اے کی احتجاجی مہم شروع کی تو کابینہ کے اجلاس میں بھٹو نے کہا کراچی اور حیدر آباد کے بعد پشاور میں بھی مارشل لاء لگا دینا چاہیے تو جنرل ضیاء نے فوراً مشورہ دیا وہاں ائر چیف مارشل ذوالفقار یہاں موجود ہیں انہیں کہیں شہر میں مارشل لاء لگا دیں تو میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مارشل لاء لگانے والا ایئر کمانڈر بڑا

بے وقوف ہو گا کیونکہ ہمارے پاس جوان نہیں' اسلحہ نہیں اور یہ تو نہیں ہو سکتا کہ میں اپنے انجینئرز' ایئر مینز اور ٹیکنیشنز کو بندوقیں پکڑا کر سڑکوں پر کھڑا کر دوں، بھٹو میری بات سمجھ گئے اور انہوں نے اس کے بعد اصرار نہیں کیا۔

بھٹو کی کابینہ کے ایک وزیر نے مجھے لکھا کہ میں اس کے بیٹے کو سعودی عرب جانے والے گروپ میں شامل کر دوں۔ اس کا کہنا تھا کہ اس نے وزیراعظم سے بھی بات کر لی ہے اور وہ اس کی منظوری دے چکے ہیں۔ مجھے اس کے تحکمانہ طرز تکلم پر بڑا غصہ آیا۔ میں نے سعودی عرب جانے والے گروپ کی فہرست منگوائی' وزیر کا بیٹا فضائیہ کے قواعد کے مطابق اس گروپ میں شامل تھا لیکن میں نے ایئر سیکرٹری کو حکم دیا اس شخص کا نام فہرست سے خارج کر دو بعد ازاں میں کیبنٹ میٹنگ میں شرکت کے لئے مری گیا اور بھٹو کو ساری واردات بتا دی' وہ ہنسے اور کہا' میں تمہاری کارروائی پر خوش ہوں' یہ شخص ہے ہی بہت نامعقول' اس نے مجھ سے بیٹے کی سفارش کی تو میں نے یہ کہہ کر مسترد کر دی کہ ائر چیف مارشل کا معاملہ ہے' تم نے ٹھیک کیا۔ بھٹو میں معقول بات سننے اور اس پر عملدر آمد کی بڑی خوبی تھی۔

۴ جولائی ۱۹۷۷ء کو میں نتھیا گلی میں تھا۔ رات کے ۹ بجے مجھے بھٹو کا ٹیلی فون آیا اور انہوں نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ ''ایئر چیف مارشل تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے دوبارہ الیکشن کا فیصلہ کر لیا ہے۔'' میں نے کہا سر یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے پھر اسی رات تین بجے میرے اے ڈی سی نے مجھے جگایا اور کہا جنرل ضیاء الحق لائن پر ہیں اور آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں، میں نے ٹیلی فون اٹھایا اور ریسیور سے جنرل ضیاء کی آواز آئی ''ایئر چیف مارشل ہم نے عارضی طور پر ٹیک اوور کر لیا ہے۔'' میں نے کہا یہ آپ نے کیا کیا بھٹو تو ری الیکشن کا فیصلہ کر چکے تھے انہوں نے خود رات مجھے فون کر کے بتایا تھا یقیناً آپ کو بھی انہوں نے فون کیا ہو گا تو جنرل ضیاء بولے آپ صبح میرے دفتر تشریف لائیں میں آپ کو تفصیلاً بتاؤں گا۔ اگلی صبح میں جنرل ضیاء کے دفتر گیا تو انہوں نے ایسا ویسا تھا کا راگ الاپنا شروع کر دیا۔

مارشل لاء کے چند روز بعد میں چکلالہ میں تھا تو مجھے مری سے بھٹو کا فون آیا میں نے فون ریسیو کیا تو وہ کہنے لگے میں نے جنرل ضیاء سے رابطے کی کوشش کی لیکن وہ دفتر میں نہیں ہیں۔ اچھا ہوا تم مل گئے۔ کیا تم کل میرے پاس آ سکتے ہو؟ تو میں نے کہا کہ سر اگر آپ سہولت محسوس کریں تو انہوں نے ہنس کر کہا نہیں اب تو آپ نے اپنی سہولت دیکھنی ہے بہر حال انہوں نے کہا تم

کل ساڑھے دس بجے آجاؤ۔ فون بند ہونے کے بعد میں نے جنرل ضیاء سے رابطہ کیا تو وہ دفتر میں موجود تھے مجھے بڑی حیرت ہوئی' میں نے انہیں بتایا کہ بھٹو کا فون آیا تھا اور وہ آپ سے بات کرنا چاہتے تھے لیکن آپ شاید موجود نہیں تھے۔ انہوں نے مجھے صبح ساڑھے دس بجے بلایا ہے تو جنرل ضیاء نے کہا ''بڑی اچھی بات ہے آپ جائیں'' میں نے کہا جناب میں کیوں جاؤں آپ جائیں' وہ بات تو آپ ہی سے کرنا چاہتے تھے۔

جنرل ضیاء نے ہنس کر کہا آپ اور مجھ میں کیا فرق ہے' چلے جائیں تو میں نے جواب دیا۔ ''آپ اور مجھ میں یہ فرق ہے کہ آپ نے مارشل لاء لگایا اور میں نے نہیں لگایا لہذا میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ وہ کچھ پوچھیں اور میں انہیں جواب دے سکوں۔'' بہرحال اگلی صبح ساڑھے دس بجے میں ہیلی کاپٹر کے ذریعے مری پہنچ گیا جہاں بھٹو ہاؤس اریسٹ تھے۔ جنرل اختر عبدالرحمن نے مجھے ریسیو کیا بعدازاں میں اندر چلا گیا بھٹو سے ملاقات ہوئی' انہوں نے ملکی اور غیر ملکی صورتحال پر تفصیلاً لیکچر دیا' میں نے انہیں بڑا مطمئن پایا' کافی چائے چل رہی تھی اور سگار پئے جا رہے تھے۔

میری یونیفارم میں ضیاء الحق سے آخری ملاقات بڑی زبردست تھی۔ ریٹائرمنٹ سے چند روز قبل میں جنرل ضیاء سے ملنے گیا' میں نے انہیں کہا، جب میں جون میں ایران گیا تو شاہ ایران نے مجھے بلا کر کہا تھا تم بھٹو کے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟ تو میں نے انہیں کہا بھٹو کا کیس عدالت میں چل رہا ہے اور کورٹ ہی اس کا فیصلہ کرے گی تو شاہ ایران نے کہا کہ مجھے امید ہے کہ تم لوگ اسے قتل نہیں کرو گے؟ تو میں نے کہا نہیں سر' تو شاہ نے کہا دیکھو ڈاکٹر مصدق کے حامی صرف پانچ فیصد تھے آرمی میری تھی' عوام میرے تھے لیکن میں نے پھر بھی ڈاکٹر مصدق کو قتل نہیں کیا بعدازاں میں نے جنرل ضیاء سے کہا آپ کو یاد ہوگا میں نے آپ کو ترکی کے ہیڈ آف تھری سٹاف جنرل سی سنجار سے اپنی ملاقات کی رپورٹ پیش کی تھی جس میں اس نے کہا تھا کہ آپ لوگ ہمارے دوست ہیں چنانچہ آپ کو مشورہ دیتا ہوں بھٹو کو قتل نہ کرنا کیونکہ ہم چاہتے تو عدنان مینڈرس کو قتل کر سکتے تھے لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔ پھر میں نے جنرل ضیاء کو انڈونیشیا کی مثال دی جہاں ۶۵ء میں جنرل سہارتو نے سکارنو کا تختہ الٹ کر اقتدار پر قبضہ کر لیا' ملک میں بڑا خون خرابہ ہوا لیکن آرمی نے سکارنو کو قتل نہیں کیا اور اسے ہاؤس ریسٹ کرنے کے بعد پوچھا گیا کہ تم کون سی بیوی کو اپنے پاس رکھنا چاہو گے تو اس نے سری دیوی طلب کی۔ آخر میں جنرل ضیاء کو میں نے الجیریا کی مثال دی'

جہاں آرمی نے ٹیک اوور کیا اور بن بیلا کو معزول کر دیا گیا' اسے بھی اوور تھرو کے بعد قتل کرنے کے بجائے ایک ویلا میں ہاؤس ریسٹ کر دیا گیا اور اس قید کے دوران اس نے شادی بھی کی تو میں نے جنرل ضیاء الحق سے کہا آپ بھی بھٹو کو قتل کرنے کی بجائے نتھیا گلی کے گورنر ہاؤس میں بند کر دیں...... لیکن جنرل ضیاء بالکل خاموش رہے انہوں نے ہاں کہی اور نہ ہی ناں اور یہ ملاقات ختم ہو گئی۔

جنرل ضیاء کا فیصلے کرنے کا اپنا انداز تھا مثلاً ملک میں انتخابات کے لئے ملٹری کونسل کا اجلاس طلب کیا گیا' ہم سب لوگ بیٹھے ہوئے تھے' جنرل ضیا آئے اور کہا میں نے انتخابات ملتوی کر دیئے ہیں۔ مجھے بہت غصہ آیا کیونکہ میں انہیں اکثر لکھا کرتا تھا جو سیاستدانوں کا کام ہے ہمیں وہ ان پر چھوڑ دینا چاہیے' خود وہ بھی اسی قسم کے وعدے کرتے آرہے تھے، میں نے انہیں کہا' اگر فیصلہ آپ نے کرنا تھا تو کونسل کیوں بلائی گئی۔

بھٹو کی پھانسی پاکستانی تاریخ کی ''گریٹ ٹریجڈی'' ہے۔ میں طویل سوچ بچار کے باوجود یہ نہیں سمجھ سکا کہ بھٹو جیسے ذہین آدمی جس کی تمام معاملات پر نظر تھی اور وہ خود عوام میں بھی بہت مقبول تھا، اس سے ایسی غلطیاں کیسے ہو گئیں جن کے باعث وہ اس قدر تکلیف دہ انجام کو پہنچا۔ میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ انہوں نے فیڈرل سیکورٹی فورس کیوں بنائی اور اگر بنائی تو اس میں مسعود محمود جیسے بدقماش لوگوں کو کیوں لگایا جن کی بری عادات سے بھٹو خود بھی واقف تھے اور پھر اسی مسعود محمود نے بھٹو کے خلاف گواہی بھی دی۔ بھٹو کے ایک قریبی ساتھی (نام نہیں بتانا چاہ رہا) نے مجھے بتایا کہ اس نے ایک مرتبہ بھٹو سے پوچھا ''آپ نے ان لوگوں کو فیڈرل سیکورٹی فورس میں کیوں لگا رکھا ہے جن کے کردار کے بارے میں آپ خود بھی واقف ہیں'' تو بھٹو نے کہا یہ میرے بازو ہیں کیونکہ یہ لوگ میرے لئے وہ کچھ کر سکتے ہیں جو آپ لوگ بھی نہیں کر سکتے۔ میں آج تک یہ بھی نہیں سمجھ سکا کہ بھٹو نے اپنے اقتدار کی عمارت بیوروکریسی اور آرمی پر کیوں استوار کی۔ مارشل لاء لگنے کے بعد ہم نے چیف الیکشن کمشنر سجاد علی جان کو بلایا تو اس نے بتایا کہ الیکشن کی ابتدائی رپورٹوں میں ۳۰، ۳۲ حلقوں کے نتائج آئے تھے اور اگر وہ ساری کی ساری نشستیں بھی اپوزیشن کو چلی جاتیں تو بھی بھٹو بھاری اکثریت سے جیت جاتے تو پھر بھٹو کو جھوٹے لوگوں پر اعتماد کی کیا ضرورت تھی؟ میں اس واقعے کا بھی گواہ ہوں جب بھٹو کو پھانسی لگانے والوں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔ ''سر نہ صرف ہم آپ کے وفادار ہیں بلکہ ہماری آنے والی نسلیں بھی آپ کی وفادار رہیں گی۔'' اور یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ بھٹو ان تمام حقائق سے ناواقف تھے کیونکہ میں نے خود کسی

سے سنا تھا کہ جب ایک کمشنر نے انہیں غلط نتائج پیش کئے تو بھٹو نے کہا تم مجھے پھانسی پر لٹکانا چاہتے ہو۔ مجھے نہیں معلوم مستقبل کا مورخ اس ٹریجڈی کے بارے میں کیا فیصلہ کرے گا لیکن ایک بات طے ہے بھٹو کے اس افسوسناک انجام میں بیوروکریسی اور آرمی نے بڑا کردار ادا کیا۔

ریٹائرمنٹ کے بعد میں نے ضیاء کی افغان پالیسی کے خلاف لکھنا شروع کر دیا تو انہوں نے دو تین مرتبہ بلایا، ملاقاتیں ہوئیں جن میں ہم اپنا اپنا موقف بیان کرتے رہے، میں ان سے کہتا امریکی ویتنام کا بدلا چکانا چاہ رہے ہیں، جنگ کے بعد یہ لوگ واپس چلے جائیں گے اور ہمارے لئے بہت سے مسائل رہ جائیں گے۔ ایسی ہی ایک ملاقات کے آخر میں جنرل ضیاء نے کہا آپ کو تو مجھ سے بہت اختلافات ہیں لیکن میرے دل میں آپ کی بڑی عزت ہے اور میں نے ہنس کر ان کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے بعض حساس معاملات پر میری رائے لینے کے لئے مجھے دو ایک مرتبہ اور بھی بلایا جس کا میں آپ کے سامنے ذکر نہیں کر سکتا پھر جنرل ضیاء ہی نے ۷۹ء میں مجھے سفیر بنا کر سوئٹزرلینڈ بھیج دیا شاید انہوں نے اس ملک کو بے ضرر سمجھا۔ میں وہاں سے ۸۰ء کے بعد واپس آیا پھر بے نظیر بھٹو نے اپنی پہلی حکومت میں ۸۹ء کو مجھے امریکہ میں سفیر بنا کر بھیج دیا۔ وہاں میں ستمبر ۹۰ء تک رہا۔ بے نظیر حکومت کے خاتمے کے اگلے ہی روز میں سفارت سے مستعفی ہو گیا۔ یہاں ایک دلچسپ بات کا ذکر کرتا چلوں کہ میں مستعفی ہونے کے بعد پاکستان آ گیا لیکن ہمارے اخبارات میں یہ خبریں شائع ہونا شروع ہو گئیں کہ ایئر چیف مارشل ذوالفقار علی خان امریکہ سے واپس نہیں آنا چاہتے، وہ سفارت میں توسیع کے لئے کوششیں کر رہے ہیں وغیرہ وغیرہ اور میں اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر یہ خبریں پڑھتا اور پاکستانی پریس کی انفارمیشن پر قہقہے لگاتا...... کسی ایک رپورٹر کے ذہن میں بھی نہیں آیا کہ وہ یہاں اسلام آباد میں میرے گھر فون کر کے پتہ کر لے میں کہاں ہوں؟

اور اب میں اسلام آباد کے جی ۴ بلاک میں اپنے گھر میں مزے سے زندگی گزار رہا ہوں، اخبارات پڑھتا ہوں، دنیا کی تازہ ترین کتابوں کا مطالعہ کرتا ہوں، کافی پیتا ہوں اور اپنے شاندار ماضی کی سنہری یادوں کا لطف لیتا ہوں کیونکہ یہی بہترین مشغلے ہیں۔

شمیم قریشی

شمیم قریشی صاحب ایک حیران کن شخص تھے۔ان سے میرا تعارف ایک پامسٹ کی حیثیت سے ہوا لیکن جب گفتگو شروع ہوئی تو معلوم ہوا وہ تو برصغیر کی تاریخ ہیں۔ میں نے ۱۹۹۵ء میں ان کا انٹرویو شروع کیا۔ یہ سلسلہ ۱۹۹۶ء تک جاری رہا۔ جب یہ انٹرویو شائع ہوا تو اس نے تہلکہ مچا دیا۔ میں آج تک مختلف اخبارات' رسائل اور ٹیلی ویژن پروگراموں میں اس انٹرویو کی بازگشت سنتا ہوں۔ آپ کو اس انٹرویو میں بیک وقت ایک عام انسان' ایک صوفی' ایک دست شناس اور ایک مورخ ملے گا۔ شمیم قریشی صاحب بھی ایک ایسے انسان تھے جنہوں نے میری شخصیت پر بڑے گہرے اثرات چھوڑے۔

......

وہاں جموں شہر میں ایک حکیم صاحب تھے۔

کبھی کسی ہائی سکول میں ہیڈ ماسٹر ہوا کرتے تھے۔ ایک بار لاہور گئے تو ساتھیوں کے ساتھ داتا دربار چلے گئے وہاں ان پر کیا گزری اس کے بارے میں جموں کے کسی شخص کو کچھ معلوم نہیں تھا لیکن جب وہ واپس آئے تو ایک بالکل مختلف انسان تھے۔تن من سے بے گانہ' کپڑے پھٹے ہوئے' بال گرد سے اٹے ہوئے اور منہ سے رال کی تاریں نکل نکل کر سینے پر گر رہی تھیں' وہ لاہور سے آ کر اپنے گھر کے تھڑے پر بیٹھ گئے اور پھر باقی ساری زندگی وہیں گزار دی۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے مستقبل میں جھانکنے کی حس سے نواز رکھا تھا' لوگ دور دور سے آتے اور ان کے قریب بیٹھ جاتے جب حکیم صاحب پر مخصوص کیفیت طاری ہوتی تو لوگ باری باری اپنی عرض پیش کرتے حکیم صاحب چند لفظوں میں اس کا جواب دے دیتے۔ میں ان دنوں جموں میں رہتا تھا۔ ہمارا گھر ان کے تھڑے کے بالکل سامنے تھا۔ میں بالکونی میں بیٹھ کر سارا دن حکیم صاحب کا جائزہ لیتا رہتا' کئی بار میرا جی چاہا میں نیچے اتر کر ان کے پاس بیٹھوں' ان کی باتیں سنوں لیکن میرے اندر اتنی ہمت پیدا نہ ہوئی' ویسے بھی چھ برس کا لڑکا جو اپنے والدین کی شفقت سے بھی محروم ہو وہ اتنی ہمت کر بھی کیسے سکتا تھا؟ ایک دن گرمیوں کی دوپہر کو میں نے دیکھا۔ حکیم صاحب کے پاس کوئی نہیں بس تھڑے پر وہ اپنے ہی بول و براز میں لتھڑے پڑے ہیں اور ہزاروں مکھیاں ان پر بھنبھنا رہی ہیں۔ اس وقت میرے اندر نہ جانے کہاں سے اتنی ہمت آ گئی کہ میں سیڑھیاں اتر کر ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے انہوں نے ''بیر بوٹی'' جیسی آنکھوں سے مجھے گھور کر دیکھا اور کہا ''تو بھی دیکھے گا۔'' ''دیکھے گا تو بھی'' اور ساتھ ہی مکھیوں کی چادر اوڑھ کر لیٹ گئے اور میں ان کے لفظ پلے باندھ کر وہاں سے واپس آ گیا پھر زندگی کے ایک طویل عرصے تک یہ لفظ

میرے ''پلے'' سے ہی بندھے رہے کیونکہ میری فراست انہیں سمجھنے سے قاصر تھی۔

میں ایک محروم بچہ تھا۔ میرے والدین میں ان بن تھی چنانچہ میرے ''پڑھاکو'' تایا جی ہی میرے سب کچھ تھے ان کی کتابوں سے دوستی تھی اور میری ان سے انہوں نے مجھے بہت بچپن میں گلستان، بوستان، رامائن، بائبل اور قرآن مجید پڑھا دیا تھا' وہ خود سکول چھوڑنے جاتے تھے اور واپسی پر بھی میرے ساتھ ہوتے تھے۔ راستہ بھر مجھے کتابوں کی باتیں سناتے رہتے تھے۔ بہت بڑے شطرنج باز بھی تھے۔ ہر شام ان کی بیٹھک میں لمبی لمبی بازیاں ہوتی تھیں۔ بڑے بڑے لوگ آتے تھے۔ انہی محفلوں میں میری ملاقات اصغر خان کے والد بریگیڈیئر رحمت اللہ' شیخ رشید اور بھارتی افسانہ نویس لال ذاکر سے ہوئی۔ اس دور میں گرمیوں میں کشمیر کا دارالحکومت جموں سے سری نگر منتقل ہو جاتا تھا۔ گرمیوں میں میری ماں انگلی پکڑ کر مجھے سرینگر لے جاتی۔ سرینگر وہ سکول میں پڑھاتی تھی۔ اس سکول کی پرنسپل محمودہ احمد علی شاہ جیسی زبردست خاتون ہوتی تھی۔ وہ ایک ڈھلتی عمر کی شاندار عورت تھی۔ اس میں ایسی کشش تھی کہ جو بھی دانشور' شاعر' ادیب یا حسن جمال سے بھرا سیاست دان ان سے ملتا وہ ان سے بار بار ملاقات پر مجبور ہو جاتا۔ یہ شاندار عورت مجرد زندگی گزار رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا تو میری ماں سے مجھے مانگ لیا۔ یوں میں محمودہ احمد علی شاہ کے گھر آ گیا۔ یہ ایک وسیع و عریض اور سجا سجایا گھر تھا جس میں ایک دیوار سے دوسری دیوار تک اداسی' خاموشی اور ویرانی کے ڈیرے تھے۔ بیگم محمودہ اس اداسی کے بیچ و بیچ بڑی سی چوبی کرسی پر کتاب پکڑے بیٹھ جاتی اور میں اس کے کندھے سے کندھا لگا کر حیرانی سے گردوپیش کو دیکھتا رہتا تھا۔ بعض اوقات بیگم محمودہ کا گھر آباد ہو جاتا تھا' بے شمار لوگ ان کے پاس آتے' یہ لوگ بڑی بڑی گاڑیوں میں آتے' انہوں نے شاندار سوٹ پہنے ہوتے تھے مگر بیگم صاحبہ کے پاس آ کر خاموشی سے بیٹھ جاتے تھے۔ وہ دیوی بن کر جب رسان سے انہیں دیکھتیں تھیں' یہ لوگ رات گئے تک وہاں بیٹھے رہتے تھے۔ اس دوران یہ لوگ سگریٹ پھونکتے جاتے' قہوہ پیتے رہتے اور سامنے بیٹھی دیوی کو عقیدت بھری نظروں سے دیکھتے رہتے۔ میں بچہ تھا لہذا مجھے ایک عرصہ تک معلوم نہ ہوا کہ سامنے کونے میں بیٹھا وہ شخص جو خاموشی سے سگریٹ پھونکے جا رہا اور جس کے چہرے پر تحیر کی کئی تہیں جمی ہوئی ہیں اس کا نام فیض احمد فیض ہے' اس کے قریب بیٹھا خوبصورت نوجوان ایم ڈی تاثیر ہے اور سلیٹی شیروانی اور ترکی ٹوپی والا شخص غلام محمد صادق ہے اور وہ جو ابھی ابھی سائیکل پر آیا تھا لوگ اسے شیخ عبداللہ کہتے ہیں۔ میں ان لوگوں کو اس وقت نہیں جانتا تھا لیکن جب زمانہ انہیں

جانے لگا تو میں نے فوراً نعرہ لگایا میں تو انہیں اس وقت سے جانتا ہوں جب یہ گلیوں میں پیدل پھرا کرتے تھے اور انہیں کوئی نہیں جانتا تھا۔

میں بارہ برس کا تھا جب مجھے بتایا گیا پاکستان بن چکا ہے' یہ کیا ہوتا ہے میں نے بیگم محمودہ سے پوچھا' انہوں نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا ''ابھی تو یہ کچھ بھی نہیں لیکن شاید آنے والے وقتوں میں کچھ بن جائے۔'' میں ابھی اپنے ذہن میں ابھرنے والے سوالوں کے جواب تلاش کر ہی رہا تھا کہ ایک دن سری نگر میں فوج آ گئی ''پٹیالہ فرسٹ فورس'' پھر مجھے بتایا گیا کہ اوپر پہاڑوں پر جنگ ہو رہی ہے۔ پاکستان اور بھارت لڑ رہے ہیں۔ میں روز لال چوک پر شیخ عبداللہ کو دھاڑتے ہوئے دیکھتا ''بزدل پاکستانی بھاگ رہے ہیں ہم آزاد ہیں' آزاد رہیں گے کوئی کشمیری پاکستان کا ساتھ نہیں دے گا وغیرہ وغیرہ۔ پھر شام کو اسی چوک پر گاڑیوں میں لدی بیسیوں لاشیں آتیں جن کے کندھوں پر ''پٹیالہ فرسٹ فورس'' کے بیج سجے ہوتے' ان بیجوں سے خون رس رہا ہوتا تھا۔ پھر شہر میں اعلان ہوتا کہ ظالم پاکستانیوں نے ہمارے ۳۵ جوانوں کو ہلاک کر دیا ہے ہم ان لاشوں کا بدلہ لیں گے' وغیرہ وغیرہ۔

شاید وہ ۴۸ء کا کوئی دن تھا جب ہم لوگ ٹرک میں سوار ہو کر سیالکوٹ پہنچے اس ہجرت کی وجوہات کیا تھیں؟ راستے میں کیا صعوبتیں برداشت کیں؟ پاکستان آ کر کیا مسائل درپیش آئے؟ یہ لمبی اور غیر دلچسپ کہانی ہے بہرحال پاکستان آ کر میرے والدین کے اختلافات طلاق تک پہنچ گئے' والد نے والدہ کو طلاق دی اور واپس کشمیر چلے گئے وہاں انہوں نے دوسری شادی کر لی' والدہ نے بھی جلد ہی عقد ثانی کر لیا۔ باقی رہا میں' تو میں اپنے تایا جی کے پاس راولپنڈی آ گیا۔ یہیں سے میں نے ۵۰ء میں میٹرک کیا۔ والدین سر پر تھے نہیں تایا جی بیمار رہتے تھے لہذا مجبوراً میں نے ۵۰۱ ورکشاپ میں ''ڈیلی ویجز'' پر نوکری کر لی' میری دو روپے روزانہ تنخواہ ہوتی تھی' کام صبح سے رات بارہ بجے تک کرنا پڑتا تھا لیکن مجبوری تھی سو یہ سب کچھ کرنا پڑا لیکن میں نے اس ساری تنگی ترشی اور روزانہ کام کی ساری تلخی کے باوجود پرائیویٹ طور پر اپنی تعلیم جاری رکھی۔

۱۶ اکتوبر ۵۱ء کو لیاقت علی خان نے لیاقت باغ میں جلسہ عام سے خطاب کرنا تھا۔ میں سری نگر میں محمودہ احمد علی شاہ کے گھر میں لیاقت علی سے مل چکا تھا لہذا مجھے ان کی تقریر سننے کا شوق چرایا' میں صبح سویرے ہی گھر سے نکل کھڑا ہوا ابھی کرسیاں لگائی جا رہی تھیں' شامیانے سیٹ کئے جا رہے تھے' میں جلسہ گاہ پہنچ گیا اور سٹیج کے بالکل سامنے پہلی رو میں ایک کرسی پر قبضہ کر لیا۔ چند

لمحے بعد میرے دائیں طرف ایک پٹھان آ کر بیٹھ گیا' اس کے ساتھ اس کا چھوٹا سا بیٹا بھی تھا' میں نے اسے غور سے دیکھا تو وہ سید اکبر تھا' میں اسے سری نگر سے جانتا تھا' یہ لوگ افغانستان سے ہجرت کر کے سری نگر آئے تھے۔ ڈل گیٹ میں رہتے تھے' میں ان کے خاندان کے اکثر بچوں کو جانتا تھا' میں نے سید اکبر کو سلام کیا اور سری نگر کا حوالہ دے کر گفتگو شروع کر دی' وہ مجھے پٹھانوں کے روایتی تپاک سے ملا اور اپنے بیٹے سے میرا تعارف کرایا' ہم نے سری نگر کی باتیں شروع کر دیں' مجھے وہ گفتگو کا بڑا ماہر' متحمل مزاج اور پُر خلوص انسان لگا۔ ہم باتوں میں اس قدر محو تھے کہ ہمیں پتہ ہی نہیں چلا کہ لوگ کب آنا شروع ہوئے' پنڈال کب بھرا' سٹیج پر مسلم لیگی رہنما کب تشریف لائے اور جلسہ کب شروع ہوا البتہ سید اکبر کبھی کبھی انکھیوں سے سٹیج کی طرف ضرور دیکھ لیتا تھا۔ پھر جلسہ شروع ہو گیا۔ سٹیج سیکرٹری نے کارروائی شروع کی' ایک ایک مسلم لیگی رہنما تالیوں اور نعروں کے شور میں ڈائس پر آتا اور دھواں دھار تقریر جھاڑ کر واپس چلا جاتا یہاں تک کہ وزیر اعظم خان لیاقت علی خان کا نام پکارا گیا' وہ مسکراتے ہوئے اپنی نشست سے اُٹھے' ڈائس پر آئے' ہاتھ ہلا ہلا کر عوام کے نعروں کا جواب دیا' جب عوام کا شور تھما تو خان لیاقت علی خان نے کہا'' میرے عزیز ہم وطنو! السلام وعلیکم'' اور ساتھ ہی میری بغل میں بیٹھا سید اکبر اٹھا اور ''ڈب'' سے ریوالور نکال کر لیاقت علی خان پر گولی چلا دی' میری آنکھوں کے عین سامنے سید اکبر نے ریوالور کی چھ گولیاں وزیر اعظم پاکستان کے سینے میں اتار دیں۔ لیاقت علی خان نے چیخ ماری اور خون میں لت پت ہو کر گر پڑے' جلسہ گاہ میں بھگدڑ مچ گئی' لوگ اٹھ کر بھاگنے لگے' اسی اثناء میں سٹیج پر کھڑا پولیس افسر لوگوں کو پھلانگتا ہوا سید اکبر کے پاس پہنچا' سید اکبر نے بڑے تحمل سے اپنا خالی پستول اس کے ہاتھ میں دے دیا لیکن پولیس افسر نے اسے گولی مار دی' سید اکبر کے منہ سے بڑی کربناک چیخ نکلی اور وہ میرے قدموں میں گر کر تڑپنے لگا' اتنے میں وہاں برچھی بردار رضا کار پہنچ گئے' پولیس افسر نے انہیں دیکھ کر حکم دیا'' اس ذلیل انسان کے ٹوٹے ٹوٹے کر دو'' اور پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے رضا کاروں نے اپنی برچھیوں سے سید اکبر کی لاش کا قیمہ بنا دیا۔ چند لمحے بعد وہاں سید اکبر کی لاش کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے' دور تک پھیلی لہو کی لکیریں' الٹی سیدھی کرسیاں' شامیانوں کی ٹوٹی تنابیں تاحد نظر بکھری ٹوپیاں اور جوتے پڑے تھے جبکہ سٹیج پر ''سابق'' وزیر اعظم کی آڑھی ترچھی لاش اور اس کے بالکل سامنے میں' سید اکبر کا بیٹا اور وارث خان کا ایک بے ڈھول قصاب ساکت کھڑے تھے' چیخ میرے ہونٹوں پر جمی تھی اور آنسو سید اکبر کے بیٹے کی پلکوں پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ پولیس

آفیسر نے اسکی کھوپڑی کو ٹھوکر ماری اور میرے قریب آ کر ریوالور میری طرف لہرا کر کہا'' یہ لو پستول اور جب تم سے پوچھا جائے تو کہنا سید اکبر بھاگ رہا تھا لیکن میں نے اسے پکڑ لیا تمہیں پیسے ملیں گے۔'' یہ لفظ میں نے سنے ضرور لیکن میرے ساکت جسم میں کوئی حرکت نہ ہوئی' پولیس آفیسر میری آنکھوں میں سکتے کی کیفیت پڑھ کر آگے بڑھا اور اپنا پستول وارث خان کے قصاب کے ہاتھ میں پکڑا دیا...... بعد ازاں اس قصاب کو اس بہادری پر ۲۰ ہزار روپے انعام ملا لیکن میں ایک عرصے تک بستر پر پڑا رہا' موت کا یہ پہلا تجربہ تھا جو میرے شعور اور لاشعور پر بری طرح درج ہو گیا۔

۱۹۵۲ء میں مجھے ایئر فورس میں کمیشن مل گیا۔ چھ ماہ تک مجھے چک لالہ میں ٹریننگ دی جاتی رہی' اس وقت یہ سارا کام ڈچ خواتین کرتی تھیں۔ یہ لمبی لمبی خوفناک سی خواتین تھیں جو معمولی معمولی غلطی پر ہماری باقاعدہ ٹھکائی کر دیتی تھیں۔ میں ٹیک آف اور فلائنگ میں تو ''ماسٹر'' ہو گیا لیکن لینڈنگ کے دوران مجھ سے کوئی نہ کوئی غلطی ہو جاتی تھی جس پر میری ڈچ انسٹرکٹر مجھے ''ٹھڈے'' مارتی تھی۔ یوں میں ایئر فورس سے ''فیڈ اپ'' ہو گیا اور چھوڑ کر واپس آ گیا۔ میں وہاں سے گرا تو سیدھا ''کوہ نور ملز'' میں آ اٹکا' یہ پبلک ریلیشن آفیسر کی نوکری تھی' ساڑھے پانچ سو روپے تنخواہ تھی۔ میرے پاس سائیکل تھی اور ٹیڑھے میڑھے راستے تھے...... یہیں سے میری زندگی کا نیا باب شروع ہوا۔

ایک دن مجھے مل کے سیکرٹری مقبول حسین نے بلا کر کہا' ہمارے ایک دوست لندن سے آئے ہیں انہیں کچہری سے کچھ کاغذات چاہئیں تفصیل اس لفافے میں بند ہے آپ کچہری سے لا کر میرے گھر پہنچا دیجئے گا۔ میں نے فوراً سائیکل لی اور حکم کی بجا آوری کے لئے عدالت چلا گیا' کام لمبا تھا لہٰذا تین چار گھنٹے لگ گئے۔ شام کو میں مقبول حسین کے گھر گیا تو ڈرائنگ روم میں ایک خوش شکل جوان بیٹھا تھا' اس کا استری شدہ سوٹ تازہ شیو اور میچنگ ٹائی اس کے اعلیٰ ذوق کی ترجمان تھی' میں سلام کر کے ان کے پاس بیٹھ گیا۔ اتنے میں مقبول صاحب افراتفری میں اندر سے نکلے اور مجھ سے کہا'' یہ میر بشیر ہیں آپ یہ کاغذات انہیں دے دیں'' اور ساتھ ہی اندر بھاگ گئے' میں نے حیرانی سے مہمان کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا کر بولے'' ان کے گھر بیٹا پیدا ہونے والا ہے' سب کام اللہ کی مہربانی سے خوش اسلوبی سے ہو جائے گا' یہ خواہ مخواہ پریشان ہیں۔'' ان کی بات سن کر میں حیران ہو گیا کیونکہ کوئی شخص اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتا ہے کہ فلاں شخص کے گھر چند لمحے بعد بیٹا پیدا ہو گا۔ میں اس ادھیڑ بن میں تھا کہ مقبول صاحب اندر سے خوش خوش نکلے اور کہا'' بشیر

صاحب مجھے مبارک دیں اللہ نے مجھے بیٹا دیا ہے۔'' میر بشیر نے مسکرا کر گردن ہلا دی' مقبول صاحب میری طرف مڑے اور کہنے لگے شمیم' بشیر صاحب دنیا کے نامور پامسٹ ہیں انہیں ہاتھ دکھا کر جانا۔'' میں نے اسے بھی حکم حاکم سمجھا اور جانے سے قبل اپنے دونوں ہاتھ میر بشیر کے سامنے پھیلا دیئے' وہ چند لمحوں تک میرے ہاتھوں پر جھکے رہے اور پھر سیدھے ہو کر کہنے لگے'' شمیم صاحب آپ کو اللہ تعالیٰ نے مستقبل میں جھانکنے کی صلاحیت سے نواز رکھا ہے' آپ فوراً ہماری فیلڈ میں آ جائیں'' اور میں نے ایک قہقہہ لگایا اور سائیکل پر بیٹھ کر سیٹی بجاتا ہوا گھر آ گیا۔

تھوڑے عرصے بعد مجھے لندن سے ایک پیکٹ موصول ہوا جس سے پامسٹری کی چند کتابوں کے ساتھ میر بشیر کا مختصر سا خط نکلا۔'' جناب آپ نے ابھی تک پامسٹری سیکھنا شروع نہیں کی؟'' میں نے کتابیں اور خط ایک طرف رکھ دیا۔ کچھ عرصے بعد بیوی کے ساتھ میرے تعلقات خراب ہو گئے' بگاڑ بڑھا اور نوبت طلاق تک آ گئی تو میں پریشانی کی حالت میں میر بشیر کی بھیجی کتابیں کھول کر بیٹھ گیا۔ شروع شروع میں کچھ سمجھ نہ آئی لیکن میں پڑھتا چلا گیا' ایک آدھ مہینے کی مشقت کے بعد مجھے بنیادی لائنوں کا پتہ چل گیا' کچھ عرصے بعد میر بشیر نے مجھے مزید کتابیں بھیج دیں' میں وہ بھی ''چٹ'' کر گیا تو ہاتھوں میں دوسروں کے ہاتھ دیکھنے کی کھجلی سی ہونے لگی۔ چند لوگوں کے ہاتھ دیکھ ڈالے کچھ سچ ثابت ہوا کچھ غلط نکلا لیکن اس کام میں مزا آنے لگا' اسی دوران ایک اور واقعہ پیش آیا۔ ہمارے سیکرٹری کے بھائی کا ایک کیس کیمل پور (اٹک) کی عدالت میں چل رہا تھا' وہاں کا سیشن جج مقبول حسین کا واقف کار تھا' اسے پامسٹری میں دلچسپی تھی' میں جب وہاں جاتا تو اس کے چیمبر میں اکثر میری ملاقات کیمبل پور کالج کے ایک نوجوان لیکچرار اور جیل سپرنٹنڈنٹ جو کرنل تھا' سے ہو جاتی' وہ تینوں سر جوڑے دست شناسی پر گفتگو کر رہے ہوتے' میں ایک کونے میں بیٹھ کر سنتا رہتا۔ ایک دن ان تینوں نے فیصلہ کیا کہ آج عدالت میں قتل کا جو مجرم پیش ہو رہا ہے' اس کا ہاتھ دیکھا جائے۔ وہ تینوں اٹھے تو میں بھی ان کے ساتھ ہو گیا۔ عدالت کے احاطہ میں بینچ پر وہ مجرم بیٹھا تھا' ہم چاروں باری باری اس کے ہاتھ پر جھک گئے۔ ان تینوں کا متفقہ فیصلہ تھا' یہ بے گناہ ہے اور بچ جائے گا جبکہ میں نے کہا یہ بے گناہ ہے لیکن پھانسی پر چڑھ جائے گا۔ ان تینوں نے مجھ سے پوچھا۔ ''کیا آپ بھی پامسٹ ہیں؟'' میں نے فوراً نفی میں سر ہلا دیا تو ان تینوں نے قہقہہ لگایا اور ہم واپس چیمبر میں آ گئے...... وہ نوجوان لیکچرار معروف پامسٹ ایم اے ملک تھا بعد ازاں اس بے گناہ شخص کو پھانسی کی سزا ہو گئی تو سیشن جج نے مجھے بلا کر پوچھا

''آپ نے یہ پیش گوئی کس بنیاد پر کی تھی؟'' میں نے اس کے ہاتھ کا وہ سائن بتا دیا جس پر ان تینوں کی نظر نہیں گئی تھی...... یوں میری پہلی پیش گوئی سچ ثابت ہوئی' اس سے دست شناسی سے میری رغبت میں اضافہ ہو گیا' میر بشیر سے خط و کتابت شروع ہو گئی' وہ لندن سے میری رہنمائی کرنے لگے' ان کے تجربے میں جو بھی حیرت انگیز کیس آتا' وہ مجھے بھیج دیتے' ساتھ ہی ہر نئی کتاب بھی مجھے پارسل کر دیتے اور میں کتاب پڑھ کر انہیں اپنی رائے بھیج دیتا۔

ایوب خان کے مارشل لاء کے کچھ عرصے بعد دارالحکومت کراچی سے اسلام آباد منتقل ہو گیا۔ ابھی شہر آباد نہیں ہوا تھا۔ عمارتیں اور رہائش گاہیں نہ ہونے کے برابر تھیں چنانچہ حکومت نے عارضی کام چلانے کے لئے تمام ریسٹ ہاؤسز اور فالتو عمارتیں خالی کروا کر وزیروں کو دے دیں۔ کوہ نور کا ریسٹ ہاؤس بھی اس حکم کی زد میں آ گیا اور وہاں ایک نوجوان وزیر آ ٹھہرا۔

میں اس ریسٹ ہاؤس کا انچارج تھا لہٰذا ہر دوسرے تیسرے دن اس نوجوان وزیر سے میری ملاقات ہو جاتی' میں اس کی رعب دار شخصیت' خوبصورت انگریزی اور سلیقے سے بہت متاثر ہوا' اس کی میموری بڑی شاندار اور مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اس قسم کی ایک ملاقات کے دوران میں نے اس کا ہاتھ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو اس نے کہا'' آر یو اے پامسٹ'' میں نے اثبات میں سر ہلا کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا' اس کا ہاتھ بہت ہی عجیب تھا۔ پہلی انگلی اتنی لمبی تھی کہ دوسری کی انتہا کو چھو رہی تھی یہ سائن اس کے تفاخر' غرور' حصول طاقت اور اختیار کی شدید خواہش ظاہر کر رہا تھا جبکہ اس کے دماغ کی لکیر شمس کی طرف جھکی ہوئی تھی' ہتھیلی کے عین درمیان میں ایک بڑا سا کراس اور زندگی کی لکیر کے ساتھ زہرہ پر مریخ کا نشان تھا' میں نے بڑے آرام سے کہہ دیا' آپ ترقی کے آسمان تک جائیں گے۔ پورے ملک میں آپ کا کوئی حریف نہیں ہو گا لیکن آپ کی موت جیل میں ہو گی' اس نوجوان نے غصے سے اپنا ہاتھ واپس کھینچا اور مجھے گھورتا ہوا باہر چلا گیا...... دنیا اس شخص کو ذوالفقار علی بھٹو کے نام سے جانتی ہے۔

جنگ اخبار میں میرا ایک دوست ہوتا تھا ''شہزادہ'' اس کی والدہ ایرانی تھی' اس کے پاس آسٹرالوجی اور پامسٹری کے چند خاندانی ''نسخے'' تھے' میں اس کے پاس اکثر جایا کرتا تھا' بڑی شفیق خاتون تھیں' میری بڑی رہنمائی کرتی تھیں' وہیں ایک روز میری ملاقات پاکستان کے نامور صحافی اور شاعر رئیس امروہوی سے ہو گئی۔ بات دست شناسی سے چلی تو ایک دوسرے کے ہاتھ دیکھنے تک جا پہنچی' میں نے دیکھا ان کی ہتھیلی کے درمیان بھی ایک کراس ہے جو ان کی اچانک

موت کی نشاندہی کر رہا ہے' میں نے ان سے کہا کہ امروہوی صاحب آپ قتل ہو جائیں گے' انہوں نے قہقہہ لگا کر کہا ''نوجوان مجھے کون مارے گا میں سیاست دان ہوں نہ بڑا آدمی' رہی مال و دولت کی بات تو میں صرف نام کا رئیس ہوں۔'' میں خاموش ہو گیا' اس کے بعد ان سے اکثر ملاقاتیں رہنے لگیں' ایک روز وہ کہنے لگے چلو تمہیں اپنے ایک دوست سے ملاتا ہوں' میں ان کے ساتھ چل پڑا وہ مجھے ایک بڑے سے دفتر میں لے گئے جہاں ایک بھاری بھرکم کرسی پر ڈھلتی عمر کا ایک پٹھان بیٹھا تھا۔ رئیس صاحب نے میرا تعارف کرایا تو اس نے ہنس کر کہا' میں بھی پامسٹری پڑھتا رہتا ہوں' ساتھ ہی اس نے چند بالکل نئی کتابوں کے نام گنوا دیئے۔ جو ابھی تک میری نظروں سے نہیں گزری تھیں' گپ شپ کے بعد جب انہوں نے مجھے ہاتھ دکھایا تو میں نے دیکھا اس کی زندگی کے آخری دس بارہ سال سب سے زیادہ شاندار تھے' اگر وہ کسی شاہی خاندان کا فرد تھا تو اس عرصہ حیات میں اس کے بادشاہ بننے کے امکانات ہوتے' میں نے بڑے آرام سے تمام سائنز دکھائے اور کہا جب آپ کی عمر ۷۲ سال ہوگی تو شاید آپ ''وائسرائے'' بن جائیں تو اس نے قہقہہ لگا کر کہا برخوردار ۶۰ سال کے بعد تو بیوی بھی دھکے دے کر باہر نکال دیتی ہے اور تم مجھے ۷۲ برس میں سربراہ مملکت بنا رہے ہو'' میرے پاس اس کے ''جوک'' کا کوئی جواب نہیں تھا کیونکہ ابھی ۷۲ سال کے درمیان کئی دہائیاں حائل تھیں اور وقت کو تو وقت ہی ثابت کر سکتا ہے میں تھوڑی دیر وہاں بیٹھ کر رئیس صاحب کے ساتھ چلا آیا۔ لوگ اس شخص کو غلام اسحاق خان کے نام سے جانتے ہیں۔ جب ۸۸ء میں وہ صدر بنے تو میں تازہ تازہ بھارت سے آیا تھا' میرے ایک دوست مجھے ان کے پاس لے گئے انہوں نے مجھے فوراً پہچان لیا اور کہا پچھلی ملاقات کے بعد جب بھی میری نظر اپنے ہاتھ پر پڑتی میں ہنس پڑتا لیکن اب میں ایوان صدر میں بیٹھ کر اسے دیکھتا ہوں تو غمزدہ ہو جاتا ہوں کیونکہ اگر قدرت نے بہت پہلے یہ فیصلہ کر رکھا تھا تو اس نے کچھ اور بھی تو سوچا ہوگا اور وہ کتنا خوفناک کتنا سنگین ہے مجھے اس کے بارے میں علم ہی نہیں!''

ایوب خان کے مارشل لاء کے دوران لیاقت باغ میں آل پارٹیز جلسہ ہوا اس میں غفار خان بھاشانی اور سہروردی سمیت دوسرے تمام اپوزیشن رہنماؤں نے خطاب کرنا تھا لیکن جلسہ شروع ہونے سے قبل ہی دائیں بازو کے بعض عناصر نے پنڈال الٹ دیا سٹیج پر ٹماٹر اور گندے انڈوں کی بارش ہو گئی اور سارے لیڈر وہاں سے بھاگ گئے اس ہنگامے کے دوران میاں افتخار (پاکستان ٹائمز والے) اور میں غفار خان کو جلسے سے باہر نکال لائے راستہ بھر ہمیں گندے انڈے

پڑتے رہتے لیکن ہم نے کسی نہ کسی طرح انہیں ان کے ایک وکیل دوست کے گھر پہنچا دیا۔ گھر کے کوریڈور میں داخل ہوتے ہی غفار خان نے عجیب حرکت کی' وہ جھولی پھیلا کر کھڑے ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کو مخاطب کر کے کہا ''یا پروردگار میرے ان تمام مجرموں کو معاف کر دے'' یہ بات میرے لئے باعث حیرت تھی کیونکہ میں نہ صرف غفار خان کو ''کافر'' بلکہ ملک دشمن سمجھتا تھا۔ غفار خان کی دعا ختم ہوئی تو میں نے ان سے پوچھا ''خان صاحب آپ تو نظریہ پاکستان کے مخالف تھے پھر مسلم لیگیوں کے لئے بخشش کی دعا کیوں مانگ رہے ہیں۔'' انہوں نے میری بات غور سے سنی اور کہا ''میرے بچے میں واقعی نظریہ پاکستان کا مخالف تھا لیکن اب پاکستان بن چکا ہے اور میں اسی ملک میں رہ رہا ہوں لہٰذا پاکستان کی حفاظت میرا ایمان ہے۔'' بہت بعد ۷۹ء۔۸۰ء میں سری نگر ہسپتال میں میرے کمرے کے ساتھ غفار خان کا کمرہ تھا' میں ان سے ملنے گیا تو وہ بہت علیل تھے' میں نے انہیں پرانی ملاقات کا حوالہ دیا تو وہ مجھے پہچان گئے' بڑی شفقت سے ملے ماضی کی باتیں شروع ہوئیں تو انہوں نے کہا ''میرے بچے میں برملا اعتراف کرتا ہوں قائداعظم کا خیال درست تھا' ہم سب غلطی پر تھے۔ دو قومی نظریہ حقیقت ہے' مسلمان کبھی ہندوؤں کو اپنا بھائی نہیں بنا سکتے' کاش قائداعظم اب ہوتا تو میں خود اس کے پاس چل کر جاتا۔'' میں نے دیکھا اس سن رسیدہ شخص کی مدہم پڑتی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے اور اس کے ہونٹوں پر ''اعتراف جرم'' کی لرزش تھی..... لیکن کیا ندامت کے چند آنسو تاریخ کے داغ دھو سکتے ہیں۔ میں ایک طویل عرصے تک سوچتا رہا۔

انہی دنوں ایوب خان سے میری ملاقاتیں شروع ہو گئیں' ایوب خان اپنے دل میں صنعت کاروں کے لئے بڑا نرم گوشہ رکھتے تھے۔ کوہ نور ملز کے مالک سہگل تھے لہٰذا مقبول حسین اور میں سہگل خاندان کے بھیجے ہوئے تحفے ایوب خان کو پہنچانے جاتے تھے۔ ایوب کی ایک عجیب عادت تھی وہ سرکاری تقریبات اور اجلاس میں جس قدر سنجیدہ نظر آتے اپنی نجی محفلوں میں وہ عام لوگوں کے سامنے اتنے ہی ''کھلے ڈھلے'' ہو جاتے' خوب گپ لڑاتے' لطیفے سناتے' قہقہے لگاتے' میرے سامنے کی بات ہے کئی بار بھٹو آئے ان کے پیچھے کھڑے رہے اور پھر ''ڈیڈی'' کہہ کر ایوب سے لاڈ شروع کر دیا اور پھر چلے گئے۔ اسی قسم کی ایک ملاقات کے دوران جب انہوں نے امریکہ کے متوقع دورے کا ذکر کیا تو میں نے انہیں ''جین ڈکسن'' سے ملاقات کا مشورہ دیا۔ انہوں نے ہامی بھر لی۔ دورے سے واپسی کے بعد انہوں نے مجھے بلا کر بتایا کہ ''جین ڈکسن'' سے ان کی ملاقات ہوئی ''بڑی عجیب عورت ہے اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر آنکھیں بند کیں اور کہا ۶۸ء تک آپ

کے اقتدار کو کوئی خطرہ نہیں اس کے بعد اندھیرا ہی اندھیرا ہے پھر بہت بعد آپ کا ایک بیٹا سیاست میں آئے گا اور بہت ترقی کرے گا۔ ۲۰۰۰ء کے بعد پاکستان کا بہترین دور شروع ہوگا اسی دوران وہ نئی حکومت بھی معرض وجود میں آئے گی جو ملک کی تاریخ کی سب سے مضبوط' ایماندار اور مخلص حکومت ہوگی کشمیر بھی اس دور میں آزاد ہوگا۔''

میری والدہ کی دوسری شادی بھی ناکام ہوگئی تو وہ سری نگر میں تنہا ہوگئیں انہوں نے مجھے بلوا بھیجا' میں نے بڑی مشکل سے پاسپورٹ حاصل کیا اور اپنے کشمیر واپس چلا گیا۔ وہاں میں نے سری نگر یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا کچھ ہی عرصے میں ۶۵ء کی جنگ چھڑ گئی جس کے بعد پاکستان واپسی مشکل ہوگئی۔ بیگم محمودہ احمد علی شاہ ابھی تک سری نگر میں تھیں میری ان کے ساتھ ''ایسوسی ایشن'' بھی اسی طرح تھی لہٰذا میرا زیادہ تر وقت ان کے گھر گزرنے لگا اس دور میں بھی ان کی مقبولیت کا گراف ماضی ہی کی طرح اونچا تھا۔ بھارت کے تمام ٹاپ کلاس سیاستدان، بیورو کریٹ، شاعر، ادیب اور دانشور اسی طرح خاموشی سے اس دیوی کے سامنے آ بیٹھتے اور وہ اونچی کرسی پر بیٹھ کر بڑی نخوت سے انہیں دیکھتی رہتی۔ وہیں ایک روز انہوں نے کتاب سے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا اور کہا ''تم بنارس یونیورسٹی اپلائی کیوں نہیں کرتے؟'' اور ساتھ ہی انہوں نے نظریں پھیر کر کتاب پر گاڑھ دیں۔ جیسے ابھی کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو لیکن میرے لئے سوچ کا ایک نیا دروازہ کھل گیا۔ میں اگلے چند روز میں زادِ راہ جمع کرتا رہا جب ''حالات'' حوصلہ افزا ہوئے تو بس پکڑ کر وادی سے نکلا اور بنارس جا پہنچا۔ اب میرے سامنے ''مخفی علوم'' کی قدیم ترین درس گاہ تھی۔ ایسی درس گاہ جس میں آج تک مسلمان تو دور کی بات برہمنوں کے سوا کسی ذات کے شخص کو داخلہ نہیں ملا۔ میں ڈرتا ڈرتا پرنسپل کے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں کھدر کے سفید کپڑے پہنے ماتھے پر قشقہ لگائے ایک لاتعلق سا شخص پان چبا رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا ''پرنسپل آپ ہیں'' تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ میں مرکزی ٹیبل کے سامنے کرسی پر بیٹھنے لگا تو اس نے کہا ''نہیں بیٹے تم ادھر میرے پاس آ جاؤ'' میں نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ اس نے دیوار پر لگے کلاک پر نظر ڈالی اور پھر خالی انگلیوں سے میز پر لکیریں کھینچیں' خانے بنائے اور ان میں کچھ ہندسے' کچھ حروف اور کچھ سائنز بنا کر کہا ''تم پہاڑ سے آئے ہو ہاتھ ریکھاؤں کا علم سیکھنا چاہتے ہو لیکن برہمن نہیں۔'' میں اس کے یہ الفاظ سن کر برف ہو گیا۔ اس نے ایک اور لکیر کھینچی اور کہا ''بھگوان تم پر مہربان ہے تم یہ ضرور سیکھ لو گے۔'' اسی اثناء میں پرنسپل اندر آ گیا۔ اس اجنبی نے کھڑے ہو کر کہا ''ہاں یہ وہ لڑکا ہے جس کے

بارے میں تم سے بات کر رہا تھا میں اس کی گارنٹی دیتا ہوں'' ساتھ ہی وہ میری طرف مڑا اور کہا ''کیوں بے تم گوشت کھاؤ گے' عیدیں مناؤ گے' مسجدوں میں جاؤ گے؟'' اور میں نے فوراً نفی میں سر ہلا دیا ''ہوں دیکھو کتنا فرمانبردار ہے آپ اس کو داخلہ دے دیں۔'' اور یوں میں اس اجنبی کے توسط سے اس یونیورسٹی کا طالب علم ہو گیا جس میں آج تک کسی مسلمان کا گزر تک نہیں ہوا تھا۔ مجھے اس اجنبی کے حوالے کر دیا گیا۔ اچاریہ کسم اس کا نام تھا اور اس کا شمار بنارس کے چوٹی کے نجومیوں اور دست شناسوں میں ہوتا تھا۔

بنارس یونیورسٹی کے علوم مخفی کے شعبے کا اپنا ہی ایک نظام تھا۔ یہاں کسی بھی طالب علم کو بارہ تیرہ برس سے پہلے ایم اے کی ڈگری نہیں دی جاتی۔ طالب علم کو شروع میں کسی بڑے ''اچاری'' کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ جو انہیں اپنی نگرانی میں ٹریننگ دیتا ہے۔ جوں جوں اس کا علم بڑھتا ہے توں توں وہ یونیورسٹی میں آکر اپنے دوسرے ہم مکتبوں کو لیکچر دیتا ہے۔ میں جس ''اچاری'' کے ساتھ وابستہ تھا اس کے پاس دس ہزار حیرت انگیز ہاتھوں کی ایک قلمی کتاب تھی جو اس نے خود تیار کی تھی۔ مجھے اس کتاب سے استفادہ کا موقع ملا پھر ہمیں ''وی ٹی آر'' پر ہاتھوں کی سلائیڈز دکھائی جاتیں۔ ماں کے پیٹ میں بچے کے ہاتھ کی ابتدائی ساخت' پھر اس کی پرورش' لائنوں کا وجود میں آنا' بچے کی پیدائش کے فوراً بعد ہاتھ میں آنے والی تبدیلیاں' یہ سب کچھ مجھے سکھایا گیا۔ وہاں مجھے دنیا کے بڑے بڑے ہاتھ دیکھنے کا موقع بھی ملا۔ خلا نورد نیل آرمسٹرانگ سمیت دنیا کے مشہور سائنس دان، سیاست دان، حکمران انقلابی اور مجرم وغیرہ وغیرہ۔ بہر حال اس یونیورسٹی میں میرا تیرہ برس کا قیام میرے لئے اس علم کے نئے نئے دروازے کھولتا چلا گیا۔

میں ایک بار چھٹیوں میں سری نگر گیا۔ یہ غالباً ۷۱ء یا ۷۲ء کی بات ہے۔ ایک شام محمودہ احمد علی شاہ کے گھر اندرا گاندھی آ گئی۔ کھانے کے دوران بیگم محمودہ نے میرا ان سے تعارف کرایا تو انہوں نے ہاتھ دکھانے کی خواہش ظاہر کی۔ کھانے کی اس میز پر جب بھارت کی سب سے بڑی رہنما، نے اپنے ہاتھ کھول کر رکھے تو ان پر کراس ہی کراس تھے۔ لائن آف مرکری لائف لائن کو کاٹ رہی تھی جو اس کی بیوگی ظاہر کر رہی تھی۔ ہتھیلی کے درمیان کراس اچانک موت کا اعلان تھا۔ زہرہ سے اترتی لائنیں قریبی عزیز (بیٹے) کی موت ظاہر کر رہی تھیں۔ میں نے سب کچھ صاف صاف کہہ دیا تو وہ ناراض ہو گئیں۔ بڑے عرصے تک وہ جب بھی بیگم محمودہ سے ملتیں میری ''گستاخی'' کا ذکر ضرور کرتیں۔ یہاں تک کہ میری پیش گوئی کے مطابق اس کا بیٹا ہلاک ہو گیا۔

بیگم محمودہ تعزیت کے لئے گئیں تو پہلی مرتبہ اندرا گاندھی نے نہ صرف سنجیدگی سے میرا ذکر کیا بلکہ ساری پیشگوئیاں لکھ کر بھجوانے کی درخواست کی۔ میں نے محمودہ بیگم کے کہنے پر سب کچھ ٹائپ کر کے بھیج دیا۔ اندرا گاندھی کے قتل پر جب اس کے کاغذات سے میرا یہ خط برآمد ہوا تو بھارتی خفیہ اداروں نے میری انکوائری شروع کر دی لیکن انہیں مجھ سے کیا ملنا تھا۔

۸۲ء کی بات ہے دہلی میں ایشین گیمز ہو رہی تھیں۔ میں چند دوستوں کے ساتھ باسکٹ بال کا میچ دیکھ کر سٹیڈیم سے نکلا تو گیٹ پر راجیو گاندھی اپنے بچوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ ہم بیگم محمودہ کے حوالے سے ایک دوسرے سے شناسا تھے۔ لہٰذا ملاقات ضروری تھی۔ ہم نے وہیں گپ شپ شروع کر دی۔ میں نے اس سے ہاتھ دکھانے کی فرمائش کی تو اس نے کارڈلیس فون اپنے پی اے کو پکڑا کر ہاتھ میرے سامنے کر دیا۔ میں نے دیکھا وہ مقدر کا سکندر ہے۔ سن لائن مارز کی طرف جا رہی تھی، لیکن مرکری لائن لائف لائن کو کاٹ رہی تھی اور برین لائن ہارٹ کو۔ میں نے کہا جناب آپ آئندہ تین برس تک اس ملک کے وزیراعظم ہونگے لیکن ہونگے صرف ایک ٹرم کے لئے۔ عمر آپ کی بہت کم ہے اور آپ کی وفات بھی ویسے ہی ہوگی جیسے آپ کی والدہ کی۔ راجیو گاندھی نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا ”بھگوان ماتا جی کی عمر لمبی کرے میں ڈرائیور ہی ٹھیک ہوں۔“ وہیں نزدیک ہی کوئی اخباری رپورٹر بھی تھا لہٰذا اگلے ہی روز میری یہ ملاقات اور پیشگوئیاں اخبار میں شائع ہوئیں جس سے بھارت میں خاصا شور ہوا۔

۸۴ء میں مجھے بنارس یونیورسٹی نے دست شناسی میں ایم اے کی ڈگری دے دی تو سب سے پہلے میر بشیر نے مجھے مبارکباد کا خط لکھا۔ اس وقت میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ یونیورسٹی کے گیٹ پر کھڑے ہو کر میں نے سوچا اس سے قبل کہ میرا فن روزگار کے گھن چکر میں پھنس جائے مجھے مزید علم حاصل کرنا چاہئے تو دوستو! میں وہیں سے سفر پر نکل کھڑا ہوا۔ میں مدراس کے اس مندر میں گیا جہاں ”اگستھ ناڑی“ پر مندر میں آنے والے ہر شخص کا احوال درج ہوتا ہے وہاں میں نے اپنی ناڑی پڑھی پھر کیرالہ گیا وہاں کے ماہرین کے پاؤں چھوئے جو چند ایک ”نسخے“ ہاتھ آئے گرہ سے باندھ لئے وہاں سے نیپال کے یوگیوں سے ملاقات کی جب تھک ہار کر واپس آیا تو والدہ کا انتقال ہو چکا تھا‘ سوتیلا بھائی ہندو لڑکی سے شادی کر کے غائب ہو چکا تھا۔

ابھی اس صدمے سے سنبھل نہیں پایا تھا کہ گال بلیڈر خراب ہو گیا۔ ہسپتال گیا تو پھیپھڑوں میں کینسر نکل آیا پھر ایک بیماری سے دوسری بیماری‘ ایک دکھ کے بعد دوسرا دکھ غرض ۱۳ ماہ

ہسپتال میں بے یارومددگار پڑا رہا جب کچھ صحت سنبھلی تو سوچا اب کہاں جاؤں ..... اندر سے آواز آئی پاکستان ... صرف وہی سرزمین ایسی ہے جو ہر بے سہارا کو سہارا دے سکتی ہے۔

۸۸ء میں واپس پاکستان آ گیا مجھے یہاں رہنے کی اجازت کیسے ملی یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔ بہرحال مجھے پاکستانی تسلیم کر لیا گیا۔ فروری یا مارچ میں ہمارے ایک دوست مسعود ہاشمی روہڑی نے مجھے ایک پرنٹ دکھایا شمس کی انگلی کے بالکل نیچے دل کی لکیر پر کالا تل تھا، برین لائن سن کی طرف جا رہی تھی‘ سر پر دائرے کا نشان تھا‘ چوڑیوں پر تل کا نشان تھا‘ میں نے مسعود ہاشمی کو بتایا یہ شخص کسی سٹیٹ کا ہیڈ ہے۔ اس کا ایک بچہ ابنارمل ہے اور اس کی موت ۶۲ سال کی عمر میں پانی میں ڈوبنے سے ہوگی۔

مسعود ہاشمی نے کہا لکھ کر دے دو۔ میں نے دے دیا۔ ٹھیک دو ماہ بعد مجھے پتہ چلا کہ وہ پرنٹ صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کا تھا۔ وہ ۱۷ اگست ۸۸ء کو بہاولپور میں دریا کے کنارے جاں بحق ہو گئے لیکن میں نے دو برس بعد یہی ہاتھ ایک جیتے جاگتے انسان کی کلائی سے منسلک دیکھا‘ وہی لکیریں‘ وہی ابھار اور وہی سائنز۔ میں نے کہا آپ بھی اپنے والد کی طرح بہت اوپر جائیں گے‘ آپ کا تیسرا بچہ ابنارمل ہوگا اور آپ بھی اپنے والد ہی کی طرح جاں سے جائیں گے ... اس ہاتھ کا نام اعجاز الحق تھا۔

نومبر ۸۹ء میں جب راجیو گاندھی نے لوک سبھا میں ”مڈٹرم الیکشن“ کا اعلان کیا تو اس کے ایک ساتھی نے کھڑے ہو کر کہا آپ کو معلوم ہے آپ نہیں جیت سکتے تو پھر آپ ہمیں کیوں مروا رہے ہیں۔ اسمبلی میں ان الفاظ سے ہنگامہ ہو گیا۔ دوسرے ارکان نے اس دعوٰی کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا ”یہ بات بھی اسی پامسٹ نے کہی تھی جس نے پائلٹ راجیو گاندھی کو وزیراعظم بننے کی خوشخبری سنائی تھی۔ راجیو دوسری بار وزیراعظم نہیں بن سکتے ان کی عمر بھی کچھ زیادہ لمبی نہیں۔“ ارکان کے پوچھنے پر اس شخص نے لوک سبھا میں میرا نام لے لیا اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ وہ پامسٹ آج کل پاکستان میں ہے۔ تھوڑی ہی مدت کے بعد جب راجیو گاندھی قتل ہو گیا تو پاکستان کے بعض خفیہ اداروں نے میری انکوائری شروع کر دی یہ وہ تین ماہ میری زندگی کا بڑا پریشان کن دور تھا۔

اب آٹھ برس سے پاکستان میں ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے بڑی عزت دی‘ اس ملک کا شاید ہی کوئی بڑا سیاستدان، بیوروکریٹ، فوجی افسر یا سفارتکار ہوگا جس سے میری ملاقات نہ ہوئی‘ جس نے میری ”سروس“ نہ لی ہو۔ مزے میں ہوں‘ کتابیں پڑھتا رہتا ہوں‘ لوگوں سے ملتا رہتا ہوں‘

سارا دن مصروفیت میں گزر جاتا ہے لیکن جب رات ہوتی ہے تو جموں کا وہ درویش میرے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے جو سارا دن مکھیاں اوڑھے تھڑے پر بیٹھا رہتا تھا اور ایک سہما سا شرمیلا لڑکا کھڑکی سے اسے دیکھتا رہتا تھا اور جموں کی ایک دوپہر کو جب وہ لڑکا ہمت کر کے اس کے سامنے کھڑا ہوا تو اس نے ''پیر بوٹی'' جیسی آنکھوں سے گھور کر کہا ''تو بھی دیکھے گا' تو بھی'' اور اس کے بعد وہ لڑکا دیوانے کے الفاظ پلے سے باندھ کر چلا آیا اور ایک عرصے تک ان الفاظ کی گرہ اس سے نہ کھل سکی..... لیکن جب اس کی فنکار انگلیاں کارگر ہونے لگیں تو انسانی مقدر ریت بن کر اس کی مٹھی میں آ گیا جسے اس نے جس قدر سنبھالنے کی کوشش وہ اسی قدر گرفت سے سرکتا چلا گیا اور اب جبکہ وہ موت کی دہلیز پر کھڑا ہے تو اس کی مٹھی بالکل خالی ہے۔ اور وہ سوچتا ہے کاش دیوانے کا فرمایا ہوا اسی طرح اس کے پلو سے بندھا رہتا اور وہ آگہی کے دکھ سے آزاد خاموشی سے زندگی گزارتا چلا جاتا' گزارتا چلا جاتا... لیکن وہ یہ بھی تو سوچتا کہ کیا اس کائنات میں انسانی خواہش کی بھی اہمیت ہے۔؟

• • •

(شمیم قریشی صاحب ۷ جولائی ۲۰۰۵ء کو انتقال فرما گئے۔ میں نے ان کے انتقال پر روزنامہ جنگ میں جو کالم تحریر کیا' میں یہ کالم بھی آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔)

تھوڑی دیر بعد کوشش کیجئے گا

وہ ہمیشہ کپ خالی کرتے تھے' ان کا کہنا تھا رزق الہام کی طرح ہوتا ہے اس سے منہ موڑنا گناہ ہے لہٰذا ان کے سامنے شربت کا گلاس رکھا جائے یا چائے کا کپ وہ ہمیشہ اسے خالی کر کے اُٹھتے تھے۔ لیکن پانچ دن پہلے انہوں نے آدھا کپ چھوڑ دیا' میں نے ذرا دیر رکنے کی درخواست کی' وہ مسکرا کر بولے ''بیٹا تھوڑی سی جلدی ہے آج معاف کر دو۔'' میں نے عرض کیا ''آپ کو ڈرائیور چھوڑ دے گا۔'' وہ اُٹھے اور کاغذوں کی فائل اُٹھا کر بولے۔ ''نہیں بیٹا ذرا سا تو سفر ہے' میں پیدل جانا چاہتا ہوں۔'' میں خاموش ہو گیا' وہ دفتر سے باہر نکلے' میں ان کے پیچھے پیچھے باہر آیا' انہوں نے گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور پیدل چل پڑے باہر ہلکا ہلکا اندھیرا تھا' وہ میرے سامنے چلتے چلتے اندھیرے میں گم ہو گئے' اگلی شام میرا دل گھبرا رہا تھا' میرا فون بجا' پتہ نہیں کیوں مجھے محسوس ہوا دوسری طرف بُری خبر ہے' وہی ہوا' میں نے فون اُٹھایا تو کسی صاحب نے اطلاع دی۔ ''شمیم قریشی صاحب رخصت ہو گئے ہیں۔''

شمیم قریشی صاحب ایک عجیب شخصیت تھے' وہ جموں میں پیدا ہوئے' ان کے

والدین میں علیحدگی ہو گئی' ان کی والدہ انہیں سرینگر لے آئیں' وہ کالج میں پڑھاتی تھیں' والدہ نے دوسری شادی کر لی' انہیں کالج کی پرنسپل نے گود لے لیا' وہ اپنے زمانے کی ایک مشہور خاتون تھیں' ان کے گھر شیخ عبداللہ' فیض احمد فیض' ایم ڈی تاثیر اور نہرو کا آنا جانا تھا۔ شمیم قریشی صاحب نے بچپن میں ان شخصیات سے میل ملاقات شروع کر دی۔ پاکستان بنا تو وہ راولپنڈی آ گئے اور ایک مزدور کی حیثیت سے زندگی کا آغاز کیا' 1951ء میں وہ لیاقت باغ گئے' ان کے ساتھ ایک پٹھان بیٹھا تھا' یہ پٹھان سید اکبر تھا' شمیم قریشی صاحب کے سامنے لیاقت علی خان نے جان جانِ آفرین کے حوالے کی اور ان کی آنکھوں کے سامنے پولیس نے سید اکبر کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا' انہوں نے کوہ مری میں نوکری شروع کی وہاں ان کی ملاقات دنیا کے مشہور ترین پامسٹ میر بشیر سے ہوئی' میر صاحب نے ان کا ہاتھ دیکھ کر بتایا انہیں اللہ تعالیٰ نے مستقبل میں جھانکنے کی صلاحیت سے نواز رکھا ہے' میر بشیر نے انہیں پامسٹری سکھانا شروع کر دی' اس دور میں انہوں نے ایک بچی کا ہاتھ دیکھ کر پیشین گوئی کی کہ سولہ سال کی عمر میں اس کی جنس بدل جائے گی' وہ بچی بڑی ہو کر لڑکا بن گئی۔ ان کی اس پیشین گوئی نے پامسٹری کی دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ وہ ۱۹۶۳ء میں واپس سرینگر چلے گئے۔ ۱۹۶۵ء میں جنگ شروع ہوئی اور وہ بھارت میں پھنس کر رہ گئے' وہ گھومتے پھرتے بنارس گئے' وہاں غیر مرئی علوم کی ایک درس گاہ ہے' یہ اس فیلڈ میں دنیا کی قدیم ترین درس گاہ ہے' وہ درس گاہ کے پنڈت سے ملے' اس نے ان کا زائچہ بنایا اور انہیں اپنی درس گاہ میں داخلہ دے دیا۔ وہ اس ادارے کی تاریخ میں پہلے مسلمان طالب علم تھے' وہ دس سال تک اس ادارے سے وابستہ رہے۔ انہوں نے وہاں سے پامسٹری میں ایم۔ اے کیا اور بعد ازاں وہاں طالب علموں کو تعلیم دینے لگے' اس دوران ان کا رابطہ اندرا گاندھی سے ہوا اور وہ وزیراعظم ہاؤس آنے جانے لگے۔ انہوں نے اندرا گاندھی کے قتل' ان کے بیٹے سنجے کی حادثاتی موت اور راجیو گاندھی کے وزیراعظم بننے کی پیشین گوئیاں کی۔ انہوں نے سرینگر میں شادی کی' ان کے ہاں ایک بیٹی اور ایک بیٹا پیدا ہوئے۔ وہ ۱۹۸۴ء میں پاکستان آ گئے۔ راجیو گاندھی نے جب قبل از وقت الیکشن کرانے کا اعلان کیا تو لوک سبھا کے کسی ممبر نے ایوان میں شمیم قریشی صاحب کا ایک انٹرویو لہرا کر کہا۔ ''راجیو کی زندگی میں یہ الیکشن ہے ہی نہیں۔'' یوں لوک سبھا میں بحث چھڑ گئی۔ وہاں کسی نے شمیم قریشی صاحب کے بارے میں پوچھا۔ ''وہ آج کل کہاں ہیں؟'' بتانے والے نے بتایا۔ ''پاکستان۔'' یہ خبر پاکستان پہنچی تو ان کی تلاش شروع ہو گئی' وہ ان دنوں راولپنڈی میں تھے۔ ایجنسیوں کے لوگ ان تک پہنچ گئے اور اس کے بعد ان کا زیادہ تر وقت ایوان اقتدار میں گزرنے لگا۔ پاکستان کا شاید ہی کوئی اہم شخص ہو جس نے ان کے سامنے ہاتھ نہ

پھیلائے ہوں۔ اس اہمیت کے باوجود انہوں نے درویشی ترک نہ کی۔ ان کے پاس کوئی گھر نہ تھا' وہ لاہور اور راولپنڈی میں اپنے عزیزوں کے پاس رہتے تھے۔ کسی سے ایک پائی طلب نہیں کرتے تھے۔ اگر کوئی دے دیتا تو وہ یہ رقم یتیم بچیوں کی شادیوں پر خرچ کر دیتے' میرے ساتھ ان کا دس سال سے تعلق تھا۔ وہ اچانک غائب ہو جاتے اور پھر کسی روز گھر کی گھنٹی بجتی اور وہ مسکراتے' مسکراتے اندر داخل ہوتے۔ ''بیٹا میں ادھر سے گزر رہا تھا سوچا تمہیں سلام کرتا چلوں۔''

اپریل ۲۰۰۵ء میں مظفر آباد سے سرینگر کے لیے پہلی بس روانہ ہوئی تو وہ اس میں سوار تھے۔ سرینگر میں کشمیر اور بھارتی میڈیا نے ان کا بھرپور سواگت کیا' ٹیلیویژن چینلوں پر ان کے لائیو پروگرام چلے' درجنوں اخبارات نے ان کے انٹرویو کیے۔ انہوں نے میڈیا کی مدد سے اپنے بچے تلاش کئے اور ان سے لپٹ کر دیر تک روتے رہے' پاکستان واپس آئے' مجھ سے ملے اور جذبات سے تمتماتی آواز میں بولے۔ ''میں نے زندگی میں صرف دو خواہشیں کی تھیں ایک میں آزاد کشمیر کے راستے مقبوضہ کشمیر جاؤں اور دوہ میں اپنے بچوں سے ملاقات کر سکوں۔ میری دونوں خواہشیں پوری ہو گئیں۔'' وہ ان دنوں ہر دوسرے دن مجھے ملتے تھے اور بار بار کہتے تھے مقبوضہ کشمیر کی کشمیری قیادت پاکستان کو دھوکا دے رہی ہے' یہ سب را کے جاسوس ہیں' ہمیں ان سے ہوشیار رہنا چاہیے۔ میں ان کے احترام میں خاموش رہتا تھا۔ وہ ۶ جولائی کو میرے پاس سے اٹھے اور ۷ جولائی کی شام واپس آنے کا وعدہ کیا لیکن ۷ جولائی کی شام ان کی بجائے ان کے انتقال کا پیغام آ گیا۔

شمیم قریشی صاحب کی عجیب عادت تھی' وہ چوبیس گھنٹے اپنے موبائل آن رکھتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے ''فون بند رکھنا تکبر کی نشانی ہے' آپ فون بند کر کے دوسروں کو یہ پیغام دیتے ہیں' میں تم سے زیادہ اہم ہوں' یہ بات اللہ کو اچھی نہیں لگتی۔'' لہٰذا میں نے جب بھی فون کیا' مجھے دوسری طرف سے السلام علیکم بیٹا کی آواز آئی۔ ۸ جولائی کو ان کا جنازہ تھا' میں نے غیر ارادی طور پر ان کا نمبر ڈائل کیا۔ مجھے پہلی مرتبہ ان کے نمبر سے وہ آواز سنائی دی جو اکثر لوگوں کے نمبروں سے اکثر آتی ہے۔ ''آپ کا مطلوبہ نمبر فی الحال بند ہے۔ آپ تھوڑی دیر بعد کوشش کیجئے گا۔'' میں نے سوچا ''تھوڑی دیر'' میں نے سر نفی میں ہلایا اور اپنے آپ سے کہا۔ ''نہیں یہ تھوڑی دیر حشر کے روز تک پھیلی ہے' اس تھوڑی دیر کو ختم ہونے کے لیے نہ جانے کتنے ہزاروں سال درکار ہوں گے۔

• • •

پروفیسر عبدالعزیز

چہرے کی تمکنت اور تنی ہوئی گردن اس کے ''خاص'' ہونے کی نشاندہی کر رہی تھی جبکہ اس سے ذرا ہٹ کر کھڑے دونوں مردوں کی جھکیں گردنیں اور پیٹ پر بندھے ہاتھ ظاہر کر رہے تھے کہ ان میں غلام اور آقا جیسا تعلق ہے۔ میں چبوترے کے قریب آیا تو عورت نے آگے بڑھ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا، پھر میرے گالوں کو چھو کر بولی ''آؤ میرے بچے ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے'' میں چھلانگ لگا کر چبوترے پر چڑھ گیا۔ عورت مسکرائی اور سامنے سکول کے گراؤنڈ کی طرف اشارہ کر کے کہا ''ان بچوں کو دیکھو'' میں نے غیر ارادی طور پر گراؤنڈ میں کھیلتے اپنے ہم مکتبوں پر نظر دوڑائی ''تمہیں پتہ ہے یہ کون ہے؟'' میں نے مڑ کر بوڑھی عورت کو دیکھا اور نفی میں سر ہلا دیا ''ہوں، یہ لا حاصل سفر کے محروم مسافر ہیں جو پوری زندگی سراب کے پیچھے پیچھے چلتے رہتے ہیں اور آخر میں جب شام ہوتی ہے تو ان کے پاس کچھ نہیں ہوتا، پھر یہ تاسف کرتے ہیں، روتے پیٹتے ہیں، لیکن گیا وقت واپس نہیں آتا۔'' میرے دماغ کی ساری کھڑکیاں کھلی تھیں لیکن اس بوڑھی عورت کا ایک بھی لفظ میرے پلے نہ پڑا۔ میں ہونق بنا اسے دیکھتا رہا۔ پر وہ میرے احساسات سے لاتعلق بولتی چلی گئی ''لیکن تم ان سے مختلف ہو تمہارا سفر رائیگاں نہیں جائے گا، تم کانٹوں کے اس جنگل سے اپنے کپڑے اور جسم دونوں بچا کر نکلو گے'' مجھے ان الفاظ کی بھی بالکل سمجھ نہ آئی لیکن اس کے باوجود میں ایک سحر زدگی کے عالم میں ہمہ تن گوش رہا۔ پھر وہ پیچھے مڑی، جہاں دونوں مرد تعظیم سے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ اس نے انہیں دیکھا اور پھر مجھے مخاطب کر کے کہنے لگی ''یہ دونوں تمہارے استاد ہیں۔ یہ تمہیں زندگی کا درس دیں گے۔ ابدی اور لازوال زندگی کا درس۔ ان کا احترام کرنا، ان کے ہر مشورے کو حکم سمجھنا۔ یہی تمہارے لئے بہتر ہو گا۔ یہ لوگ تمہیں گمراہی سے دور رکھیں گے، یہ تمہیں بھٹکنے نہیں دیں گے، لیکن اگر تم نے ان کی حکم عدولی کی تو پھر تمہیں زمین پر عبرت کا نشان بنا دیا جائے گا۔ پوری دنیا کی حقارت، نفرت اور ذلت جمع کر کے تمہاری جھولی میں ڈال دی جائے گی۔'' میں نے دیکھا اس وقت عورت کے چہرے پر کوئی انوکھی بات تھی، کوئی ٹھنڈا احساس، کوئی آگ میں جھلستا ہوا جذبہ جو اس کے چہرے سے اتر کر میری ہڈیوں میں سرایت کر گیا اور میں وہاں گر کر بے ہوش ہو گیا۔ اب پتہ نہیں میں کب تک اس چبوترے پر بے سدھ پڑا رہا لیکن جب ہوش آیا تو میں اپنے گھر بستر پر پڑا تھا اور میری ماں میری پیشانی پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھ رہی تھی۔

آٹھویں جماعت کے ایک ایسے کمزور سے لڑکے کے لئے جس کی زندگی درسی کتابوں تک محدود ہو یہ سب کچھ الف لیلیٰ کی کسی داستان سے کم نہیں تھا۔ وہ اسے بھی ''سوتے جاگتے'' کا قصہ ہی سمجھ رہا تھا۔ شہریار کے کسی کردار کا خواب یا کسی قصہ گو کی داستان طرازی۔ اسی لئے جب میں تین ماہ کی بیماری کاٹ کر دوبارہ سکول پہنچا تو اسے ایک بھیانک خواب سمجھ کر بھول گیا۔ ہاں البتہ تفریح کے وقت کنوئیں کے پاس جانے کا معمول ترک کر کے میں نے اپنے ہم مکتبوں کے ساتھ فٹ بال کھیلنا شروع کر دیا۔ یہ سلسلہ تین چار ماہ تک چلتا رہا لیکن ایک روز، میرے ایک ساتھی نے فٹ بال کو زوردار ہٹ لگائی اور وہ اچھل کر کنوئیں کے قریب چلا گیا، میں غیر ارادی طور پر اس کے پیچھے بھاگا لیکن جوں ہی چبوترے کے پاس پہنچا وہاں ان دو ''اتالیق'' میں سے ایک بیٹھا ہوا تھا۔ اس کو دیکھ کر میرا رنگ فق ہو گیا۔ سانس گلے میں پھنس گئی اور جسم جیسے منجمد ہو گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا اور کہا ''دوستوں سے دوری اچھی بات نہیں۔ میں کل اس وقت یہاں تمہارا انتظار کروں گا، ضرور آنا'' اور میں نے واپس دوڑ لگا دی۔ اگلے روز میں بڑا مصمم ارادہ کر کے سکول آیا کہ میں کنوئیں پر نہیں جاؤں گا لیکن جوں جوں تفریح کا وقت قریب آتا گیا، میرا ارادہ کمزور ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ گھنٹی کی آواز سنتے ہی میں کلاس روم سے سیدھا کنوئیں پر جا پہنچا ''وہ'' وہاں موجود تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر میرا استقبال کیا' پھر مجھے ساتھ بٹھا کر بولا ''علم یہ نہیں جو ان مدرسوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ علم وہ ہے جو انسان کی ذات میں چھپا ہوتا ہے۔ اس کا کھوج لگاؤ، اسے جگاؤ۔ اندر کی روشنی باہر کی روشنی سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے' یہ ہمیں وہ سب کچھ بھی دکھا دیتی ہے جو باہر کی روشنی میں نظر نہیں آتا۔ یقین نہیں آ رہا تو میں تمہیں اندر کی روشنی کا علم سکھاتا ہوں۔ سنو حضرت یونس چالیس برس تک مچھلی نہیں بلکہ مگرمچھ کے پیٹ میں رہے تھے۔ مچھلی کا پیٹ ہی نہیں ہوتا وہاں تو ایک سیدھی آنت ہوتی ہے۔ پیٹ تو مگرمچھ کا ہوتا ہے اور سنو حضرت آدم چکوال میں اُتارے گئے تھے۔ اس اونچی نیچی زمین کے اندر اس دور کے سارے آثار دفن ہیں۔ ان آثار کو چار پانچ سو سال بعد آنے والے لوگ نکالیں گے۔ یہاں اس شہر کے نیچے کئی شہر ہیں' ان شہروں میں ہزاروں برس پہلے کے لوگ رہتے تھے۔ وہ لوگ بڑے ظالم تھے، بے انصاف اور غصہ ور تھے۔ جب وہ حد سے گزرے تو ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب اُترا اور وہ اور ان کی بستیاں زمین میں دفن ہو گئیں۔ پھر

ان پر مٹی اور ریت کے ٹیلے آ ٹھہرے۔ پھر ان پر جنگل اُگے، خوفناک جانور اور حشرات الارض آ بسے۔ پھر دور سے انسان آیا اسے یہ جگہ بھائی اور وہ یہاں اقامت پذیر ہو گیا۔ یوں زمین دوبارہ آباد ہوئی لیکن تم دیکھنا کبھی نہ کبھی اس زمین کے نیچے سے وہ پرانی بستیاں بھی ضرور نکلیں گی کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر نئے عذاب سے قبل انسان کے سامنے پرانے عذابوں کی مثال پیش کرتا ہے" اور پھر تفریح ختم ہونے کا گھنٹہ بجا تو وہ فوراً خاموش ہو گیا۔ میں اس سارے دورانئے میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا، بغیر آنکھ جھپکے، بغیر ہونٹ ہلائے اور وہ اپنی مقناطیسی آنکھیں میرے چہرے پر گاڑے بولتا رہا تھا۔ اس کے لفظوں میں کوئی بات ضرور تھی شاید اسی لئے اس کا ہر لفظ میرے دل میں اترتا چلا گیا۔ پھر اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا ہاں، اب تم جاؤ کل پھر یہیں ملیں گے۔

یوں میری تدریس کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں روز تفریح کے وقت کنوئیں پر آتا تو اس اجنبی کو اپنا منتظر پاتا۔ ان دنوں اس نے مجھے بتایا، زمین پر پہلا درخت بیر کا تھا، لوکاٹ بیر اور ادھر یک کے ملاپ سے بنا۔ لوکاٹ کا سب سے پہلا درخت کٹاس قلعہ میں راجہ نے لگوایا۔ شروع میں اس کا پھل کڑواہٹ کے باعث کھانے کے قابل نہیں تھا' لیکن آہستہ آہستہ اس کی کڑواہٹ میں کمی آتی چلی گئی۔ پھر مجھے بتایا گیا، سانپ زمین کو زرخیز کرتے ہیں۔ جن زمینوں پر سانپوں کی بہتات ہوتی ہے وہ آنے والے وقتوں میں بڑی قیمتی ہوتی ہیں۔ وہاں بستیاں آباد ہوتی ہیں۔ وہاں رزق کی فراوانی ہوتی ہے۔ وہاں بڑی رونقیں ہوتی ہیں۔ پھر مجھے بتایا گیا جب بھیڑیں درختوں کے نیچے سے گزرتی ہیں تو ان کی گردنیں جھک جاتی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ کیوں، تم نے کبھی سوچا؟ اس وقت انہیں اپنے لہو کی خوشبو آتی ہے۔ اس لہو کی خوشبو جس نے قصاب کی چھری پر چمکنا ہوتا ہے۔ اس لمحے انہیں اپنی موت کے وقت کا ادراک ہو جاتا ہے۔ تم دیکھنا عید قربان سے قبل سارے جانور تمہیں مغموم ملیں گے، کیوں؟ اس لئے کہ انہیں اپنی موت کا علم ہوتا ہے۔ یہ حس انسان میں بھی تھی لیکن وہ اسے گم کر چکا ہے، سوائے چند لوگوں کے۔ پھر مجھے بتایا گیا جہاں مجذوب زیادہ ہوتی ہے وہاں زلزلے زیادہ آتے ہیں۔ جاپان مجذوبوں کا خطہ ہے وہاں مجذوب بستے ہیں۔ لاتعلق کھوئے ہوئے مگن مجذوب۔ اسی لئے وہاں زمین ہر وقت کروٹیں بدلتی رہتی ہے۔ پھر مجھے بتایا گیا پانی میں جس جگہ زیادہ مرغابیاں بیٹھتی ہیں وہ "چلوں"

کی جگہ ہوتی ہے۔ اس لئے صوفیا مرغابی کے شکار کے خلاف ہیں تم زندگی بھر مرغابیوں کے شکاریوں میں سکون اطمینان اور امن نہیں پاؤ گے پھر مجھے بتایا گیا لفظوں کے بھی جسم ہوتے ہیں۔ جنہیں دیکھنے کے لئے بالغ النظر ہونا ضروری ہوتا ہے۔ مجھے بتایا گیا بانس اور برگد کا کوئی پھل نہیں ہوتا۔ پھر یہ کیوں اُگتے ہیں۔ پھگواڑہ میں کوئی قوت نہیں ہوتی پھر یہ کیوں پیدا ہوتا ہے؟ اس لئے کہ یہ زمین کی زکوٰۃ ہوتے ہیں۔ یہ نہ ہوں تو زمین پر کچھ نہ ہو۔ پھر مجھے بتایا گیا ہاروت اور ماروت کنوئیں میں الٹے نہیں لٹکے بلکہ وہ "چلہ معکوس" میں مگن ہیں کہ جس نے بھی وقت پر قابو پانا ہے اسے اسی طرح الٹا لٹکنا ہوگا۔

میں مڈل پاس کر کے چکوال کے ہائی سکول میں داخل ہو گیا۔ وہاں پوری کلاس میں میرا کوئی دوست نہیں تھا۔ میں بالکل الگ تھلگ اور خاموش رہتا تھا۔ سکول کا کام اور پڑھائی میں ٹھیک تھا۔ اس لئے استاد بھی مجھ پر زیادہ دباؤ نہیں ڈالتے تھے۔ چھٹی کے بعد گھر آتا، کھانا کھانے کے بعد کتابیں لے کر شہر سے باہر نکل جاتا۔ وہاں میرا "اتالیق" میرا انتظار کر رہا ہوتا۔ وہ میری انگلی پکڑتا اور مجھے کسی ویران جگہ پر لے جاتا۔ پھر وہ مجھے پڑھانے لگتا۔ سب سے پہلے نصاب کی کتابیں کھول کر سکول کا کام کراتا، سبق یاد کراتا، اگلے دن کا سبق پڑھاتا اور جب اس سے فارغ ہو جاتا تو پھر وہ "اندرونی" علم سکھاتا۔ قرآن مجید کے واقعات، ان کا پس منظر، دوسری سماوی کتب میں ان کے ریفرنس پھر دنیا کا کلاسیکی ادب۔ میں نے اس سے کئی مرتبہ پوچھا تم مجھے انگریزی، الجبرا، فزکس اور کیمسٹری کیوں پڑھاتے ہو، ان کا تو روحانیت سے کوئی تعلق نہیں۔ تو وہ ہنس کر کہتا ہم یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں تم زندگی کی محرومیوں سے تنگ آ کر "ادھر" نہیں آئے۔ تم ابو بن ادھم ہو۔ جس کے پاس سب کچھ تھا لیکن اس نے جذب و مستی کی زندگی کا انتخاب کیا۔ تم نے مادی زندگی کی تمام خوشیاں چھوئی ہیں۔ شاندار تعلیم، اعلیٰ عہدہ، عزت، شہرت، ناموری گاڑی، بنگلہ، عورت، بچے، پیسہ سب کچھ۔ تاکہ کوئی یہ نہ کہے تم کمزور تھے۔ تم نادار تھے، تم بے نام تھے، تم محروم تھے اور تم جاہل تھے اس لئے اللہ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔

میں نے میٹرک کا امتحان دیا تو پہلی پوزیشن حاصل کی۔ ایف اے کیا تو اعزاز کے ساتھ، بی اے کیا تو وہ بھی اعلیٰ درجے میں، پھر ایم اے انگریزی میں بھی پوزیشن لی۔ اس کے بعد مجھے فوج میں اپلائی کرنے کا حکم دیا گیا۔ میں نے اپلائی کر دیا۔ بڑی آسانی سے میری

سلیکشن ہو گئی۔ کاکول اکیڈمی سے فراغت کے بعد میری پوسٹنگ بلوچ رجمنٹ میں ہوئی۔ یہ نواب آف بہاولپور کی رجمنٹ تھی۔ جو ون یونٹ کے بعد پاک آرمی میں ایمرج ہو گئی۔ ان دنوں یہ رجمنٹ آزاد کشمیر میں ستہ پانی کے قریب کالا دیو کے جنگل میں تعینات تھی۔ اس وقت سیز فائر لائن کی صورتحال بہت خراب تھی۔ روزانہ بھارتی مورچوں سے آزاد کشمیر کی آبادیوں پر فائرنگ ہوتی تھی۔ جواباً ہم بھی اپنی توپوں کے منہ کھول دیتے۔ جس سے کبھی کبھار تھوڑا بہت جانی نقصان بھی ہو جاتا۔ ایک رات بھارتی فوجیوں نے سیز فائر لائن کراس کی اور آزاد علاقے میں آ کر اپنی چوکی قائم کر دی۔ دوسرے روز جب ہمیں خبر ہوئی تو ہم نے جوابی تیاریاں شروع کر دیں۔ حالات بہت خطرناک صورت اختیار کر رہے تھے۔ جس سے خدشہ تھا کہ کہیں یہ جھڑپیں پورے علاقے کو جنگی لپیٹ میں نہ لے لیں۔ اسی شام میں ٹہلتا ٹہلتا دشمن کے علاقے میں چلا گیا۔ ادھر سے میرے پیروں میں فائرنگ کی گئی تو میں نے ہاتھ اوپر اٹھائے اور تیزی سے بھارتی مورچوں کی طرف بڑھنے لگا۔ یہ دیکھ کر ایک ہندو میجر نے میگافون پر مجھ سے پوچھا تم کون ہو؟ اور ادھر کیوں آ رہے ہو؟ میں نے چیخ کر کہا میرا نام ''رام لعل'' ہے میں بھارتی انڈین انٹیلی جنس میں آفیسر ہوں اور آفیشل ڈیوٹی پر پاکستان گیا تھا۔ اب دشمن کے قیمتی راز چرا کر لایا ہوں۔ یہ سن کر میجر مورچے سے باہر آیا اور میری تلاشی لے کر مجھے کیمپ میں لے گیا۔ جہاں مجھے میس کے ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ ساتھ ہی میری شناخت کے لئے دہلی پیغام بھیج دیا گیا۔ یہ ایک بہت ہی خطرناک کھیل تھا۔ جس میں میری جان جانے کا سو فیصد امکان تھا لیکن ایک غیر مرئی قوت میرے ساتھ تھی۔ اس وقت مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ لوگ میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔ شام کو مجھے ڈائننگ ہال میں لایا گیا۔ ہال ہندو آفیسرز سے بھرا ہوا تھا۔ مجھے بریگیڈ کمانڈر کے سامنے بٹھا دیا گیا۔ اس نے دیکھتے ہی میرا انٹرویو شروع کر دیا۔ اس کے لہجے سے یوں محسوس ہوا جیسے اسے میری اصلیت کا علم ہو چکا ہے۔ لہٰذا میں نے مزید جھوٹ بولنے یا رسک لینے کے بجائے نیپکن کھولتے ہوئے کہا، میرا نام کیپٹن عزیز ہے۔ نائنتھ عباسیہ بلوچ رجمنٹ سے تعلق رکھتا ہوں اور میں آپ لوگوں سے مذاکرات کے لئے آیا ہوں۔ میرے اس انکشاف سے جونیئر آفیسرز کے ہاتھوں سے چمچ پھسل کر پلیٹوں میں گر گئے اور وہ غصے سے اپنی نشستوں پر کھڑے ہو گئے۔ بریگیڈیئر نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں بیٹھنے کا حکم دیا اور

ساتھ ہی سالن کا ڈونگا میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا، میرا نام بریگیڈیئر جسونت سنگھ ہے۔ تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ کہاں کے رہنے والے ہو۔ میں نے ڈونگا پکڑتے ہوئے بڑے اطمینان سے کہا، ''چکوال''۔ ہوں بریگیڈیئر نے ہنکارہ بھرا اور کہا پھر تو تم میرے ''گرائیں'' ہوئے، میں ''بھون'' کا رہنے والا تھا۔ تقسیم کے بعد ادھر آ گیا۔ اب چکوال کیسا ہے؟ اور پھر اس کے ساتھ ہی چکوال کی باتیں شروع ہو گئیں۔ بریگیڈیئر جسونت سنگھ اپنی جنم بھومی کے سلسلے میں بڑا جذباتی تھا۔ وہ تقریباً گھنٹہ بھر اپنے بچپن، اپنی سکول لائف پھر اپنے کیریئر کے ابتدائی دنوں اور اپنے پرانے دوستوں کی باتیں کرتا رہا۔ میں درمیان میں اسے ٹوک ٹوک کر نئی صورتحال کے بارے میں مطلع کرتا رہا۔ کھانے کے بعد ہم نے چائے پی پھر وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گیا۔ وہاں بھی یہی گپ شپ ہوئی۔ رات گئے جب ہم اصل ''ٹاپک'' پر آئے تو میں نے اسے سیز فائر لائن کی صورتحال، بھارتی قبضے اور اس کے نتائج کے بارے میں بڑی تفصیل سے بتایا۔ جس سے اس نے اتفاق کرتے ہوئے اپنے جوانوں کو پرانی پوزیشن پر واپس لانے کی یقین دہانی کرا دی۔ دوسرے روز مجھے باعزت طریقے سے واپس بھیج دیا گیا۔ میں اپنی یونٹ میں آیا تو مجھے فوراً گرفتار کر لیا گیا۔ پھر ایک لمبا ٹرائل ہوا۔ جس میں میں نے ساری واردات کھول کر بیان کر دی۔ چند روز بعد جب بھارتی دستے پسپا ہو کر پرانی پوزیشنوں پر چلے گئے تو میرے سینئرز کو میری بات پر یقین آ گیا لہٰذا میری رپورٹ جی ایچ کیو بھیج دی گئی۔ جہاں سے ۲۳ مارچ ۱۹۶۰ء کو میری پروموشن کا آرڈر آ گیا۔

کچھ عرصے بعد میں ایجوکیشن کور میں چلا گیا۔ مجھے پہلے کاکول اکیڈمی کیڈٹس کو پڑھانے کی ذمہ داری دی گئی لیکن جلد ہی میں وہاں سے سبکدوش ہو گیا کیونکہ میں نے لاء میں داخلہ لے لیا تھا، ایل ایل بی کیا، پھر سرکاری اخراجات پر بار ایٹ لاء کیا اور واپس ایجوکیشن کور میں آ گیا۔ اب میرا تبادلہ سٹاف اینڈ کمانڈ کالج کوئٹہ میں ہو گیا۔ جہاں آفیسرز کو تعلیم دینا میری ذمہ داری ہو گئی اور ہاں میں ایک اور بات بتانا بھول گیا فوج میں آنے کے بعد میرے پہلے ''اتالیق'' کی ذمہ داریاں ختم ہو گئی تھیں اور اب اس کی جگہ دوسرے ''اتالیق'' نے لے لی۔ میں نے اس کی ہدایات پر مختلف ''وظائف'' شروع کر دیئے تھے، مجھے پہلے پہل اسماء الٰہی پڑھنے کے لئے دیئے گئے، پھر مخصوص آیات قرآنی کی تلاوت کا حکم ہوا۔ پھر چلہ کشی کا مرحلہ آیا پھر مراقبہ اور آخر میں نفس

کشی کی مشقیں۔ میں جوں جوں ان مشکل مراحل سے گزرتا چلا گیا میری ذات میں روشنی سی اترتی چلی گئی۔ اپنے آپ پر اعتماد اور اپنے رب پر یقین بڑھتا چلا گیا۔ میرے لفظوں میں کشش اور میری آنکھوں میں تپش پیدا ہونے لگی۔

پھر مجھے کہا گیا ''موسیقی سیکھو'' میں نے ہارمونیم، طبلہ اور ستار خرید لیا۔ کوئٹہ میں موسیقی کے استاد تلاش کئے اور باقاعدہ سیکھنا شروع کر دیا۔ چند ہی ماہ کی محنت سے مجھے گانے اور بجانے میں مہارت حاصل ہو گئی۔ انہی دنوں پاک آرمی کے زیرِ انتظام کوئٹہ میں ایک خفیہ پروپیگنڈا ریڈیو سٹیشن قائم کیا گیا، اس کا نام ''کہکشاں'' رکھا گیا۔ مجھے اس کا انچارج بنا دیا گیا۔ اس ریڈیو کی نشریات پہلے کوئٹہ اور بعد ازاں کراچی سے ''ریلے'' کی جاتی تھیں۔ میں نے اس ریڈیو سے گھونگٹ، دامن اور روٹی کے نام سے تین قسط وار ڈرامے شروع کئے۔ یہ ڈرامے میں نے خود لکھے اور ان کے زیادہ تر کردار بھی میں نے خود ہی کئے جبکہ موسیقی اور گلوکاری بھی میری ہی تھی۔ بعد ازاں انہی ڈراموں کے سکرپٹس پر فلمیں بنیں۔ گھونگٹ کی کہانی خورشید انور نے لی اور فیض احمد فیض نے اس کے لئے گانے لکھے۔ اس فلم کی کامیابی پر دامن اور روٹی کو بھی فلمایا گیا۔ یہ فلمیں بھی بڑی ہٹ ہوئیں۔ گھونگٹ فلم کی اوپننگ لال کباب والا کے قریب عصمت ٹاکیز میں میرے ہی ہاتھوں ہوئی تھی۔ یہ فلم چھ ماہ میں مکمل ہوئی۔ انہی دنوں میں نے ''کہکشاں ریڈیو'' سے نیلام گھر شروع کیا۔ اس میں ہم ایسے سوالات منتخب کرتے تھے جن سے ہمارے دشمنوں کی آئیڈیالوجی کو نقصان پہنچتا تھا۔ یہ پروگرام بڑا مقبول ہوا۔ بڑی مدت بعد جب پاکستان میں ٹیلی ویژن شروع ہوا تو طارق عزیز نے یہ پروگرام ٹی وی پر شروع کر دیا۔ یہ پروگرام طویل عرصے تک جاری رہا۔ انہی دنوں میں نے ''ہیر وارث شاہ'' سے فحش کلام خارج کر کے اسے دوبارہ شائع کیا۔ یہ کتاب آج بھی بازار سے ۷۵ روپے میں دستیاب ہے۔ جس پر پبلشر عزیز بار ایٹ لاء چھپا ہوا ہے۔ میں نے اسی عرصے میں ''اوم پرکاش'' کے فرضی نام سے قانون کی ایک کتاب بھی لکھی ''چارٹر آف یو این او'' ایک ہندو جج بی جے ڈیبا نے اس کا دیباچہ لکھا۔ یہ کتاب آج بھی پاکستان اور بھارت میں پڑھائی جاتی ہے۔

وہ میرے لئے معاشی آسودگی کا دور تھا۔ مجھے ''جہلم ابدال'' سے بزرگوں کی وراثت سے بڑی بھاری رقم ملی تھی اس سے میں نے کوئٹہ میں بڑا خوبصورت گھر بنایا۔ گاڑی خریدی، ہر

وقت تھری پیس سوٹ میں ملبوس رہتا تھا۔ قیمتی ترین سگریٹ، نایاب خوشبو اور سونے کا ایش ٹرے استعمال کرتا۔ بیوی تھی، بچے تھے۔ شہر میں عزت تھی، یار احباب کا ایک وسیع حلقہ تھا، مجھ سے اے کے بروہی جیسے لوگ بڑی محبت کرتے تھے۔ کمانڈ اینڈ سٹاف کالج میں بڑی قدر تھی۔ شہر کی سیناؤں میں بڑا نام تھا لیکن میں اندر سے بری طرح ڈرتا رہتا تھا کیونکہ میں تیزی سے اس حد کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں سے میں نے پلٹنا تھا کیونکہ لوگ اب مجھے رشک بھری نظروں سے دیکھنے لگے تھے مجھے مقدر کا سکندر سمجھنے لگے تھے۔ پھر ایک روز مجھے حکم دیا گیا، اب رقص سیکھو۔ انکار کی کسے تاب تھی۔ میں دوسرے روز کوئٹہ کے مشہور رقاص استاد صادق کے پاس پہنچ گیا۔ وہ مجھے چھ ماہ تک ٹریننگ دیتے رہے۔ جب میں ''کتھا گھر بھرنے'' کا مشکل ترین رقص سیکھ گیا تو مجھے حکم دیا گیا اب رابرٹ مارکیٹ میں ہسپتال کے سامنے رقص کرو۔ اگلے روز میں چوک میں کھڑا ہو کر ناچنے لگا۔ سینکڑوں لوگ جمع ہو گئے، ٹریفک رک گئی، لوگ حیران تھے کہ ان کے سامنے شہر کا معروف شخص پاگلوں کی طرح ننگے پاؤں ناچ رہا ہے لیکن میں اس تمام تر جگ ہنسائی سے لاتعلق ناچتا رہا، ناچتا رہا۔ یہاں تک کہ میں ہوش سے بیگانہ ہو گیا۔ اس کے بعد مجھے کچھ علم نہیں عمر عزیز کہاں بسر ہوئی۔ کہاں کی خاک چھانی۔ کہاں کہاں رہا۔ بیچ میں ایک بار ہوش آیا تو خود کو کسی جیل میں پایا۔ کمزور اور لاغر تھا۔ شیو بڑھی ہوئی تھی۔ بال پریشان تھے اور منہ سے رال ٹپک رہی تھی۔ چند لمحوں بعد دوبارہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا۔ بس ایک ہی حس کام کر رہی تھی وہ تھی، ''اتالیق'' کے ہر حکم پر سر تسلیم خم کرنا۔ ایک بار ہوش آیا تو میں ایک بڑے سے گٹر میں اس طرح الٹا لٹکا ہوا تھا کہ سر کے قریب سے شہر بھر کا بول و براز گزر رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر خرد کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ فنا کے اس عالم میں مجھے کسی بھی حرکت پر کنٹرول نہ رہا تھا' میں شہر شہر خاک چھانتا رہتا تھا۔ جنگلوں میں مارا مارا پھرتا تھا۔ دریاؤں کے کنارے پڑا رہتا۔ تن کے کپڑے تار ہو گئے۔ داڑھی بڑھتے بڑھتے ناف تک پہنچ گئی۔ سر کے بالوں نے پوری کمر ڈھانپ دی۔ کبھی ہوش آیا تو خود کو کسی درگاہ پر پایا۔ کبھی کسی مزار پر۔ کبھی کسی کے پاؤں میں پڑا ہوں، کبھی کسی سے پتھر کھا رہا ہوں۔ یہاں تک کہ ۱۹۹۰ء آ گیا۔ یہ ۲۶ برس میرا جسم کھا گئے۔ میرے ہوش، میرے ایڈیکیلس کھا گئے۔ مجھے مجھ سے دور کر گئے، لیکن میرے اندر ایک جہان تھا، نیا، حیرت انگیز جہاں۔ ۱۹۹۰ء میں جب مجھے شعور واپس دیا گیا تو میں راولپنڈی میں فیض آباد کے قریب

قبرستان میں پڑا تھا۔ وہاں ایک میجر صادق ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے شفا کی خصوصیت دے رکھی تھی۔ وہ پانی کے گلاس میں انگلیاں ڈبو کر جس مریض کو پلاتا تھا وہ صحت یاب ہو جاتا تھا۔ وہ مجھے پکڑ کر ساتھ لے گیا۔ مجھے کپڑے پہنائے، شیو کرائی، بال صاف کئے اور انسان بنایا۔ میں بڑا عرصہ اس کے گھر پڑا رہا۔ وہ میری بے تحاشا عزت کرتا تھا۔ اس کے گھر آنے والے لوگ مجھے درویش سمجھ کر میرے پاس آ بیٹھتے۔ صادق مجھے دعا کرنے پر مجبور کرتا، میں ہاتھ اٹھا دیتا۔ اب پتہ نہیں کیوں اللہ تعالیٰ میری بات کو قبولیت کی سند دے دیتا تھا۔ لوگوں کے کام ہو جاتے تھے۔ بڑی جلد میری شہرت دور تک پھیل گئی۔ لوگ میجر صادق کے گھر ٹوٹ پڑے تو اتنے لوگ دیکھ کر میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ جسم میں عجیب قسم کی بے چینی پھیلنے لگی۔ پھر میں ایک دن وہاں سے بھی فرار ہو گیا۔ اب چکوال میرا ٹھکانہ تھا۔ پورا شہر میرے لئے اجنبی ہو چکا تھا۔ پرانے یار احباب سب بچھڑ چکے تھے۔ بچے مجھے پہچانتے تک نہیں تھے۔ میں بسوں کے اڈے پر پڑا رہتا کوئی کھانے کے لئے دے دیتا تو کھا لیتا۔ نہ دیتا تو ویسے ہی منہ لپیٹ کر پڑا رہتا۔ وہاں بھی جلد ہی لوگوں کو خبر ہو گئی۔ ایک ایسا شخص جو لوگوں کا شجرہ نسب اور ان کی آنے والی نسلوں کا احوال تک جانتا ہو لوگ اسے کب چھوڑتے ہیں۔ میرے آگے پیچھے لوگوں کا میلا لگ گیا۔ یہ ''شوشا'' میرے اتالیق کو پسند نہ آئی لہٰذا اس نے میرا شعور دوبارہ واپس لے لیا۔ میں ایک بار پھر ہوش و حواس سے بے گانہ ہو گیا۔ مجھے یاد نہیں مجھے کن کن شہروں میں کن کن بستیوں میں گھمایا گیا۔ کس کس گندی نالی کا پانی پلایا گیا۔ کوڑے کے کس کس ڈھیر سے رزق نکال نکال کر مجھے کھلایا گیا۔ اس سفر کے دوران بھی کبھی چند لمحوں کے لئے میرے دماغ میں روشنی کے جھماکے ہوتے تو میں کھلی آنکھوں سے اپنے گرد و پیش کو دیکھتا اور خود کو کسی کچرے گھر میں الف ننگا پاتا لیکن یہ تاثر چند لمحوں کا مرہون منت ہوتا۔ اس کے بعد دوبارہ ایک طویل اندھیرا مجھے آ گھیرتا۔ پھر ۹۴ء میں مجھے ایک بار پھر شعور واپس دیا گیا۔

میری زندگی کا یہ فیز قدرے بہتر ہے۔ مجھ پر زیادہ پابندیاں نہیں۔ میں دن میں ایک آدھ بار کھانا کھا سکتا ہوں۔ اپنے گرد و پیش پر نظر ڈال کر چیزوں کی شناخت کر سکتا ہوں۔ لوگوں کے چہرے نام اور پتے کسی حد تک یاد کر سکتا ہوں۔ طالب علمی کے دور کی انگریزی نظمیں، دنیا کے مشہور مقدموں کی روداد اور آلات موسیقی کا استعمال یاد آ رہا ہے۔ انگریزی پر پرانی گرفت بھی

آہستہ آہستہ بحال ہو رہی ہے۔ فلسفہ، منطق اور فکر کی ساری باتیں بھی احاطہ شعور کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ گفتگو کرنے لگوں تو زبان اٹکتی نہیں۔ کسی موضوع پر لکھنا چاہوں تو ہاتھ رکتا نہیں۔ سوچنے لگوں تو سوچ کو ٹھوکر نہیں لگتی، لیکن دوستو! جب لوگوں کی پیشانیوں پر لکھا مقدر پڑھتا ہوں تو کوئی طاقت میری زبان پکڑ لیتی ہے۔ فقروں کا سارا اتار چڑھاؤ پورا ہل جاتا ہے۔

لفظوں کے سارے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں اور سوچ کا سارا عمل بانجھ ہو جاتا ہے۔ میں اس وقت سب کچھ دیکھ رہا ہوتا ہوں لیکن کہہ نہیں سکتا۔ ایسا کیوں ہے؟ شاید قدرت اپنے راز افشا نہیں کرنا چاہتی۔ میں نے ایک بار اپنے اتالیق سے اس بارے میں پوچھا تو اس نے ہنس کر کہا ''تم خدا بننے کی کوشش مت کرو'' اور میں نے کانوں کو ہاتھ لگا کر اپنے رب سے معافی مانگ لی۔

اور اب یہاں کیا ہوگا یہ سینہ کائنات کا ایک ایسا راز ہے جسے میں افشا نہیں کر سکتا۔ میں تو کیا کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ جو کرے گا وہ تباہ ہو جائے گا، لیکن ہاں! میں آپ لوگوں کو ایک بات ضرور بتاتا چلوں، وہ لوگ جن کی عمریں پچاس ساٹھ سال سے زائد ہیں وہ آسمان کی طرف دیکھ کر بتائیں کبھی وہاں بڑے اور خوبصورت ستارے ہوا کرتے تھے اب وہ کہاں گئے؟ ہوا میں رنگ برنگے پرندے اڑا کرتے تھے۔ آپ نے پچھلے پچیس تیس برسوں میں وہ کیوں نہیں دیکھے؟ سڑکوں پر کیڑوں اور جانوروں کی بہتات ہوتی تھی اب کیوں نہیں؟ بارش کے بعد آسمان پر ''فلائنگ کائیٹس'' اڑا کرتی تھیں۔ اب وہ کیوں نظر نہیں آتیں؟ صبح کی خوبصورتی، دوپہر کی تپش اور شام کی نمی کہاں چلی گئی؟ ویرانوں میں اب کوندر (پانی مارتا ہی ایسا پودا جس میں سور رہتے ہیں) زیادہ کیوں پیدا ہوتا ہے؟ لوگو! یہ سب بے مقصدیت کی نشانی ہیں۔ جب لوگوں کی زندگی صرف دن گزارنے تک محدود ہو جاتی ہے تو قدرت ان پر عذاب بھیجتی ہے۔ یہ سب عذاب سے پہلے کی نشانیاں ہیں۔

یہ آپ لوگوں کا المیہ ہے، بے خبر لوگوں کا المیہ۔ جو ''پنج سسٹم'' کی اس جدید سائنسی دنیا میں ہر اس ''واردات'' کو پاگل پن سمجھتے ہیں جس میں بجلی، تیل اور گیس صرف نہیں ہوتی۔ جو حواس خمسہ کی کسوٹی پر پوری نہ اترنے والی ہر حقیقت کو ابہام اور توہم سمجھتے ہیں۔ جو خدا کی تشکیل کردہ حقیقتوں کو اپنے بنائے معیارات پر پرکھتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو خسارے میں رہتے ہیں۔

جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیے۔ جو پوری زندگی اندھیرے میں بھٹکتے رہے۔ مجھے کسی بات پر حیرت نہیں ہوتی کیونکہ میں عالم حیرت سے گزرا ہوا ایک ایسا شخص ہوں جو اب ''من تو شدی تو من شدی'' کے مقام پر کھڑا ہے۔ ہاں البتہ میرے دماغ میں ایک سوال ضرور چمکتا رہتا ہے کہ اے پروردگار میں جن لوگوں میں زندگی گزار رہا تھا تم نے تیس برس کی تپسیا کے بعد مجھے دوبارہ انہی لوگوں میں کیوں لا پھینکا، کیوں؟ پھر جب کائنات کی قوتیں مجھے کوئی جواب نہیں دیتیں تو خود میرا دماغ بولتا ہے شاید مجھے اس لیے اس کرب سے گزارا گیا کہ میں دوادوار کا تجزیہ کرسکوں، میں پچھلے اور آنے والے لوگوں کو دیکھ سکوں۔

• • •

امیر گلستان جنجوعہ

امیر گلستان جنجوعہ بریگیڈیئر کی حیثیت سے فوج سے ریٹائر ہوئے۔ وہ دو ممالک میں سفیر رہے۔ انہیں طویل عرصے تک صوبہ سرحد کا گورنر رہنے کا اعزاز بھی حاصل رہا۔ وہ جنرل ضیاء الحق کے جوانی کے ساتھی تھے۔ آپ کو اس انٹرویو میں ان دنوں کی جھلک نظر آتی ہے جب جنرل ضیاء الحق اور امیر گلستان جنجوعہ محض کیپٹن تھے اور دونوں پیسے ملا کر انگیٹھی کے لیے کوئلے خریدتے تھے۔

......

میرے آباء واجداد صدیوں سے سالٹ رینج میں آباد چلے آرہے ہیں۔ سپہ گری ان کا پیشہ تھا۔ تزک بابری میں ظہیر الدین بابر لکھتا ہے "وہ جب کوہ نمک پہنچا تو وہاں جنجوعہ قبیلے کے راجہ حسن کی حکومت تھی" جنجوعوں نے مغلیہ دور میں مغلوں کا ساتھ دیا۔ ہمیشہ سکھوں کے ساتھ برسر پیکار رہے اور اسی سکھ دشمنی کے باعث انگریزوں سے بھی تعاون کیا۔ سکھوں کا اقتدار ختم ہوا تو انگریز کو مزید فتوحات کے لئے فوجیوں کی ضرورت تھی لہٰذا انگریز افسر پنجاب میں فوجی بھرتی کے لئے آئے تو میرے دادا کے بڑے بھائی مرزا خان کیپٹن جانسن کی پلٹن سیکنڈ پنجاب نیٹو انفنٹری (پی این ایف) میں بھرتی ہو گئے۔ مرزا خان کا قد سات فٹ تین انچ تھا جب وہ صوبیدار ہوئے تو لارڈ رابرٹس نے انہیں اپنا اے ڈی سی بنا لیا' ان دنوں گھوڑے اور اونٹ سواری کا ذریعہ تھے' لارڈ رابرٹس کا قد بہت چھوٹا تھا اور انہیں اونٹ پر سوار ہونے اور اترنے میں بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑتا تھا' مرزا خان کی یہ ڈیوٹی تھی کہ جب اونٹ لارڈ رابرٹس کو لے کر اٹھے تو وہ لارڈ کو پیچھے سے پکڑ رکھیں تاکہ اونٹ کے جھٹکے سے "نازک اندام" لارڈ کو تکلیف نہ پہنچے وہ یہ عمل اونٹ کے بیٹھتے وقت بھی دہراتے تھے۔ مرزا خان کے والدین نے ان کی منگنی توڑ دی تو وہ گاؤں آئے اور اپنی سابق منگیتر کو گھر سے بھاگ چلنے کی ترغیب دی' وہ نہ مانی تو تلوار سے اس کا سر قلم کر دیا اور خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ مقدمہ چلا اور ان کو سزائے موت ہو گئی پھر انہیں جہلم میں عارضی جیل بنا کر پھانسی دے دی گئی۔

مرزا خان کے چھوٹے بھائی (میرے دادا) ۱۸ انوانہ رسالہ میں بھرتی ہو گئے۔ مختلف جگہوں پر ۳۲ برس تک فوجی خدمات سرانجام دینے کے بعد ریٹائر ہوئے تو واپس پنڈ دادن خان آ گئے اور کھیتی باڑی شروع کر دی۔ اپنی ریٹائرمنٹ کے چند روز بعد میرے دادا نے کنواں کھدوایا

جب کنواں مکمل ہو گیا تو وہ پانی ماپنے کے لئے اترے۔ واپسی پر رسہ ٹوٹ گیا وہ گردن کے بل کنویں میں گرے اور ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے چار بیٹے تھے کیپٹن راجہ فیروز خان (میرے والد) کیپٹن راجہ سیف علی خان، نراسب خان اور لیفٹیننٹ شیر افگن۔ اس وقت میرے والد کی عمر دس برس تھی۔

میرے والد پرائمری پاس تھے۔ جب وہ چودہ برس کے ہوئے تو ان کے والد کے ایک دوست انہیں فوج میں بھرتی کرانے لے گئے۔ انگریز نے رکھ لیا۔ ۱۹۰۷ء میں آرمی کا ایک دستہ ایسٹ افریقہ میں صومالی لینڈ گیا' وہ ان کے ساتھ ہندوستان سے باہر چلے گئے۔ چار برس بعد جمعدار بن گئے۔ 1918ء تک وہیں رہے پھر واپس پلٹن میں آ گئے۔ ۱۹۲۵ء میں میرے والد صمانہ کے قریب فورٹ گلستان میں انچارج تھے۔ چودہ اگست ۱۹۲۵ء کو میں وہاں فورٹ گلستان میں پیدا ہوا۔ والد نے جائے پیدائش کی مناسبت سے میرا نام امیر گلستان جنجوعہ رکھ دیا۔ ساڑھے چار برس کی عمر میں مجھے سکول داخل کرا دیا گیا۔ مجھے پڑھنے کا بہت شوق تھا لہٰذا والد نے مجھے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا۔ بچپن والد کے ساتھ ساتھ ہنگو، ٹل فقیر، بیپی، میران شاہ، میر علی اور کوہاٹ میں گزرا۔ ۱۹۳۵ء میں والد شاہ برطانیہ کے اے ڈی سی بن گئے تو میں ان کے ساتھ لندن چلا گیا۔ وہاں جارج پنجم، کنگ ایڈورڈ ہشتم اور جارج ششم کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ شاہی خاندان کی تقریبات میں شرکت کی۔ انگریزوں کا کروفر بھی دیکھا اور نظم و ضبط بھی۔ ہم ۱۹۳۸ء میں واپس بھارت آ گئے اور پھر جنگ عظیم دوم شروع ہو گئی۔ والد صاحب محاذ پر چلے گئے اور میں گارڈن کالج راولپنڈی میں فرسٹ ایئر میں داخل ہو گیا۔ مجھے کھیلوں کا بہت شوق تھا۔ کالج میں فٹ بال ٹیم کا کپتان بن گیا۔ پنجاب یونیورسٹی تک، جس کا دائرہ کار اس وقت کے پاکستان سے بھی زیادہ تھا' میں نے فٹ بال کھیلا' میرے کھیل کا دور دور تک شہرہ تھا۔ شہرت سن کر گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل نے مجھے خط لکھا کہ اگر آپ ہمارے کالج میں داخلہ لینا چاہیں تو ہمیں خوشی ہو گی۔ میں نے پیشکش قبول کر لی اور سیکنڈ ایئر میں لاہور گورنمنٹ کالج منتقل ہو گیا۔ وہاں پر کراس کنٹری لیول کی اتھلیٹکس کیں، باکسنگ شروع کی اور نادرن انڈیا کا چیمپئن بن گیا۔ وڈ پولو کی طرف گیا تو ایوارڈ لے لیا۔ واہ جوانی کی بھی کیا بات تھی شکست نام کی کوئی چیز نہیں تھی...... ۴۶ء میں بی اے کیا تو میرے پاس پنجاب یونیورسٹی کے چار اعلیٰ اعزاز تھے۔

انگریز نے جنگ عظیم دوم کے دوران ڈیرہ دون کو او ٹی ایس بنا دیا تھا۔ جنگ کے بعد

اسے دوبارہ اکیڈمی کی شکل دے دی۔ وہاں میں نے پوسٹ وار سیکنڈ ریگولر کورس میں کیڈٹ کی حیثیت سے شرکت کی۔ اکیڈمی میں فٹ بال ٹیم کا کپتان رہا' باکسنگ کھیلی' دوڑیں لگائیں' وہاں بریگیڈیئر اکبر' جنرل جمال میاں (سابق وزیر ریلوے اور واپڈا) جنرل شفقت سعید (اے این سی، سابق سیکرٹری اطلاعات اور سفیر) جنرل میاں عبدالقیوم اور ہندوؤں میں جنرل ہریش چندرا (سابق ڈپٹی چیف آف آرمی سٹاف انڈیا) جنرل منوہر لعل چیڑ، جنرل ہمتھ سند راتو والیہ جنرل جی ریس راوت اور جنرل ریڈی میرے کورس میٹ تھے۔

اکتوبر ۴۷ء میں ٹریننگ مکمل کرانے کے بعد میں پاکستان آ گیا۔ میری پہلی پوسٹنگ میرے والد کی پلٹن پٹھر (پی آئی ایف ایف ای آر) میں ہوئی۔ یہ پلٹن انگریز نے ۱۸۴۳ء میں بنائی تھی اور اس میں میرے خاندان کی خدمات کا کوئی مقابلہ نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ میرے والد اور دادا سے لے کر آج تک میرے خاندان کے ۲۵۰ سے زائد افسروں نے اس میں خدمات سرانجام دی تھیں۔

قائداعظم سے میری دو ملاقاتیں ہوئیں۔ قیام پاکستان سے قبل ہم لوگوں نے گورنمنٹ کالج میں ایم ایس ایف کی بنیاد رکھی۔ ہندو پرنسپل نے ہماری اس حرکت پر بڑا ادھم مچایا لیکن ہم لوگوں نے سٹینڈ لیا۔ ۱۹۴۵ء میں جب قائداعظم نے لاہور کے دورے کا اعلان کیا تو علامہ عنایت اللہ مشرقی نے دھمکی دی کہ جناح لاہور آیا تو زندہ واپس نہیں جائے گا۔ ہم لوگوں نے سنا تو بڑے پریشان ہوئے۔ ایک روز ایم ایس ایف کے سیکرٹری جنرل قاسم رضوی (سی ایس پی) میرے پاس آئے اور کہا کہ ہم لوگوں نے قائداعظم کی حفاظت کا فیصلہ کیا ہے تم بھی ہمارا ساتھ دو۔ میں نے فوراً ہاں کر دی۔ دوسرے روز ہم نے ''ممدوٹ ولا'' کو گھیرے میں لے لیا۔ ہم نے دیال سنگھ، گورنمنٹ، ایف سی اور اسلامیہ کالج کے لڑکوں کے سیکٹر بنا دیئے تھے جو باری باری قائداعظم کی حفاظت کرتے۔ ممدوٹ ولا کے کھانے کا بندوبست بھی ہم نے سنبھال لیا تھا۔ جب ہمارے گروپ کی باری آئی تو قائداعظم اسلامیہ کالج کی تقریب میں شرکت کے لئے باہر نکلے تو گیٹ پر میں کھڑا تھا۔ قائداعظم نے ہاتھ ملایا' کچھ رسمی باتیں کیں اور روانہ ہو گئے۔ ان سے دوسری ملاقات قیام پاکستان کے بعد ہوئی جب قائداعظم خان عبدالقیوم خان کے ساتھ بنوں کے دورے پر آئے۔ بنوں ایئرپورٹ شہر سے سات آٹھ میل باہر تھا۔ میں نے قائداعظم کو ایئرپورٹ پر ریسیو کیا اور انہیں ''ایسکارٹ'' کرتے ہوئے ان کی اقامت گاہ تک پہنچایا' میں دورے کے اختتام پر

بھی ان کے ساتھ تھا۔ ایئرپورٹ پر قائداعظم سے ملاقات کے لئے علاقے کے ملک جمع تھے۔ سیکورٹی کی وجہ سے یہ ملک ایئرپورٹ سڑپ سے ہٹ کر ایک ''چھپڑ'' کے قریب کھڑے تھے۔ قائداعظم انہیں دیکھ کر ان کی طرف بڑھے اور ان سے فرداً فرداً ہاتھ ملایا' میں ان کے ساتھ ساتھ رہا۔ ملکوں سے ملاقات کے بعد قائداعظم میری طرف مڑے ہاتھ ملایا اور کہا ''تھینک یو کیپٹن'' اور میں نے انہیں سیلوٹ کیا ..... یہ ان سے آخری ملاقات تھی۔

۱۹۴۹ء میں مجھے گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین کے باڈی گارڈز کا ایجوٹنٹ لگا دیا گیا۔ وہاں شیڈول بڑا ٹائٹ تھا۔ ہر وقت گورنر جنرل کے ساتھ رہنا پڑتا تھا' شام کو سوشل فنکشنز میں بھی حاضری ضروری تھی۔ میں کھیلوں کا رسیا تھا۔ سکوائش اور فٹ بال کا تو مجھے نشہ تھا۔ بڑے برے پھنسے۔ روزانہ دوپہر کا کھانا خواجہ صاحب کے ساتھ کھانا پڑتا تھا۔ ایک روز کھانے کی میز پر میرا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر خواجہ صاحب نے پوچھا ینگ مین کیا مسئلہ ہے؟' تو پتہ نہیں کہاں سے میرے اندر جرأت آ گئی اور میں چلا اٹھا ''سر! میں سپورٹس مین ہوں اور ان لوگوں نے مجھے باڈی گارڈز میں لگا دیا۔'' خواجہ صاحب بھونچکے رہ گئے تھوڑی دیر تک سوچا اور پھر میرے کمانڈنگ آفیسر جنرل جہانزیب کو بلا کر کہا اسے واپس یونٹ بھیج دو اور میں واپس آ گیا۔

اس سال ہم لوگوں نے نوشہرہ میں ایک کورس کیا۔ جنرل وجاہت، جنرل اعجاز' جنرل فضل حق اور بریگیڈیئر بابر بشیر (نصیر اللہ بابر کے کزن) بھی میرے ساتھ تھے۔ کورس ختم ہوا تو شام کو میس میں پارٹی تھی' پارٹی کے دوران کیپٹن ضیاء میرے پاس آئے اور کہا کہ تم چراٹ میں میرے نمبر ٹو آ رہے ہو۔ میں نے کہا کیوں نہیں۔ یہ بات ہفتے کی ہے اتوار کو چھٹی تھی۔ پیر کو کیپٹن ضیاء کے ساتھ طویل رفاقت کا سفر شروع ہو گیا..... کیپٹن ضیاء چراٹ میں بوائز ونگ چلا رہے تھے۔ بوائز ونگ انگریزوں کے دور میں شروع ہوئی تھی اور ایوب کے دور میں ختم ہوئی' اس میں ہم ۱۲، ۱۳ برس کے لڑکے لیتے تھے انہیں ٹریننگ دیتے اور جب وہ ۱۷، ۱۸ برس کے ہو جاتے تو مستقل آرمی میں بھرتی کر لیتے۔ کیپٹن ضیاء اس ونگ کے انچارج تھے اور میں ان کا نمبر ٹو' وہ بھی غیر شادی شدہ تھے میں بھی کنوارہ۔ وہ بھی بغیر فیملی کے' میں بھی اکیلا۔ ایک پہاڑی پر ان کا بنگلہ تھا دوسری پر میرا گھر' سردیوں میں سخت سردی پڑتی تھی تو ہم لوگ کمرے گرم کرنے کے لئے لکڑی کے کوئلے جلاتے تھے۔ ایک روز ہم مل بیٹھے اور فیصلہ کیا کہ ہم دونوں بڑے بڑے گھروں میں اکیلے رہتے ہیں۔ اپنا اپنا کوئلہ جلاتے ہیں جو اسراف ہے لہٰذا ہمیں ایک ہی گھر میں آ جانا چاہیے۔ دوسرے روز میں نے

اپنا بستر اٹھایا اور ان کے گھر آ گیا۔ اس زمانے میں کوئلے کی بوری تین روپے چھ آنے میں آتی تھی۔ آدھے پیسے میں ڈالتا تھا اور آدھے ضیاء۔ یوں ہم نے کوئلے سینک سینک کر سردیاں گزار دیں۔ وہاں ہم ایک برس تک اکٹھے رہے۔ ضیاء الحق مجھے روز فجر کی نماز کے لئے اٹھا دیتے تھے۔ سخت سردی ہوتی تھی' میں ان سے کہتا ضیاء تمہاری ساری باتیں درست ہیں لیکن یہ فجر کے وقت مجھے نہ اٹھایا کرو۔ میں سپورٹس مین ہوں شام کو کھیل سے تھکا ہوتا ہوں اور وہ مسکرا دیتے' وہ عجیب انقلابی روح تھا مثلاً اس نے بوائز ونگ میں پہلی مرتبہ سیلف فارمیشن شروع کی اور روز صبح دعا ہوتی' باجماعت نماز ہوتی' اسلامی شعائر کی ترویج کی جاتی اور بوائز کو جسمانی ٹریننگ کے ساتھ ساتھ اسلامی تربیت بھی دی جاتی۔ ان تمام مشاغل سے وقت ملتا تو ضیاء کتابیں لے کر بیٹھ جاتے۔ ایک برس بعد ۱۹۵۰ء میں ضیاء کوہاٹ گائیڈز کیولری میں چلے گئے اور میں نوشہرہ پھر وہ ایجوٹنٹ آف دی سینٹر بن کر نوشہرہ آ گئے اور میں کوہاٹ چلا گیا وہاں کبھی وہ میرے گھر آ جاتے اور کبھی میں نوشہرہ ان کے پاس۔ وہ صدر میں رہتے تھے ان کے گھر ان کے والد، والدہ اور بہن سے ملاقاتیں ہوتیں مجھے ان کے گھر کے ممبر کی حیثیت حاصل تھی۔ اکٹھے کھانا' باتیں کرنا وہ بڑا خوبصورت وقت تھا' کیا بات تھی' کوئی فکر تھی نہ اندیشہ۔ ۵۰ء میں ہی نہرو نے پاکستان کو جنگ کی دھمکی دے دی' سرحدوں پر بھارتی فوجیں جمع ہو گئیں تو ادھر سے خان لیاقت علی خان نے بھارت کو مکا دکھا دیا اور ہماری ساری فوج بھی بارڈرز پر چلی گئی۔ ہماری یونٹ سیالکوٹ موو کر گئی وہاں ہم سرحد پر ایک برس تک بھارت کو مکا دکھاتے رہے۔ سرحدوں پر کشیدگی کے باوجود جنگ نہ ہوئی خطرات ٹل گئے تو یونٹ واپس پنڈی آ گئی۔ میں اور ضیاء پھر اکٹھے ہو گئے۔ ایم ایچ کے سامنے پامل لائنز ہوا کرتی تھی وہاں میں اور ضیاء اکٹھے رہتے تھے وہ ۵۳ء سے ۵۵ء تک ایجوٹنٹ رہے۔ ۵۵ء میں سٹاف کالج کوئٹہ چلے گئے اور میں ان کی جگہ ایجوٹنٹ بن گیا۔ ضیاء سٹاف کالج کر کے آئے تو میں سٹاف کالج چلا گیا۔ دسمبر ۵۶ء میں وہاں سے واپس آیا اور ان کے ساتھ سٹاف آفیسر کی حیثیت سے کام کرنے لگا' وہ اس وقت بریگیڈ میجر تھے۔ ۱۴۶ مری روڈ (آج کل وہاں ضیاء فاؤنڈیشن کا دفتر ہے) میں ان کی رہائش تھی' میں ایم ایس آئی ہسپتال کے قریب رہتا تھا۔ ویسٹریج میں ہمارا دفتر تھا' صبح وہ سائیکل پر میرے گھر آتے اور میں اپنا سائیکل تیار کر کے کھڑا ہوتا۔ وہاں سے ہم دفتر روانہ ہو جاتے۔ چڑھائی کے دوران جب ہم زور زور سے پیڈل چلاتے تو سامنے سے سردیوں کی یخ ہوائیں ہمارے ساتھ لپٹ جاتیں۔ ہاتھ اور چہرہ ٹھنڈ سے جم سا جاتا اور جب گرمیاں ہوتی تو تپتی

دوپہروں میں ہم دفتر سے واپس گھر آتے۔ راستے میں جہاں سایہ دیکھتے گھڑی دو گھڑی دم لینے کے لئے رک جاتے اور جب بارش ہوتی تو ہم درختوں کی پناہیں ڈھونڈتے۔ آج بھی جب میں ویسٹرنج جاتا ہوں تو راستے میں مجھے جگہ جگہ میجر ضیاء الحق کے قہقہے اور اپنی شوخیاں بکھری نظر آتی ہیں اور میں وہ وردیاں بھی آج تک نہیں بھولا جو ہم نے اس راستے پر کبھی پسینے اور کبھی بارش میں بھگوئیں اور وہ رومال اور مفلر بھی میرے گھر سے ہی نکلیں گے جو ہم سردیوں کے تیز چبھنے والی ہواؤں سے بچنے کے لئے استعمال کرتے تھے ان ہی دنوں ضیاء الحق کے بچے پیدا ہوئے میری شادی بھی اسی دوران ہوئی۔

ہمیں مارشل لاء کا پہلا تجربہ ۵۸ء میں ہوا۔ بریگیڈ میں دو میجر ہوتے ہیں ویسٹرنج میں ضیاء اور میں تھے۔ مارشل لاء کا حکم آتے ہی رات کو ضیاء اور میں نے ڈاک خانہ، خزانہ، ٹیلی گراف آفس، بینک اور پنڈی کے مرکزی پل اپنی حفاظت میں لے لئے۔ دوسرے روز ہمیں عوام کی طرف سے بھرپور ایجی ٹیشن کا خطرہ تھا لیکن صبح سات بجے ہم نے دیکھا مری روڈ پر معمول کے مطابق ٹریفک چل رہی ہے۔ لوگ سکون سے دفتر جا رہے ہیں' سب کچھ نارمل ہے تو ہمیں بڑی حیرت ہوئی۔ مارشل لاء کے کچھ روز بعد سکندر مرزا چلے گئے اور فیلڈ مارشل ایوب خان نے اقتدار سنبھال لیا۔

۱۳ نومبر ۱۹۵۸ء کو میں اور ضیاء کھاریاں چلے گئے۔ چھاؤنی بن رہی تھی۔ سڑکیں بن رہی تھیں۔ رہائشی کمرے نہیں تھے۔ میں اور ضیاء ایک خیمے میں رہتے رہے۔ جب کمرے بن گئے تو میں اور وہ ایک کمرے میں رہے۔ چھاؤنی کے تمام درخت ہمارے ہاتھوں کے لگے ہوئے ہیں۔ اس دوران ان کی بریگیڈ میجری کے تین سال پورے ہو گئے اور وہ کورس کے لئے امریکہ چلے گئے۔ وہ واپس آئے تو میں کورس کے لئے چلا گیا۔ وہ رجمنٹ میں آ گئے۔ میں بھی کورس کے بعد رجمنٹ میں آ گیا۔ رجمنٹ میں تین سکواڈرن ہوتے ہیں ایک کی کمان ضیاء کے پاس تھی۔ دوسری کی میرے پاس اور تیسری کے کمانڈر فضل حق تھے۔ کچھ عرصے بعد وہ سٹاف کالج کے لئے امریکہ چلے گئے۔ وہ واپس آئے تو میں امریکہ چلا گیا۔ وہ آ کر سٹاف کالج میں انسٹرکٹر لگ گئے۔ میں واپس آ کر جی ایچ کیو میں سی جی ایس کا جی ٹو لگ گیا۔ وہ دور پڑھائی' ٹریننگ' مشقوں اور آگے بڑھنے کی تحریک کا دور تھا ۶۵ء کی جنگ پر بڑی "کنٹروورسی" ہوئی۔ کئی نے کہا جنگ اچانک تھی۔ کئی نے کہا جنگ کا پہلے سے علم تھا۔ جتنے منہ اتنی باتیں مثلاً میں نے ایک جگہ پڑھا

بھارتی فوجیں لاہور کا باڈر کراس کر کے شالامار تک آ گئی تھیں۔ وہاں انہوں نے دیکھا گوالے معمول کے مطابق سائیکلوں پر دودھ لے کر جا رہے ہیں۔ چوکیدار جاگتے رہو کی آوازیں لگا رہے ہیں۔ سڑکوں پر کوئی فوجی گاڑی ہے نہ جوان تو وہ گھبرا گئے اور انہوں نے سوچا یہ پاکستانی فوج کا "ٹریپ" ہے لہٰذا وہ واپس بی آر بی نہر پر چلے گئے ...... کسی نے کہا دشمن بی آر بی نہر کراس کر کے پاکستان میں داخل ہو گیا تھا لیکن پاک فوج نے انہیں واپس دھکیل دیا۔ میرا ایک افسر دوست جو ٹینک رجمنٹ میں فرنٹ پر تھا۔ مجھ سے ملنے آیا تو میں نے اس سے یہ سوال کیا تو اس نے کہا۔ "اس قسم کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا وہ نہر کی دوسری طرف تھے اور ہم ادھر" بی آر بی بہت بڑا فرنٹ ہے اسے کراس کرنا اتنا آسان نہیں بہرحال یہ سب افواہیں ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ...... لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمیں جنگ کا پہلے سے علم تھا بھارتی فوجیں بارڈر پر آ چکی تھیں ہم بھی ریکی کر رہے تھے۔

میں نے ۱۲ اگست ۶۵ء کو یونٹ کا چارج لیا۔ ہمارا ڈویژن گوجرانوالہ سیالکوٹ روڈ پر نندی پور میں تھا۔ ۶ ستمبر کو جنگ شروع ہوئی تو ہم چونڈہ کے محاذ پر پہنچ گئے جہاں ٹینکوں کی تاریخی لڑائی ہوئی۔ بھارتی فوج بین الاقوامی باڈر کراس کر کے ۹۔۸ میل پاکستان کے اندر چار بھائی گاؤں تک پہنچ چکی تھی۔ بریگیڈیئر عبدالرحیم ملک ہم سے پہلے چونڈہ پہنچ گئے۔ ہمیں چونڈہ سے بائیں طرف ریلوے سٹیشن کے پھاٹک سے بدیانہ گاؤں تک کا علاقہ دیا گیا۔ دوسری یونٹ کو فلورا کا روٹ دیا گیا اور پھر ۱۱ ستمبر کو چونڈہ کے میدان میں ٹینکوں کی تاریخی لڑائی شروع ہو گئی۔ ہمارے جوان راتوں کو "کرالنگ" کرتے جاتے اور دشمن کے ٹینکوں کے نیچے بارودی سرنگیں بچھا آتے۔ واہ سبحان اللہ کیا جذبہ تھا ہر شخص کے چہرے پر عزم کی سرخی تھی اور ہاتھوں کی گرفت کے نیچے بندوقوں کا لوہا پگھل پگھل جاتا تھا۔ ہم ۱۸ ستمبر تک چونڈہ میں لڑتے رہے پھر ہم سیز فائر پر مجبور ہو گئے ...... لڑائی ہتھیاروں کے ساتھ ہوتی ہے یا بارود کے ساتھ۔ ہمارے پاس ہتھیار تو تھے لیکن بارود نہیں تھا۔ امریکہ نے (آف دی ریکارڈ)۔

لوگ ۶۵ء کی جنگی حماقتوں کا سارا الزام جنرل موسیٰ کو دیتے ہیں لیکن صرف ان کو الزام دینا مناسب نہیں وہ جیسے بھی تھے ان میں کچھ تھا تو وہ جنرل بنے۔ چیف آف آرمی سٹاف بنے۔ اگر وہ قطعی طور پر نااہل ہوتے تو انگریز کی فوج میں اعلیٰ عہدوں تک نہ پہنچتے لیکن اس کے باوجود اس جنگ میں کچھ ایسی حماقتیں بھی ہوئی جن کا نقصان پاکستان کو پہنچا مثلاً کھیم کرن آپریشن دیکھیں

اس کی منصوبہ بندی بڑی اعلیٰ تھی لیکن کمزور آرگنائزیشن کے باعث ہم مار کھا گئے۔ جب میں نیپال کا سفیر تھا تو پاکستان سے نیپال جاتے ہوئے میرا دہلی میں ''نائٹ سٹے'' ہوتا تھا۔ اس دوران میری بھارت کے ڈپٹی چیف آف آرمی سٹاف ہریش چندر دتا (میرے کورس میٹ تھے) سمیت متعدد بھارتی جنرلوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ان لوگوں نے ایک روز انکشاف کیا کہ جبرالٹر آپریشن کا بھارتی فوج پر اس قدر دبدبہ تھا کہ ہم نے امرتسر تک خالی کر دیا تھا لیکن آپ لوگوں کی نالائقی کی وجہ سے ہم واپس آ گئے اور آپ کو لینے کے دینے پڑ گئے' صرف یہی نہیں پاکستان کی اعلیٰ قیادت نے وہ وہ حماقتیں کیں؟ (آف دی ریکارڈ)

فیلڈ مارشل ایوب خان سے پہلی ملاقات کے ذکر سے قبل اس کی بیک گراؤنڈ بتانا چاہوں گا۔ ایوب خان کی پلٹن ۱۴ پنجاب رجمنٹ تھی جب وہ کیپٹن تھے تو ان کا سی او انگریز کرنل پیکرڈ تھے۔ ایوب خان کو ان سے بڑی انسیت تھی۔ کرنل پیکرڈ آئی ایم اے میں چیف انسٹرکٹر رہے۔ دوسری جنگ عظیم میں جنرل بنا دیئے گئے۔ جنگ ختم ہوئی تو بریگیڈیئر کے رینک پر ریٹائر ہوئے اور لندن میں گوشہ گمنامی میں زندگی گزارنے لگے۔ ایوب خان ۱۹۵۲ء میں امپریل جنرل سٹاف کی میٹنگ میں شرکت کے لئے لندن گئے (اس میٹنگ میں کامن ویلتھ کے تمام آرمی چیف شرکت کرتے تھے) تو واپسی پر بریگیڈیئر پیکرڈ کو کہیں سے تلاش کر لائے اور آتے ہی انہیں کوہاٹ میں او ٹی ایس کا کمانڈنٹ لگا دیا اور میں ان دنوں او ٹی ایس میں انسٹرکٹر تھا۔ بریگیڈیئر پیکرڈ میری خاندانی بیک گراؤنڈ اور کام کی وجہ سے مجھے بہت پسند کرنے لگے۔ ۱۹۵۳ء میں فیلڈ مارشل ایوب خان پاسنگ آؤٹ پریڈ میں چیف گیسٹ کی حیثیت سے آئے تو میں نے انہیں ریسیو کیا اور انہیں بریگیڈیئر پیکرڈ کے کمرے تک لایا۔ کمرے میں آ کر ایوب خان چھوٹی کرسی پر بیٹھنے لگے تو پیکرڈ نے مرکزی کرسی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''ایوب یور سیٹ ڈیئر'' تو ایوب نے کہا۔ ''نو سر دِس یور چیئر'' تو پیکرڈ نے زور دے کر کہا۔ ''نو نو یور سیٹ ڈیئر'' ایوب خان نے دوبارہ انکار کیا تو پیکرڈ نے مسکرا کر کہا۔ ''یو آر ناٹ سٹنگ ڈیئر بیکاز یو کین ناٹ فٹ ان دیٹ'' (تم اس لئے وہاں نہیں بیٹھ رہے کہ تم اس قابل نہیں ہو) ایوب نے قہقہہ لگایا اور مرکزی کرسی پر بیٹھ گئے۔ یہ ایوب خان سے میری پہلی ملاقات تھی۔ ان کا اے ڈی سی ولی عہد سوات اورنگزیب میری یونٹ کا تھا وہ بھی وہاں تھا۔ اس سے خوب گپ شپ ہوئی۔ دسمبر ۵۴ء میں امریکہ کے ساتھ ملٹری ایڈوائزری اینڈ کوآپریشن کا معاہدہ ہوا۔ پشاور روڈ پر سپریم کورٹ کی بلڈنگ کی جگہ ہمارا میس ہوا کرتا تھا۔

معاہدے کی تقریب اسی میس میں ہوئی وہاں بھی ایوب خان کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ تیز پنجابی بول رہے تھے ان کا لہجہ مکمل ہزاروی تھا پھر اورنگزیب کی نسیم کے ساتھ شادی ہو گئی اور وہ ایوب خان کے داماد بن گئے۔ اورنگزیب اور میں بڑے اچھے دوست تھے لہٰذا ان کے گھر آنا جانا رہتا تھا...... پھر میں سی جی ایس کا جی ٹو لگ گیا تو جنرل عمر اور یحییٰ خان کے ساتھ کئی مرتبہ ایوب خان سے ملا (جی ٹو ہمیشہ سی جی ایس کے ساتھ جاتا ہے) اس دوران میں متعدد تاریخی فیصلوں پر بھی وہاں موجود تھا مثلاً ایک مرتبہ؟ (آف دی ریکارڈ)

ایوب خان سے آخری ملاقات اس وقت ہوئی جب میں ایوان صدر سے انہیں اسلام آباد چھوڑنے گیا۔ ایوان صدر چھوڑنے کا فیصلہ ہو گیا تو اس ناگوار فریضے کی ذمہ داری میرے سر آن پڑی۔ میں نے ایوب خان سے پوچھا آپ کب جائیں گے؟ انہوں نے کہا' دن کے گیارہ بجے۔ میں مقررہ وقت پر وہاں پہنچا تو وہ تیار تھے ان کا سامان جا چکا تھا۔ مری روڈ پر بڑا رش تھا' سکوارڈ کے ساتھ انہیں لے جانا ممکن نہیں تھا' میں نے اپنی ذاتی گاڑی کا دروازہ کھولا اور وہ خاموشی سے بیٹھ گئے۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی' گاڑی نے ایوان صدر سے ٹرن لیا اور ایوب خان ایوان اقتدار سے ہمیشہ کے لئے باہر آ گئے۔ راستہ بھر وہ بہت اداس رہے' میں خاموشی سے گاڑی چلاتا رہا' کبھی میری نظریں ان کے چہرے پر گرتیں تو وہاں گہری ہوتی شکنیں دیکھ کر اداسی کی ایک لہر میرے جسم سے گزر جاتی۔ اسلام آباد ان کے ذاتی گھر پہنچ کر میں نے ان کے لئے دروازہ کھولا' وہ باہر آ گئے گھر پر ایک طائرانہ نظر ڈالی میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور کہا ''آفیسر تھینک یو ویری مچ'' میں دو قدم پیچھے ہٹا اور انہیں آخری سیلوٹ کیا' وہ مسکرائے اور دروازہ کھول کر اندر چلے گئے اور میں...... واپس آ گیا۔

۶۵ء کی جنگ کے بعد میری یونٹ کھاریاں آ گئی میں بنیادی طور پر کمانڈو ہوں۔ کھاریاں آنے کے تھوڑا عرصہ بعد مجھے کمانڈو یونٹ کا کمانڈر بنا کر مشرقی پاکستان بھیج دیا گیا۔ میں ۴ نومبر ۶۶ء کو چٹاگانگ پہنچا میں وہاں ایک برس تک رہا۔ مشرقی پاکستان میں وہاں کے متعدد رہنماؤں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ان میں مولانا بھاشانی سے ملاقات قابل ذکر ہے۔ بھاشانی بڑے مشکل آدمی تھے۔ میں نے ان سے بات شروع کی کہ ایسٹ اور ویسٹ کو اکٹھا رہنا چاہیے۔ علیحدگی پسندی مثبت بات نہیں وغیرہ وغیرہ۔ وہ آرام سے سنتے رہے جب میری بات مکمل ہو گئی تو وہ بولے جناب آپ ہیں ایڈمنسٹریٹر اور ہم ہیں ایجی ٹیٹر۔ آپ اپنا کام کیجئے اور ہمیں اپنا کام کرنے

دیں۔

میں ۶۷ء میں واپس راولپنڈی آ گیا اور اسسٹنٹ پرائیویٹ سیکرٹری ٹو کمانڈر انچیف لگ گیا۔ کسی بھی شخص کی قابلیت کے بہترین جج اس کے ماتحت ہوتے ہیں۔ میں نے نوکری کا طویل عرصہ جنرل یحییٰ کی ماتحتی میں گزارا اس کی بنیاد پر میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ ۱۹۴۷ء سے آج تک یحییٰ خان جیسا اچھا آفیسر پاکستان آرمی میں کوئی نہیں آیا (میں صدر کی حیثیت سے یا فال آف ڈھاکہ سے صرف نظر کرتے ہوئے کہہ رہا ہوں) شارپ آفیسر، گڈ کمانڈر، گڈ ایڈمنسٹریٹر، وری انٹیلی جنٹ اور کیوک ڈسین۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں خوبیوں کا مجموعہ بنایا تھا۔ میں نے زندگی میں متعدد جرنیلوں کے ساتھ نوکری کی لیکن اپنے سٹاف کے ساتھ اس سے بڑھ کر کوئی کمانڈر اچھا نہیں ملا جو شخص اس کی ماتحتی میں رہا وہ تر گیا۔ وہ صحیح معنوں میں جج آف لیول تھے۔ ان میں کمزوریاں بھی تھیں۔ لیکن کمزوریاں تو سب میں ہوتی ہیں۔ انسان کا اصل کریڈٹ تو اس کی خوبیاں ہوتی ہیں۔ یحییٰ خان کے بارے میں باقی سب کچھ آف دی ریکارڈ۔

یحییٰ خان کی حکومت ریل کو ٹریک پر واپس لانے کے لئے آئی تھی لیکن کچھ ایسے حالات و واقعات پیش آ گئے جن کے باعث ان کا دور بھی طویل ہو گیا۔ بس فوجیوں کو سیاست مار جاتی ہے فوجی "سٹیٹ فارورڈ" ہوتے ہیں جو ہے وہ ہے۔ آفیسر نے کسی فیصلے پر دستخط کر دیئے تو اسے "اون" کرے گا۔ کسی ماتحت پر نہیں ڈالے گا۔ جبکہ افسر شاہی کا مزاج اس سے بالکل مختلف ہے وہاں کمشنر کا آرڈر پٹواری تک آتا ہے اور درمیان میں بلا کسی بھی ماتحت پر ڈالی جا سکتی ہے۔ مزید مارشل لاء ایوب خان کا ہو یحییٰ کا یا ضیاء کا کچھ لوگ فوراً ان کے گرد سرکل بنا لیتے ہیں اور اس کے بعد انہیں اس سرکل سے باہر نہیں جانے دیتے اور باہر والے یہ سرکل توڑ کر اندر آنا چاہتے ہیں جس سے صورتحال عجیب رنگ اختیار کر جاتی ہے یہ روایت آج تک قائم ہے۔

۷۱ء کی جنگ ہوئی تو میں جی ایچ کیو میں تھا۔ سارا کھیل میرے سامنے ہوا لیکن میں نے منہ نہ کھولنے کا فیصلہ کیا ہوا ہے لہٰذا اس پر بالکل بات نہیں ہو سکتی۔ تاہم "فال آف ڈھاکہ" کے بارے میں ضرور کچھ کہوں گا مشرقی پاکستان میں بنگالیوں نے مغربی پاکستان کے شہریوں اور بہاریوں کے ساتھ بڑا ظلم کیا۔ گو آرمی بھی معصوم نہیں تھی ان لوگوں نے بھی زیادتی کی لیکن بنگالیوں نے تو صحیح معنوں میں انسانیت کی دھجیاں اڑا دیں۔ فال آف ڈھاکہ کے بعد جنرل یحییٰ خان نے عالمی سطح پر دکھانے کے لئے ایک دستاویزی فلم بنوائی۔ فلم کے ڈائریکٹر جنرل عرابی تھے۔ فلم مکمل

ہونے کے بعد اعلیٰ افسران کو دکھائی گئی تو یقین کریں وہ فلم دیکھنے کے بعد میرے اندر اسے دوبارہ دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔ میں آج بھی مغربی پاکستان کے شہریوں اور بہاریوں پر ہونے والے ظلم کا خیال کرتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں نے ایک کمرہ دیکھا جو بچوں کے کپڑوں، جوتوں اور بالوں سے چھت تک بھرا ہوا ہے۔ سید پور میں بنگالیوں نے ہزاروں بہاریوں کو لٹا کر ذبح کر دیا۔ چٹا گانگ میں بنگالی ڈاکٹروں نے مغربی پاکستان کے شہریوں اور بہاریوں کو باندھ کر ان کی نبضوں میں سرنجیں لگا کر چھوڑ دیا اور وہ مرتے دم تک اپنی نبضوں سے نکلتے لہو کو دیکھتے رہے..... ہماری فوج نے جب یہ مناظر دیکھے تو کیا وہ اپنے آپ پر قابو رکھ سکتی تھی۔ نہیں جناب ہرگز نہیں۔ تو انہوں نے بدلہ لینے کا فیصلہ کیا اور یہ بھی درست ہے کہ آپریشن کے دوران بے گناہ بھی مارے گئے، نفرت بھی پیدا ہوئی، زیادتیاں بھی ہوئیں لیکن ان لوگوں کے پاس کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ خود میرے ایک عزیز آفیسر کے ساتھ بڑا ظلم ہوا اسے پکڑ کر (آف دی ریکارڈ)۔

میری ذوالفقار علی بھٹو سے بہت ملاقاتیں ہوئیں ان میں کئی اہم نوعیت کی ہیں۔ میں بعض مصلحتوں کے باعث ان کا ذکر نہیں کرنا چاہتا تاہم ان سے طویل میل ملاپ کی بناء پر میں نے انہیں غیر معمولی انسان پایا۔ "وری شارپ، وری انٹیلی جینٹ" وہ مخاطب کا دماغ پڑھنے کے ماہر بین السطور بات سمجھنے میں سیکنڈ سے بھی کم وقت لگاتے تھے، انہیں مذاکرات میں حریف کو شکست دینے کا ملکہ حاصل تھا۔ رات کو بارہ بجے اندرا گاندھی کے پاس بیٹھے اور اسے موم کر لیا، یہ کسی معمولی آدمی کے بس کی بات نہیں تھی..... اور بس۔

۷۲ء میں ذوالفقار علی بھٹو نے "ٹیک اوور" کیا تو میں بریگیڈیئر کے رینک سے ریٹائر ہو گیا۔ نوکری کے دوران ان تھک کام کا عادی ہو چکا تھا لہٰذا ہنگامہ خیز زندگی کے اختتام پر سکوت سا طاری ہو گیا۔ میں واپس اپنے وطن کوہ نمک چلا گیا جہاں میری آبائی زمینیں نہ جانے کب سے میری منتظر تھیں، انہیں بے آباد بنجر دیکھا تو مجھے محسوس ہوا وہ مجھ سے اپنا حق طلب کر رہی ہیں۔ میں نے انہیں آباد کرنے کا فیصلہ کر لیا، زمینداری کا تاج نہیں تھا لیکن محکمہ زراعت زرعی یونیورسٹی کے پروفیسروں اور لوکل زمینداروں کے تعاون سے میں نے یہ میدان بھی مار لیا اس کے لئے مجھے جتنی محنت کرنا پڑی وہ صرف میں جانتا ہوں لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۳ برس بعد میری زمینوں کے چپے چپے پر سبزہ لہلہا رہا تھا۔

۱۹۷۲ء میں وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے مجھے وزیراعظم ہاؤس طلب کیا۔ میں گیا تو

انہوں نے کہا میں نے آپ کو نیپال میں سفیر مقرر کر دیا ہے۔ آپ آغا شاہی سے بریفنگ لے کر ایک ہفتے کے اندر کھٹمنڈو پہنچ جائیں اور میں ایک ہفتے کے اندر کھٹمنڈو پہنچ گیا۔ ان دنوں ساؤتھ ایشیا کے حالات بہت خراب تھے۔ بھارت سے ہر قسم کے تعلقات منقطع تھے۔ دہلی میں ہماری ایجنسی بند تھی' فلائٹس بھی آ جا نہیں رہی تھیں۔ نیپال دنیا کے ان چند ممالک میں سے ایک تھا جس کے تعلقات شروع دن سے پاکستان کے ساتھ بہت اچھے تھے۔ شاہ بریندرا کے والد کنگ مہندرا ایوب خان کے بڑے گہرے دوست تھے وہ یہاں سے بنیادی جمہوریت کا نظام لے کر گئے اور نیپال میں اسے ''پنچائیت سسٹم'' کا نام دے کر رائج کر دیا۔ یہ نظام ۶۰ء سے ۸۴ء تک نیپال میں چلتا رہا۔ جغرافیائی حوالوں سے نیپال افغانستان کی طرح ''لینڈ لاکٹ کنٹری'' تھا اور بین الاقوامی سفارتی قوانین کے تحت اسے ٹرانزٹ ٹریڈ کا حق ملا ہوا تھا۔ لیکن جنوبی ایشیا میں ''تھانیداری'' کی وجہ سے بھارت نے ٹریڈ اور ٹرانزٹ کو ایک بنا دیا تھا جبکہ ٹرانزٹ حق ہے اور ٹریڈ ''وارہ'' مزید بھارت نے ۵۰ء میں اس سے زبردستی ''ٹریٹی آف پیس'' پر دستخط بھی کرا لئے تھے جس سے بھارت کا نیپال پر معاشی اور سماجی دباؤ مزید بڑھ گیا۔ ان دنوں ہماری فارن پالیسی کا مقصد جنوبی ایشیا میں دوطرفہ تعلقات کو کثیر القومی تعلقات کی شکل دینا تھا مثلاً ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم بنگلہ دیش' نیپال' سری لنکا اور چین سے انفرادی سطح پر تعلقات بہتر بنائیں جب ایک ملک سے تعلقات مضبوط ہو گئے تو اس کے دوست ممالک کے ساتھ بھی تعلقات استوار ہو جائیں گے چنانچہ اس دور میں ہماری پالیسی ''دوست کا دوست بھی دوست اور دشمن کا دشمن بھی دوست'' قسم کی تھی' میں ان حالات میں کھٹمنڈو پہنچا وہاں جا کر میں نے نیپال کی زبان لکھنا' بولنا اور پڑھنا سیکھی۔ پورا نیپال گھوما۔ ۲ ہزار میل سے زائد ٹریکنگ کی' تمام پہاڑوں پر گیا تمام علاقوں کی تہذیب وثقافت کو قریب سے دیکھا اس کا فائدہ یہ ہوا کہ مجھے نیپال کا ماہر سمجھا جانے لگا۔ میں نے پاکستان سے نیپال کی ٹریڈ شروع کرائی۔ انہیں کپڑا' چینی اور چھوٹی مشینری چاہیے تھی' ہم نے دی اور ان سے عمارتی لکڑی' ریلوے سلیپروں اور بجلی کے پولوں کے اوپر لگنے والی ٹیک وڈ خریدی اور ان کے طلباء کو پاکستان کے تعلیمی اداروں میں سہولتیں دیں۔ آرمی کے ساتھ رابطہ بڑھایا بہرحال میں انتہائی کوشش سے نیپالیوں کو مزید قریب لے آیا۔ میں وہاں دو برس کے کنٹریکٹ پر گیا تھا لیکن مجھے وہاں چھ برس رہنا پڑا۔

۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو میں ٹریکنگ پر تھا۔ میں عموماً ایسے سفروں کے دوران چھوٹا سا ریڈیو اپنے پاس رکھتا تھا۔ نیپال میں حیرت انگیز طور پر لاہور سٹیشن بہت کلیئر آتا ہے۔ میں نے اس دن

ریڈیو آن کیا تو خبر ملی کہ پاکستان میں جنرل ضیاء الحق نے ٹیک اوور کر لیا ہے۔ میں فوری طور پر واپس سفارتخانے آ گیا' ہمیں جنرل ضیاء کی طرف سے پہلا پیغام فارن پالیسی کے بارے میں ملا۔

بھٹو کی پھانسی کے دو روز بعد نیپال کی کمیونسٹ پارٹیوں نے ہنگامے شروع کر دیئے۔ احتجاج ہوا' طلباء نے مل کر جلوس بھی نکالا' مگر لوکل ایشوز کی وجہ سے یہ موو زیادہ دیر تک نہ چل سکی۔ اسی دوران مجھے نیپال کا سب سے بڑا ایوارڈ ''گورکھا دخشندہ'' ملا جو اس سے قبل کسی سفیر کو نہیں دیا گیا۔ نیپال میں قیام کا ایک اور یادگار واقعہ بنگلہ دیش کے صدر ضیاء (خالدہ ضیاء کے خاوند) کا دورہ نیپال ہے۔ ضیاء میرے پرانے جاننے والے تھے۔ رائل پیلس میں ان کے اعزاز میں استقبالیہ تھا۔ میں نے کور آف ڈیپلومیٹس کے ڈین کی حیثیت سے ان کا استقبال کیا۔ مختصری ملاقات ہوئی اور اگلی صبح وہ واپس چلے گئے۔ دو روز بعد ۱۹ اپریل کو وہ چٹاگانگ میں مارے گئے۔

شیخ زید بن سلطان النہیان کے بھٹو سے ذاتی مراسم تھے اس لئے بھٹو کی پھانسی کے بعد عرب امارات میں پاکستان کے خلاف شدید غم وغصہ پایا جاتا تھا۔ امارات کی حکومت کا ہمارے سفیر سے رویہ بہت خراب تھا۔ ان حالات میں ۱۵ ستمبر ۱۹۸۲ء کو مجھے عرب امارات کا سفیر بنا دیا گیا۔ اس سے قبل سفیر تبادلے کے بعد براہ راست نئے ملک پہنچ جاتے تھے لیکن جنرل ضیاء نے یہ طریقہ کار تبدیل کر دیا' اب سفیر نئے ملک جانے سے قبل پاکستان آتا تھا۔ وزارت خارجہ میں خارجہ پالیسی سے متعلق بریفنگ لیتا تھا۔ تمام وزارتیں اسے بریفنگ دیتیں۔ صوبوں میں گورنرز اور چیف سیکرٹریز سے ملاقات کرتے اور آخر میں اس کی صدر سے تفصیلی ملاقات ہوتی' میں اس عمل سے گزرنے کے بعد عرب امارات پہنچ گیا۔ سفیر کے کاغذات کی وصولی ڈپلومیسی میں دوستی ناپنے کا بیرومیٹر یا لٹمس ٹیسٹ ہے۔ حکومتیں جس ملک سے ناراض ہوں' ان کے سفیروں کے کاغذات ایک طویل عرصے تک وصول نہیں کئے جاتے اور جب تک صدر مملکت کاغذات وصول نہیں کرتا سفیر کو سفیر کا پروٹوکول نہیں ملتا۔ خوش قسمتی سے میرے وہاں پہنچنے کے تین روز بعد مجھے کاغذات پیش کرنے کی اجازت مل گئی جس سے سفارتی حلقوں میں حیرت پھیل گئی کیونکہ یہ اس وقت کے لحاظ سے بڑی تبدیلی تھی۔ کاغذات کی وصولی کے طریقہ کار کے مطابق صدر سفیر سے کاغذات لے کر اسے بٹھا لیتا ہے چند منٹوں تک رسمی گفتگو کے بعد سفیر کو فارغ کر دیا جاتا ہے۔ پاکستان میں جنرل ضیاء نے اس روایت میں لنچ کا اضافہ بھی کر دیا تھا۔ بہرحال باتیں شروع ہو

گئیں چند لمحوں بعد گفتگو رسمی تکلف سے نکل کر ذاتی دلچسپیوں، بین الاقوامی صورتحال اور جغرافیائی تبدیلیوں پر آ گئی اور وہ دو منٹ ۴۰ منٹ تک وسیع ہو گئے۔ میرے بعد سوڈان کے سفیر نے کاغذات پیش کرنا تھے، چیف پروٹوکول دس پندرہ منٹ بعد آتا اور سامنے کھڑا ہو جاتا لیکن شیخ اسے ہاتھ کا اشارہ کر کے واپس بھیج دیتے۔ میں نے شیخ کی باتوں سے محسوس کیا کہ وہ پاکستان کے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتا ہے۔ ہر سال تین ماہ وہ یہاں گزارتا ہے۔ وہ سندھ، بلوچستان اور پنجاب سارا گھوما ہوا ہے لہٰذا اس کے پاس بہت معلومات تھیں بہر حال اس ملاقات کے بعد دونوں ممالک کے درمیان سرد مہری کی برف ٹوٹ گئی۔

میں نے زندگی میں تین شاہ دیکھے۔ ان میں شیخ زید بہت منفرد "رولر" ہیں۔ اکتوبر میں انہوں نے پاکستان آنا تھا، مجھے بلایا میں نے ملاقات کے دوران پوچھا آپ وہاں کتنا قیام کریں گے؟ تو اس نے مجھے دیکھا اور کہا۔ "سفیر پاکستان میرا اپنا ملک ہے، جب میری مرضی جاؤں گا اور جب جی چاہا واپس آؤں گا۔" میں نے فوراً ان کی یہ بات پکڑ لی اور پھر جب بھی پاکستان کو متحدہ عرب امارات کی ضرورت پڑی میں شیخ کے پاس گیا اور انہیں کہا۔ "جناب! شیخ یہ میرے نہیں آپ کے ملک کا مسئلہ ہے" اور وہ فوراً کہتے "ڈن"۔ میرے دور سفارت میں شیخ سے جنرل ضیاء کی پانچ ملاقاتیں ہوئیں زیادہ تر ملاقاتیں بیرونی دوروں کے دوران ابوظہبی میں مختصر قیام پر ہوئیں۔ شیخ نے پاکستان میں جنرل ضیاء سے دو اہم نوعیت کی ملاقاتیں کیں۔ میں ان ملاقاتوں میں موجود تھا معاملات حساس نوعیت کے ہیں لہٰذا میری خاموشی بہت ضروری ہے (آف دی ریکارڈ) شیخ زید کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ پاکستان میں شکار کھیلنے کے بعد ٹھوکر نیاز بیگ لاہور میں اپنے محل میں قیام کرتے ہیں، صدر انہیں گورنر ہاؤس دعوت دیتے ہیں اور اگلے روز شیخ صدر کو اپنے محل میں بلاتے ہیں، جنرل ضیاء نے شیخ زید کو ایک مرتبہ اسلام آباد میں ایوان صدر بھی بلایا۔ میں امارات میں چار برس رہا تھا۔

۱۳ مارچ ۸۵ء کو میرا تبادلہ سعودی عرب ہو گیا، سعودی عرب میں اپنی ذمہ داریوں کا احوال بتانے سے قبل میں بیک گراؤنڈ بتانا چاہوں گا..... تیل بیچنے والے ممالک نے "اوپیک" کے نام سے ایک تنظیم بنا رکھی ہے اس تنظیم نے پٹرولیم کے وسائل اور آبادی کی بنیاد پر تیل بیچنے کا کوٹہ مخصوص کر رکھا ہے مثلاً ابوظہبی کا کوٹہ 1.2 ملین بیرل روزانہ اور سعودی عرب کا ۶ ملین بیرل ہے اسی حساب سے انڈونیشیا، نائیجیریا، لیبیا، ایران اور کویت کا بھی کوٹہ مخصوص ہے۔ ۱۹۸۲ء تک

ہر سال تیل کی قیمتوں میں اوسطاً ۲ ڈالر فی بیرل اضافہ ہوتا تھا لیکن اس برس تیل کی قیمت اچانک ۲۸ ڈالر فی بیرل ہو گئی تو ان ریاستوں نے سوچا اگلے برس قیمت یقیناً ۳۲ ڈالر تک پہنچے گی لہٰذا انہوں نے اس حساب سے اپنا بجٹ بنا لیا۔ دوسری طرف تیل خریدنے والے بڑے ممالک امریکہ، جاپان اور جرمنی نے قیمتوں میں اضافے کے باعث تیل سٹاک کرنا شروع کر دیا اور اگلے برس تیل خریدنے سے صاف انکار کر دیا "اوپیک" نے تیل کا کوٹہ کم کرنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ اس سے قیمتیں بڑھنے کا امکان تھا لیکن لیبیا، نائیجیریا اور انڈونیشیا نے یہ فیصلہ ماننے سے انکار کر دیا۔ لیبیا نے کہا میں تو اگلے پانچ برس تک کا تیل اسلحہ کے عوض روس کو بیچ چکا ہوں، نائیجیریا نے کہا میرے عوام بھوکے مر جائیں گے ہم تیل نہیں پی سکتے، انڈونیشیا نے "اوپیک" کے مین ترجمان اور سعودی وزیر تیل ذکی یمانی کو کہا جناب! آپ کی آبادی ۸ ملین اور ہماری ۱۶۲ ملین ہے، آپ تیل بیچیں تو آپ کے ہر فرد کو اتنے ڈالر آتے ہیں جبکہ ہمارے شہری کے حصے تو چند سینٹ آتے ہیں ہم کوٹہ کم نہیں کر سکتے آپ کریں اور ایران عراق جنگ کی وجہ سے وہ دونوں ممالک اس صف میں شامل ہی نہیں تھے لہٰذا تیل کی قیمت ۲۸ سے گر کر ۱۴ اور ۱۲ ڈالر فی بیرل ہو گئی۔ ابوظہبی میں ۹ ڈالر بھی ریٹ ہوا۔ تیل کی بڑی منڈی ٹورٹڈیم ہے جہاں ریٹ بنتے ہیں اور تیل بکتا بھی ہے۔ سعودی عرب میں تیل کے سارے وسائل شاہی خاندان کے ہاتھ میں ہیں۔ تمام سعودی شہزادوں کا کوٹہ مخصوص ہے، وہ تیل کا جہاز بھر کر ٹورٹڈیم لے جاتے ہیں جہاں اس کی بولی لگتی ہے، اس برس شہزادے تیل لے کر گئے تو ذکی یمانی نے تیل فروخت کرنے سے انکار کر دیا اور ان شہزادوں نے تیل کے بھرے جہاز پانچ ڈالر فی بیرل کے حساب سے بیچ دیئے۔ اس بحران کے نتیجے میں سعودی عرب معاشی بحران کا شکار ہو گیا، بجٹ تباہ ہو گئے لینے کے دینے پڑ گئے لہٰذا انہوں نے اخراجات کم کرنے کا فیصلہ کیا جب عملدرآمد ہوا تو بجلی پاکستانی مزدوروں پر گری۔ اس وقت پاکستان کے ۸ لاکھ افراد سعودی عرب میں ملازمتیں کرتے تھے، سعودی حکومت نے ان سب کو نکالنا شروع کر دیا اکثریت کی ایک ایک سال کی تنخواہیں کمپنیوں کے پاس تھیں جس کو نکالا اس نے تنخواہ کا مطالبہ کیا تو جواب ملا کونسی سال وال کی تنخواہ نہیں یہ تین ماہ کے پیسے پکڑو اور بھاگو، پاکستانی مزدوروں کی اس بے دخلی سے پاکستانی معیشت پر بھی بڑی زد پڑی، زرمبادلہ رُک گیا، بے روزگاری بڑھ گئی اور شدید معاشی بحران کا خطرہ لاحق ہو گیا..... ان حالات میں جنرل ضیاء الحق نے مجھے سعودی عرب بھیج دیا، سعودی عرب میں قانون نہیں دوستی چلتی ہے، جو دوست ہے اس کے لئے سارے قانون

نرم اور جو دوست نہیں اس کے لئے کوئی رعایت نہیں۔ میرے دور سفارت میں جنرل ضیاء دس مرتبہ سعودی عرب گئے، وہ اسلامک پیس کمیٹی کے چیئرمین بھی تھے لہٰذا ایران عراق تصفیے کے لئے دو مرتبہ جدہ آئے، محمد خان جونیجو نے بھی تین مرتبہ سعودی عرب کا دورہ کیا میں وہاں ساڑھے ۳ برس رہا یکم اکتوبر ۸۷ء کو میری سروس ختم ہوئی تو سعودی عرب میں پاکستانیوں کے حالات معمول پر آ چکے تھے۔

میں چار پانچ ماہ کی طویل چھٹی گزار کر فروری ۸۸ء میں پاکستان واپس آیا تو جنرل ضیاء سے ملاقات ہوئی ہم پرانے دوست تھے، پرانی یادوں کی باتیں ہوئیں' ملکی حالات پر انہوں نے کچھ کہا اور نہ میں نے کچھ پوچھا اس وقت میں غیر سرکاری آدمی ہو چکا تھا لہٰذا سرکاری گفتگو بے وقوفی تھی...... چند ماہ بعد ۱۵ جون کی شام مجھے ایوان صدر سے فون آیا اور جنرل ضیاء نے مجھے طلب کیا میں پہنچ گیا تو انہوں نے کہا میں نے تمہیں گورنر سرحد بنا دیا ہے تم کل صبح میرا جہاز لے کر پشاور پہنچ جاؤ، وزیراعلیٰ جنرل فضل حق تمہارا استقبال کریں گے۔ میں نے یس سر کہا اور دوسرے روز پشاور ایئرپورٹ پر ہمارا پرانا ساتھی اور دوست فضل حق مجھے ''ریسیو'' کر رہا تھا۔ میں، جنرل ضیاء اور فضل حق بہت پرانے دوست تھے۔ جنرل ضیاء نے یہ فیصلہ اچھی ٹیم بنانے کے لئے کیا تھا، فضل حق میری آمد پر بہت خوش تھے انہوں نے بڑی خوشدلی سے میرا استقبال کیا اور اس کے بعد میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہو گیا...... کہاں فوج کی سخت زندگی' پھر زمینوں پر ہل چلا کر آب و دانا کا کھیل' پھر سفارت کی تکلفات سے بھرپور زندگی اور پھر اختیار و اقتدار کا انوکھا دور، میں جب اپنے موڑ کاٹتے ماضی پر نظر ڈالتا ہوں تو میں حیران ہو جاتا ہوں، کہاں سے شروع کیا کہاں کہاں رہا، کہاں کہاں رُکا، کتنے لوگ ملے، کتنے لوگوں نے متاثر کیا اور کتنے لوگ آ آ کر چلے گئے

صاحب یہ زندگی بڑی عجیب چیز ہے۔

میں ضیاء ایئر کرش کے بارے میں کچھ نہیں جانتا، ساری باتیں سنی سنائی ہیں لہٰذا بات کرنا فضول ہے۔

ضیاء میرا دوست تھا میں نے زندگی کا طویل دور اس کے ساتھ گزارا۔ میں نے صرف صدر مملکت ضیاء الحق کو نہیں دیکھا۔ میں لیفٹیننٹ ضیاء، میجر ضیاء، کرنل ضیاء، بریگیڈیئر ضیاء اور جنرل ضیاء الحق کے بھی بہت قریب رہا، ہم نے راتیں اکٹھی گزاریں' سارا سارا دن اکٹھے گھومے پھرے، سائیکلوں پر پھرتے رہے' جب خدا نے گاڑیاں دیں تو بھی ساتھ رہے اور اس طویل تجربے

کی بنیاد پر میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں میں نے جنرل ضیاء میں کوئی تبدیلی نہ دیکھی' وہ صدر بن کر بھی چراٹ کے سرد بنگلے میں کوئلوں کی انگیٹھی کے پاس بیٹھا ضیاء ہی رہا' ایسا ضیاء جو مجھ سے باتیں کرتا تھا لیکن اس کے ذہن میں بار بار یہ بات گردش کرتی رہتی تھی کہ ابھی اس نے عصر کی نماز بھی پڑھنی ہے، بہت شریف آدمی تھا' اس میں عجز تھا۔ شروع دن سے مہمان کو باہر تک چھوڑ کر آتا تھا۔ صدارت کے دور میں بھی اس نے اپنی یہ عادت نبھائی۔ بولتا کم تھا، میں اور ہمارا مشترکہ دوست کرنل ہاشم اس سے ملنے گئے' واپس آنے لگے تو اس نے کہا کل ۱۴ اگست کی تقریب ہے آپ لوگ میرے ساتھ چلیں۔ تو ہم نے کہا نہیں تم چلے جانا ہم خود آ جائیں گے تقریب میں ہم نے دیکھا وہ سائیکل پر آ رہا ہے' دو دن بعد میں نے پوچھا صدر ہو کر سائیکل پر سفر کیسا لگا؟ تو کہنے لگا پوری زندگی سائیکل چلائی ہے اب کیا محسوس ہوتا تھا؟ اپنے پرانے ساتھیوں اور دوستوں کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ اچھا فیملی ممبر تھا تھک ہار کر گھر آتا لیکن اہل خانہ کو دیکھتے ہی مطمئن اور خوش نظر آتا۔ رشتہ داروں کا بڑا ساتھ دیتا تھا۔ جب میجر تھا تو مجھے ساتھ لے کر اپنے ایک دور دراز کے رشتہ دار کی تعزیت کے لئے گیا' ہم نے بڑی مشکل سے گھر تلاش کیا جب صدر ہوا تو بھی رشتہ داروں کو نہیں بھولا۔ ان تھک کام کرتا تھا۔ میں مارشل لا کے شروع میں پاکستان آیا آرمی ہاؤس میں جنرل ضیاء سے ملاقات ہوئی ہم دیر تک باتیں کرتے رہے' پرانی دوستی کی باتیں' اہل خانہ کے مسائل پھر نیپال کی باتیں چھڑ گئیں تو میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ ہم نیپال سے کیا فائدہ حاصل کر سکتے ہیں جس سے بھارت کو نقصان پہنچے گا۔ ہم نے کھانا بھی اکٹھے کھایا' رات کو بارہ بجے میں نے اجازت طلب کی تو اس نے میز پر فائلوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تم تو جا کر سو جاؤ گے لیکن میں نے ابھی ان سے بھی ڈیل کرنی ہے۔ اگلی صبح گیارہ بجے ایوان صدر سے مجھے ایک لفافہ موصول ہوا جس میں دو صفحوں کا خط تھا۔ یہ خط سیکرٹری کامرس کے نام تھا جس میں صدر مملکت نے کہا تھا کہ کل ان کی ملاقات نیپال میں پاکستانی سفیر سے ہوئی اس میں انہوں نے یہ یہ تجاویز پیش کیں۔ آپ ان سے مل کر ان کو قابل عمل بنائیں، خط پڑھ کر میں نے سوچا، میں بارہ بجے آیا اس کے بعد اس شخص نے فائلیں پڑھیں پھر یہ خط تحریر کیا' سویا' صبح دفتر آیا اور یہ خط جاری کیا اور اگر یہ معمول ہے تو یہ بندہ ہے یا جن   جنرل ضیاء انسانی جذبات کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ مولانا عارف حسینی کے قتل پر پشاور میں بڑی نفرت پائی جاتی تھی۔ جنرل ضیاء ان کے جنازے میں شرکت کرنا چاہتے تھے لیکن لوگوں نے منع کر دیا تو مجھے فون کیا' میں نے کہا ہاں ضرور آئیں اور پھر شاہی باغ جنازے سے

دوران لوگوں نے صدر کو اپنے درمیان پایا تو وہ حیران رہ گئے اور بڑھتی ہوئی ٹینشن ایک دم ختم ہو گئی۔

ضیا ایئر کرش کے فوراً بعد جنرل اسلم بیگ اسلام آباد آئے اسحاق خان سے ملے اور تمام گورنرز کو کال کر لیا گیا۔ ہم سب جمع ہوئے تو اسلم بیگ نے ملک میں مارشل لا لگانے کی تجویز پیش کر دی۔ ہم نے کہا مارشل لا کس گراؤنڈ پر لگایا جائے اس سے پہلے جتنے مارشل لا لگے وہ افراتفری، لا اینڈ آرڈر کی خراب صورتحال اور قتل و غارت گری کی وجہ سے لگے' اس وقت ملک معمول کے مطابق چل رہا ہے' جلوس نکلے نہ قتل و غارت گری ہوئی، سول وار کا خطرہ نہیں، گروہی تصادم کا امکان نہیں تو مارشل لا کس بنیاد پر لگایا جائے؟ میٹنگ کی مجموعی رائے یہی تھی کہ ملک میں جمہوری طریقے سے تبدیلی لائی جائے گو اس وقت یہ فیصلہ بہت مشکل تھا لیکن بعد کے حالات نے ہمارے اس فیصلے کی تصدیق کر دی، رہی بات جنرل اسلم بیگ مارشل لا کیوں لگانا چاہتے تھے؟ تو اس کی کئی وجوہات تھیں جن کا میں ذکر نہیں کروں گا۔ جنرل بیگ موجود ہیں آپ لوگ ان سے رابطہ کریں ہاں البتہ (آف دی ریکارڈ)

غلام اسحاق خان فطرتاً نارمل آدمی ہیں، تعاون کرتے ہیں، صاحب علم ہیں، متوازن ہیں اور منطق سے آگے پیچھے نہیں ہوتے۔ انہوں نے یہ تمام خوبیاں فطرتاً نہیں پائیں، ڈویلپ کی ہیں، وہ ایسے تجربہ کار آدمی ہیں جنہوں نے زندگی میں بڑے گرم سرد موسم دیکھے۔ میں ایک مرتبہ فاٹا کے مسائل پر انگریز کے دور کی ایک فائل دیکھ رہا تھا تو ایک حوالے کے نیچے غلام اسحاق خان پرائیویٹ سیکرٹری ٹو چیف منسٹر لکھا ہوا تھا اور غلام اسحاق خان کے دستخطوں کے نیچے اپریل ۱۹۴۶ء درج تھا، آپ خود اندازہ کریں جو شخص آج سے ۵۰ برس پہلے اتنی اعلیٰ پوسٹ پر رہا ہو اس نے زندگی میں کیا کیا نہ دیکھا ہو گا۔ آپ پاکستان کے کسی محکمے کا ریکارڈ اٹھا کر دیکھیں وہ واپڈا ہو، پی آئی ڈی سی ہو یا سٹیٹ بینک' اس کی بنیادوں میں آپ کو غلام اسحاق خان نظر آئیں گے۔ آپ فنانس کی بات کریں، دفاع کی بات کریں یا انتظامیہ کی بات کریں' غلام اسحاق خان کی شاندار خدمات سامنے آئیں گی، میٹنگز میں جب کسی محکمے کی بات چلتی تو وہ فوراً کہتے فلاں سن کو جب میں اس شعبے کا ڈائریکٹر جنرل تھا تو یہ مسئلہ اس طرح چلا تھا پھر اس طرح ہوا اور بات یہاں پر ختم ہوئی وغیرہ وغیرہ ہم لوگ چیزوں کو گھمانے پھرانے کے بڑے ماہر ہوتے ہیں لیکن وہ فوراً پکڑ لیتے تھے بلاشبہ وہ حکومتی امور کے بڑے ماہر تھے۔

غلام اسحاق خان صدر بنے تو ان سے تعلقات میں اضافہ ہوا، بے نظیر بھٹو کی حکومت بنی تو انہوں نے مجھے سرحد کی گورنر شپ سے الگ نہیں کیا' اس کے تین فیکٹر ہو سکتے ہیں۔ اول ہو سکتا ہے صدر اسحاق نے بے نظیر بھٹو سے کہا ہو' جنجوعہ بڑا قابل آدمی ہے پارٹی نہیں ہے ضیاء کا دوست ضرور تھا لیکن اپنے کام کا سو فیصد خیال رکھتا ہے اگر سسٹم ٹھیک طریقے سے چلانا چاہتی ہیں تو سرحد کا گورنر جنجوعہ کو ہی رہنا چاہیے وغیرہ وغیرہ دوم پیپلز پارٹی کے سرحد کے رہنماؤں آفتاب شیر پاؤ، افتخار گیلانی وغیرہ نے میرے لئے بے نظیر پر بڑا دباؤ ڈالا، سوم میں کسی کی طرف داری نہیں کرتا تھا، آئین کے مطابق کام کرتا تھا، سیاسی لڑائی نہیں لڑی چنانچہ بے نظیر بھٹو نے اگلے ۲۰ ماہ تک مجھے قبول کر لیا۔

میں نے گورنر شپ کے دور میں کبھی ناجائز بات نہیں کی۔ اسی لئے جو کہا بے نظیر نے فوراً مان لیا، صدر اسحاق یقیناً میری طرف داری کرتے تھے اس کی ایک ہی وجہ تھی کہ میں سیاسی پیچیدگیوں میں نہیں پڑا۔ سٹیٹ فارورڈ رہا۔ آئین کو مدنظر رکھتے ہوئے صاف کہہ دیا، ایسا ہونا چاہیے اور ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ آفتاب شیر پاؤ اور میر افضل میں نے دونوں کے ساتھ کام کیا' بڑی اچھی کوآرڈینیشن رہی۔ فاٹا کی وجہ سے صوبہ سرحد کا نظام دوسرے صوبوں سے مختلف ہے۔ یہاں فاٹا کا انچارج گورنر ہوتا ہے اور فاٹا ارکان اسمبلی کے حوالے سے صدر کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرتا ہے، انتظامی تقسیم میں بعض ڈویژن میں اضلاع بھی ہیں اور ایجنسیاں بھی۔ اضلاع وزیر اعلیٰ کے ماتحت ہوتے ہیں اور ایجنسیاں براہ راست گورنر کے زیر اثر، لہٰذا وہاں گورنر اور وزیر اعلیٰ کے اختلافات کا خدشہ رہتا ہے۔ اس میں کوہاٹ ڈویژن کی مثال دی جا سکتی ہے۔ اس کے دو اضلاع ہیں کوہاٹ اور کرک جبکہ اس میں تین ایجنسیاں ہیں، ایف آر کوہاٹ، اورکزئی، اور کرم ایجنسی وہاں ہر دور میں مسئلہ رہا ہے کہ کمشنر کون لگائے؟ وزیر اعلیٰ یا گورنر لیکن میں نے جب بھی کمشنر کا فیصلہ کیا، وزیر اعلیٰ کے مشورے سے کیا جس وجہ سے سرحد میں وزیر اعلیٰ گورنر اختلافات پیدا نہیں ہوئے۔

بے نظیر نے اس دور میں مجھے کئی مرتبہ کال کیا لیکن سب سے بڑا ایشو لکڑی بنی، سرحد کے ملک جنگل کے جنگل کاٹ کر ٹرکوں میں بھرتے اور پنجاب میں لا کر بیچ دیتے، راستے میں پوچھا جاتا تو کہتے ہم تو افغانستان سے لائے ہیں، ان کارروائیوں سے جنگل برابر ہو کر رہ گئے لہٰذا میں نے لکڑی کی ایکسپورٹ پر پابندی لگا دی، دوسرے روز سارے ملک جمع ہو کر وزیر اعظم ہاؤس پہنچ

گئے اور لٹ گئے، مر گئے کا واویلا شروع کر دیا، وزیراعظم نے مجھے طلب کیا میں نے انہیں ساری بات بتائی، صدر اسحاق خان نے بھی میرا بھرپور ساتھ دیا اور وزیراعظم میری بات مان گئیں۔۔ بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم ہوئی تو میں عمرے پر گیا ہوا تھا واپس آیا تو اطلاع ملی بہرحال میں معمول کے کام میں مصروف ہو گیا۔

نواز شریف وزیراعظم بنے تو ان کے ساتھ بڑی کوآرڈینیشن رہی، نواز شریف بڑے اچھے دوست ہیں لیکن ان میں وہ گرفت نہیں تھی جو وزیراعظم میں ہونی چاہیے وہ پریشر کے سامنے دب جاتے تھے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اگر نواز شریف پر دائیں بائیں سے پریشر نہ ہوتا تو شاید ان کی صلاحیتیں نکھر کر سامنے آتیں بہرحال تجربے کے لئے وقت چاہیے علم تو بندہ مطالعہ اور بریفنگ سے حاصل کر لیتا ہے لیکن تجربہ۔۔۔۔ اس کے لئے وقت درکار ہوتا ہے اور نواز شریف کو ابھی وقت چاہیے۔

اسحاق، نواز شریف اختلاف ضیا، جونیجو چپقلش سے مختلف نہیں تھے وہی لائن کراسنگ، اگر دونوں اپنی حدود میں رہتے تو بہت سارے واقعات نہ ہوتے۔ نواز شریف نے کئی ایسی باتیں کیں، کئی ایسے ایکشن لئے جو انہیں نہیں لینا چاہیے تھے اور ان کے ان اقدامات کے باعث اسحاق خان کی بجائے کوئی اور صدر ہوتا تو وہ بھی پوائنٹ آؤٹ ضرور کرتا، دونوں میں کئی اختلافات تھے، مثلاً رولز آف بزنس تھے، سلیکشن آف جوائنٹ چیفس آف سٹاف، سلیکشن آف آرمی چیف اور ایئر چیف پھر ان کی ریٹائرمنٹ، تقرریاں، تبادلے، این ایف سی کے فیصلے، ان پر عملدرآمد کا مسئلہ بس اختلافات ہی اختلافات تھے۔۔۔ میں نے ان دونوں میں صلح کرانے کی بہت کوشش کی لیکن اختلافات بہت بڑھ چکے تھے لہٰذا میں بہتری کا کوئی راستہ نکالنے میں کامیاب نہ ہو سکا باقی اس سارے قصے کی تفصیلات تو میں نہیں بتاؤں گا۔ پھر نواز شریف چلے گئے، مزاری آئے وہ چلے گئے تو نواز شریف پھر واپس آ گئے لیکن جلد ہی وہ دوبارہ چلے گئے اور۔۔۔۔۔ معین قریشی آ گئے انہوں نے آتے ہی تمام گورنروں سے استعفے طلب کر لئے اور یوں گورنرشپ سے مستعفی ہو گیا۔

یارو! میں نے ان آنکھوں سے بہت کچھ دیکھا اور ان کانوں سے بہت کچھ سنا۔۔۔ میں کھرے لوگوں کے کلمات حق کا بھی گواہ ہوں اور جابر حکمرانوں کے کروفر کا عینی شاہد بھی، میں نے ٹینکوں کے نیچے لیٹتے جوان بھی دیکھے اور گولیوں سے بھاگتے غدار بھی، میں نے دستور بنتے بھی دیکھے اور ان کے پھٹے اوراق اڑتے بھی، میں نے حکمرانوں کو اقتدار کے ایوانوں میں جاتے اور

پھر خالی ہاتھ واپس آتے بھی دیکھا، بہت سی سازشیں میرے سامنے پروان چڑھیں اور کئی راز میرے سامنے افشا ہوئے۔۔۔ بہت کچھ ہے میرے اندر مجھے پتہ ہے یہ راز یہ سوچیں ناسور بھی بن سکتی ہیں لیکن یارو! میں نے خاموش رہنے کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ میرا یہ فیصلہ درست ہے یقیناً یہ قوم کے ساتھ زیادتی ہے، تاریخ کے ساتھ ظلم ہے لیکن میں اپنی فطرت کا کیا کروں یہ مجھے فیصلہ کر لینے کے بعد توڑنے کی اجازت نہیں دیتی، میں نے کبھی سگریٹ نہیں پیا، شراب کو ہاتھ نہیں لگایا، میرا منہ پان کے ذائقہ تک سے آشنا نہیں اور یہ سب کچھ میں نے کسی گناہ یا ثواب کے ڈر سے نہیں کیا، بس میں نے فیصلہ کر لیا۔۔۔ اور پھر پوری زندگی اسے نبھایا۔ اسی طرح میں نے زندگی میں کچھ اور فیصلے بھی کئے جن پر میں کاربند رہا۔۔۔ کاربند ہوں اور کاربند رہوں گا بہرحال میرا آپ کا اور اس ملک کا خدا حافظ

• • •

ڈاکٹر اقبال واہلہ

ڈاکٹر اقبال دہلہ ایک غیر معروف انسان ہیں۔ وہ بنیادی طور پر سٹرکچرل انجینئر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے ایک انوکھا کام لیا۔ انہوں نے ہمارے ایٹمی پلانٹ کہوٹہ کی عمارت ڈیزائن کی۔ اس انٹرویو میں آپ کو معلوم ہوگا کہ پاکستان نے کن حالات میں کہوٹہ پلانٹ بنایا تھا۔

......

یہ ۱۹۷۴ء کی بات ہے۔

ایک روز آرمی کی ایک سٹاف کار میرے دفتر کے باہر رکی اور اس میں سے تین سمارٹ آفیسر اتر کر میرے کمرے میں داخل ہوئے' ان میں سے نسبتاً زیادہ سنجیدہ اور متین شخص نے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ '' مجھے زاہد علی اکبر کہتے ہیں پاکستان آرمی میں بریگیڈیئر ہوں۔ ان سے ملئے یہ ہیں ملٹری انٹیلی جنس کے چیف ... اور یہ ہیں انٹیلی جنس بیورو کے سربراہ۔'' میں نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا۔ زاہد علی اکبر بیٹھ گئے لیکن دوسرے حضرات نے چل پھر کر میرے دفتر کا جائزہ لینا شروع کر دیا' کھڑکیوں کے پردے پلٹ کر دیکھے۔ میز اور کرسیوں کے نیچے نظر دوڑائی اور رائٹنگ ٹیبل کی ساری درازیں کھول کر دیکھیں' اس دوران میں حیرانی سے سامنے بیٹھے زاہد علی اکبر کو دیکھتا رہا وہ اس ساری کارروائی سے لاتعلق اوپر چھت کی طرف دیکھ رہے تھے۔ یہ سلسلہ دس پندرہ منٹ تک جاری رہا آخر کار وہ دونوں حضرات پلٹے' زاہد علی اکبر نے چونک کر ان کی طرف دیکھا پھر مسکرائے اور میرے چہرے پر نظریں جما کر بولے۔

''ڈاکٹر صاحب آپ کو اسلامی دنیا کا سب سے بڑا نیوکلیئر پلانٹ تعمیر کرنا ہے۔'' مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے کانوں کے قریب کسی طاقتور بم کا دھماکہ ہوا ہو' میری ساری سوچیں مفلوج ہو گئیں۔ ایک طویل وقفے تک میں سامنے دیوار پر لگے وال کلاک کے پنڈولم پر نظریں جمائے بیٹھا رہا اور وہ تینوں حضرات ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ سجائے مجھے دیکھتے رہے۔ جب میرے حواس بحال ہوئے تو میں نے ان سے اس '' نظر انتخاب '' کی وجہ پوچھی۔ زاہد علی اکبر نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ''اس لئے کہ آپ پاکستان کے واحد سٹرکچرل انجینئر ہیں جنہوں نے اس شعبے میں پی ایچ ڈی کر رکھی ہے۔ دوسرا طویل تحقیق کے بعد ہمیں معلوم ہوا

آپ ہی پاکستان کے وہ انجینئر ہیں جو کام کے دوران ٹھیکیداروں سے کمیشن نہیں کھاتے۔'' یہ الفاظ سن کر میرا سینہ فخر سے پھول گیا۔ ''اگر میں انکار کر دوں تو'' میں نے خوف اور فخر کی ملی جلی کیفیت میں پوچھا۔ ''نہیں آپ کے پاس انکار کی کوئی گنجائش نہیں اور ویسے ہم ایک محب وطن پاکستانی سے اس کی توقع بھی نہیں کرتے۔'' زاہد علی اکبر نے اسی اطمینان سے جواب دیا۔ وہ لوگ مزید آدھ گھنٹہ وہاں بیٹھے رہے ہم اس دوران نیوکلیئر ٹیکنالوجی اور اس کے لئے درکار تعمیراتی ساز و سامان پر گفتگو کرتے رہے جب وہ لوگ اُٹھ کر چلے گئے تو میں دیر تک اپنے خاموش دفتر میں بیٹھا آنے والے کل کے بارے میں سوچتا رہا ایسا کل جس میں میں نے اپنے ملک کا کل تعمیر کرنا تھا۔ مضبوط اٹل اور باوقار کل۔ جس کے ساتھ ہی میرا نام بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے امر ہو جانا تھا۔

کہوٹہ پلانٹ کے لئے تین ٹیمیں تشکیل دی گئیں۔ زاہد علی اکبر کی ٹیم جس کے ذمے مالی اور ٹیکنیکی ساز و سامان فراہم کرنا تھا۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی ٹیم جو ہری بم بنانا جس کا کام تھا اور میری ٹیم ایٹمی پلانٹ کے لئے جگہ کا انتخاب اور عمارت کی تعمیر میرے ذمے تھی۔ بھٹو صاحب ایٹمی پروگرام کے بارے میں بہت جذباتی ہو رہے تھے۔ ۱۹۷۴ء میں بھارت نے ایٹمی دھماکہ کیا تو بھٹو نے اپنے مشیروں کو بلا کر کہا ''عیسائیوں کے پاس ایٹم بم ہے یہودیوں کے پاس بھی ایٹم بم ہے یہاں تک کہ ہندو بھی اس ہتھیار کے مالک ہیں اب میں ایٹم بم چاہتا ہوں۔ دی اسلامک بم'' ساتھ ہی انہوں نے ماہرین کی ٹیم تشکیل دینے کا حکم دے دیا فوراً ٹیم بن گئی جس نے چند ماہ کی تحقیق کے بعد اعلان کر دیا کہ صرف پاکستان نہیں بلکہ موجودہ حالات میں تیسری دنیا کے کسی بھی ملک کے لئے ایٹمی ٹیکنالوجی کا حصول ناممکن ہے۔ لیکن بھٹو صاحب نے اس رپورٹ کو سچ ماننے سے انکار کر دیا کچھ دنوں بعد ان کی ملاقات ڈاکٹر عبدالقدیر خان سے کرائی گئی جنہوں نے از سر نو فیزیبلٹی رپورٹ تیار کرنے کی ہامی بھر لی۔ چھ ماہ بعد وہ دوبارہ بھٹو سے ملے اور انہیں یہ خوشخبری سنائی کہ اگر بے انتہا پیسہ بے شمار افرادی قوت اور ماہرین کی ایک وسیع ٹیم ہو تو جوہری ٹیکنالوجی کے حصول کے ۶۰ فیصد امکانات ہو سکتے ہیں۔ بھٹو نے چند لمحوں کے لئے آنکھیں بند کیں اور پھر بڑے عزم سے بولے ''میں یہ رسک لینے کے لئے تیار ہوں'' اور اگلے ہی روز اسلامی دنیا کے سب سے بڑے منصوبے پر کام شروع کرنے کا فیصلہ ہو گیا' اب بھٹو کو ایک ایسا مخلص اور قابل شخص چاہیے تھا جو پورا پلانٹ اپنی نگرانی میں تیار کرا سکے چنانچہ انہوں نے ایسا بندہ فراہم کرنے کی ڈیوٹی آرمی چیف جنرل ضیاء الحق کو سونپ دی۔ جنرل ضیاء نے چند دن کی محنت کے بعد انجینئر ننگ کور

کے بریگیڈیئر زاہد علی اکبر کو بھٹو کے سامنے پیش کر دیا۔ وزیر اعظم نے ان کے ساتھ گپ لڑائی اور دو گھنٹے بعد رخصت کے وقت ''یس ہی از دی مین'' کہہ کر جنرل ضیاء کو اس انتخاب پر مبارکباد دے دی۔ یوں زاہد علی اکبر نے کام شروع کرا دیا لیکن اگلے چند روز میں ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا وہ تھا نیوکلیئر پلانٹ کے بارے میں بورڈ کا نیم دلانہ تعاون' یہ بورڈ غلام اسحاق خان، آغا شاہی اور این جی اے قاضی پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ کھل کر تعاون نہیں کرتے تھے۔ زاہد علی اکبر نے اس عدم تعاون کی شکایت جنرل ضیاء سے کی' انہوں نے انہیں وزیر اعظم سے براہ راست بات کرنے کا مشورہ دیا۔ زاہد علی اکبر اگلے روز بھٹو کے اے ڈی سی جنرل امتیاز کے پاس حاضر ہو گئے۔ جنرل امتیاز انہیں لے کر وزیر اعظم کے پاس پہنچ گئے۔ دونوں کی ملاقات ہوئی تو زاہد علی اکبر نے تمام مسائل وزیر اعظم کے گوش گزار کر دیئے۔ بھٹو نے سنا اور بولے ''آپ کو جو جو اختیارات چاہئیں کل کاغذ پر لکھ کر بورڈ کے پاس لے جائیں میں غلام اسحاق سے کہہ دوں گا وہ منظوری دے دیں گے لیکن'' انہوں نے شہادت کی انگلی اٹھائی اور کہا ''بس مجھے ایٹم بم چاہیے ہر صورت میں ہر قیمت پر'' زاہد علی اکبر نے انہیں سیلوٹ کیا اور واپس آ گئے۔ اس رات انہوں نے ایک کاغذ پر پاکستان کی تاریخ کے انتہائی وسیع اختیارات کی فہرست مرتب کی اور اگلے روز لے کر نیوکلیئر بوڈر کے سامنے پیش ہو گئے۔ غلام اسحاق خان نے پیپر پڑھا تو ان کے پسینے چھوٹ گئے' انہوں نے زاہد علی اکبر کو مخاطب کر کے کہا بریگیڈیئر ''جو اختیارات آپ مانگ رہے ہیں وہ تو پرائم منسٹر آف پاکستان کے پاس بھی نہیں ہیں'' زاہد علی اکبر نے یہ سنا تو اپنی کرسی سے کھڑے ہو کر کہا ''مجھے پرائم منسٹر آف پاکستان نے ایٹمی پلانٹ کو قابل عمل بنانے کا کام سونپا ہے جو ان اختیارات کی عدم موجودگی میں ممکن نہیں اگر آپ اس کی منظوری نہیں دے سکتے تو میں ابھی جا کر وزیر اعظم سے معذرت کر لیتا ہوں۔'' بقول زاہد علی اکبر غلام اسحاق خان نے آغا شاہی اور قاضی کی طرف دیکھا اور پھر مایوسی کے عالم میں سر ہلا کر میری درخواست پر دستخط کر دیئے جس کے بعد اس عظیم منصوبے کے لئے زاہد علی اکبر کو عظیم تر اختیارات مل گئے' وزیر اعظم کے اختیارات سے بھی بڑھ کر اختیارات۔

ہمارے لئے جگہ کا انتخاب سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ زاہد علی اکبر نے چند جیالوجسٹ حضرات سے مل کر جہلم کے نزدیک سطح مرتفع پر ایک پوائنٹ پسند کیا تھا لیکن مجھے وہ جگہ سیکورٹی کے حوالے سے زیادہ پسند نہ آئی' دوسرا وہ دارالحکومت سے نسبتاً دور بھی تھی' سنگل ہائی وے کی وجہ سے اس پوائنٹ پر ٹریفک کا رش بھی زیادہ تھا لہٰذا مجھے خدشہ تھا کہ ہم اس جگہ اپنی سرگرمیاں زیادہ دیر تک

چھپا نہیں سکیں گے لہٰذا جب میں نے اپنی رپورٹ پیش کی تو بورڈ نے میرے اعتراضات سے اتفاق کیا۔ اس کے بعد ہم زیادہ بہتر اور انتہائی محفوظ جگہ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے ہم نے بہت سی گھاٹیاں' وادیاں اور میدان کھنگال مارے لیکن ہمیں کہوٹہ سے بہتر مقام نہیں ملا' "اس کام کے لئے کہوٹہ ہی کیوں بہتر ہے" یہ وہ سوال تھا جو مجھ سے بورڈ کے تمام ممبران نے اس وقت پوچھا جب میں نے ''کہوٹہ'' کی سفارش کی تھی' میں نے پاکستان اور اسلام آباد کے نقشے نوٹس بورڈ پر لگا کر انہیں سمجھانا شروع کر دیا نمبر ا کہوٹہ کی زمینی ساخت ایسی ہے کہ اس پر فضا سے حملہ تقریباً ناممکن ہے۔ دشمن کے طیاروں کے لئے ایٹمی پلانٹ کی جگہ کا تعین آسان نہیں ہوگا۔ نمبر ۲ عام بڑی گزرگاہوں سے دور ہونے کے باعث ہم اس منصوبے کو اس وقت تک خفیہ رکھ سکتے ہیں جب تک ہم اپنا ہدف حاصل نہیں کر لیتے۔ نمبر ۳ اسلام آباد سے بہت قریب ہونے کے باعث اعلیٰ حکام بغیر کسی پروٹوکول اور شور شرابے کے کسی بھی وقت اس کا معائنہ کر سکیں گے اس کے علاوہ میں نے بورڈ کو اس جگہ کے بعض ایسے پہلو بھی بتائے جو میں سیکورٹی رسک کے باعث اخبار میں شائع نہیں کرا سکتا بہر حال اس طویل میٹنگ اور بے شمار سوال و جواب کے بعد اسلامی دنیا کے پہلے نیوکلیئر پلانٹ کی تعمیر کے لئے ''کہوٹہ'' کا تعین ہو گیا۔

میں نے اگلے چند ماہ میں ''کہوٹہ پلانٹ'' کا نقشہ بنا کر پیش کر دیا ہم نے نقشے میں ایٹمی ری ایکٹر کی حفاظت کو مکمل طور پر مدنظر رکھا لہٰذا اب اگر بلندی سے کہوٹہ پلانٹ کو دیکھا جائے تو مختلف عمارتوں میں سے اس عمارت کا تعین کرنا انتہائی مشکل ہے جس میں پاکستان کی ایٹمی تنصیبات ہیں دوسرا پہلو جو ہمارے مدنظر تھا وہ ایک عمارت سے دوسری عمارت کے درمیان محفوظ فاصلہ تھا تا کہ اگر خدانخواستہ فضائی حملہ ہو تو ایک عمارت پر گرائے گئے بم دوسری عمارت کو متاثر نہ کریں۔ بہر حال نقشہ منظور ہو گیا جس کے بعد ہم لوگوں نے ایٹمی ری ایکٹر کی تعمیر کے لیے دن رات ایک کر دیئے۔ خزانے کا منہ کھلا تھا' افرادی اور ٹیکنیکی قوت کی فراوانی تھی۔ ہم دنیا کے کسی کونے میں بننے والی چیز کی فرمائش کرتے زاہد علی اکبر اگلے روز وہ ہمارے سامنے پیش کر دیتے۔ پاکستان کے تمام سفارتخانوں کو خصوصی حکم جاری کر دیا گیا تھا کہ ہم جس چیز کا آرڈر دیں وہ ہر قیمت پر خرید کر فوراً بھیجی جائے۔

تینوں ٹیموں کی ترتیب کچھ یوں تھی' ڈاکٹر عبدالقدیر خان ہم سب کے سربراہ تھے' وہ ہمیں جو بنانے کا حکم دیتے میری ٹیم فوراً اس حصے کی تعمیر شروع کر دیتی جبکہ میری ٹیم کو اس تعمیر کے

لئے جتنا پیسہ اور جو وسائل درکار ہوتے وہ ہمیں زاہد علی اکبر فراہم کرتے بہر حال اس وقت ہم سب میں ایک لگن' ایک تڑپ اور کچھ کرنے کی شدید خواہش تھی چنانچہ ہم نے دن دیکھا اور نہ ہی رات۔ بعض اوقات تو ایسا بھی ہوتا کہ ہم پورا پورا دن بغیر کچھ کھائے پیئے گزار دیتے۔ رہی نیند تو جتنی دیر یہ پراجیکٹ جاری رہا ہم میں سے کسی شخص نے چار پانچ گھنٹے سے زیادہ نیند نہیں لی بہر حال ہماری محنت رنگ لائی اور ہم اسلامک دنیا کا پہلا اٹامک ری ایکٹر بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ نامکمل ٹیکنیکی مہارت' وسائل کی انتہائی کمی اور وسیع عالمی دباؤ کے باوجود اس منصوبے کی تکمیل کسی بڑے معجزے سے کم نہیں تھی' بیسویں صدی کا وہ معجزہ جس نے نہ صرف پاکستانیوں کو حیران کر دیا بلکہ ترقی یافتہ عالمی طاقتوں کو بھی پریشان کر دیا بہر حال یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی مہربانی تھی۔ وہ اگر نہ چاہتا تو شاید ہم تیسری دنیا کے ایک انتہائی پسماندہ ملک کے باشندے اتنے بڑے معجزے کا کبھی سوچ بھی نہ سکتے؟

جن دنوں کہوٹہ پلانٹ پر کام جاری تھا' ان دنوں ہم نے ڈیرہ غازی خان میں بھی ایک ''افزودگی پلانٹ'' تعمیر کیا تھا۔ اس کی وجہ ڈی جی خان سے تھوڑی دور ''بغل چور'' کی وہ پہاڑیاں تھیں جہاں یورینیم پایا جاتا تھا اس چھوٹے سے ''افزودگی پلانٹ'' کی تعمیر سے اس یورینیم کو افزودہ کرنے میں سہولت ہوگئی بعدازاں اس افزودہ یورینیم کو کہوٹہ لایا جاتا تھا جہاں سے اسے مزید افزودہ کر کے ''ویپن گریڈ'' تک لایا جاتا تھا۔

پاکستان کے پاس ایٹم بم ہے یا نہیں؟ کیا ہمارا ایٹمی پروگرام رول بیک ہو چکا ہے؟ وغیرہ وغیرہ یہ سوال ہیں جو مجھ سے میرے اکثر ملاقاتی پوچھتے ہیں۔ میں ہنس کر جواب دیتا ہوں پاکستان کے پاس ایٹم بم ہے بھی اور نہیں بھی۔ یہ سن کر اکثر لوگ حیران ہو جاتے ہیں لیکن میں وضاحت کر کے ان کی حیرانی دور کر دیتا ہوں کیونکہ میرا خیال ہے پاکستان کے پاس ساختہ شکل میں کوئی ایٹم بم موجود نہیں لیکن پاکستان کے پاس بم بنانے کا تمام سامان موجود ہے اور وہ چند دنوں کے نوٹس پر فوراً ایٹم بم اسمبل کر سکتا ہے۔ رہا ''رول بیک'' کا سوال تو آج سے سولہ سترہ برس پہلے ہی ہم اس لیول تک پہنچ چکے تھے جہاں سے ہمارے ایٹمی پروگرام کو رول بیک کرنا کسی مائی کے لال کے بس کی بات نہیں تھی۔ ساری جدید دنیا جانتی ہے اگر کوئی قوم ایک بار ''اٹامک پاور'' بن جائے تو پھر اس کی وہ قوت سلب نہیں کی جا سکتی' لوگ مجھ سے کہوٹہ پلانٹ کی سیکورٹی کے بارے میں بھی پوچھتے ہیں میں ان سے کہتا ہوں اب اگر کہوٹہ پلانٹ بنانے والے بھی چاہیں تو اس ایٹمی

ری ایکٹر کی ایک اینٹ کو بھی نقصان نہیں پہنچایا جاسکتا۔ ہماری فضائیہ کے طیارے چوبیس گھنٹے فضا میں کہوٹہ پلانٹ کی حفاظت کرتے رہتے ہیں۔ عجیب وغریب سطح زمین اس کی محافظ ہے۔ اسے کم فضا سے ٹھیک نشانہ لگانا بھی تقریباً ناممکن ہے' اندر کیا ہوتا ہے اس کا علم کسی ایک شخص کو نہیں لہٰذا اس کی جاسوسی بھی بہت مشکل ہے اور سب سے بڑھ کر خدا ہمارا حامی وناصر ہے چنانچہ نہمیں اور ہمارے اٹامک پروگرام کو کوئی خطرہ نہیں۔

شاید ۸۹ء میں ایک تقریب میں اس وقت کی وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو سے میری ملاقات ہوئی' میزبان نے جب کہوٹہ پلانٹ کے حوالے سے میرا تعارف کرایا تو وہ بہت خوش ہوئیں اور مجھ سے کہنے لگیں ''ڈاکٹر صاحب مجھے یقین ہے آپ نے کہوٹہ پلانٹ بہت مضبوط بنایا ہوگا'' میں نے مسکرا کر کہا ''محترمہ عمارت کے حوالے سے تو مجھے اس کی مضبوطی کا یقین ہے لیکن وہ سیاسی سطح پر کتنا مضبوط ہے میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' میرے یہ الفاظ سن کر وہ ناراض سی ہوگئیں بہرحال مجھے ان کی ناراضگی سے کیا لینا دینا۔

مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے اٹامک پروگرام اور مسئلہ افغانستان دو ایسے ایشو تھے جنہیں اگر ہم مناسب طریقے سے استعمال کرتے تو نہ صرف پاکستان کے سارے قرضے ادا ہو سکتے تھے بلکہ ہمارا شمار دنیا کی ترقی یافتہ اقوام میں بھی ہوتا لیکن جنرل ضیاء الحق نے ان مواقع سے بھرپور فائدہ نہیں اٹھایا۔ ہم اگر اٹامک پروگرام پر اسلامی دنیا کو اعتماد میں لے لیتے اور ان پر یہ ثابت کر دیتے کہ اس ٹیکنالوجی سے ہم یورپی یلغار کو بحرہند سے دور رکھ سکتے ہیں تو وہ یقیناً کھل کر ہماری مالی مدد کرتے یوں ہم بڑی آسانی سے ترقی کرتے چلے جاتے۔ اسی طرح افغان ایشو کے دوران بھی جنرل ضیاء کے پاس پاکستان کے سارے قرضے معاف کرانے کا بھرپور موقع تھا۔ وہ امریکہ سے سٹنگر میزائل اور ایف سولہ حاصل کر سکتے تھے تو وہ قرضے بھی معاف کرا سکتے تھے۔ ہمارے سامنے حسنی مبارک کی مثال ہے انہوں نے گلف وار کے دوران صرف غیر جانبدار رہنے کی شرط پر امریکہ سے ۷ بلین ڈالر کا قرضہ معاف کرا لیا افغانستان پر روسی حملے کے دوران تو پاکستان امریکہ اور یورپ کے لئے واحد وفائی بارڈر تھا ..... لیکن افسوس حماقت کی کوئی سرحد نہیں ہوتی۔

کہوٹہ پلانٹ کی تکمیل کے بعد میں نے پاکستان کے کئی منصوبوں پر کام کیا' ان میں ''لوکو موٹو'' سٹاف کالج کوئٹہ' جلو پارک اور چشمہ پلانٹ شامل ہیں۔ کچھ صنعتیں بھی لگائیں لیکن ملک کی سیاسی ابتری سے پریشان ہو کر میں جنوبی کوریا چلا گیا جہاں میں نے کوریا کی ترقی کے لئے

۵ بلین ڈالر کے منصوبوں پر کام کیا۔ اللہ تعالیٰ نے بڑی عزت دی کچھ عرصہ ''تنزانیہ'' میں بھی کام کیا' وہاں بھی بڑی عزت تھی' یورپ اور مڈل ایسٹ کے چند ممالک میں بھی میری کمپنی نے خدمات سرانجام دیں لیکن مجھے کوریا نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ ان لوگوں کی ایمانداری' خود کو اعلیٰ قوم بنانے کے خبط اور عزت نفس کا دنیا میں کوئی جواب نہیں۔ اگر کوئی ترقیاتی منصوبہ مقررہ مدت سے صرف ایک دن آگے چلا جائے تو کوریا کی ساری کی ساری نیم مستعفی ہو جاتی ہے۔ ان کے ایک ایک منصوبے کی منظوری پارلیمنٹ دیتی ہے اگر کسی منصوبے کے لئے ایک ڈالر بھی اضافی خرچ آئے تو اس کی منظوری پارلیمنٹ سے لینا پڑتی ہے۔ میں وہاں کے بیوروکریٹس اور انجینئرز کو ٹریننگ بھی دیتا رہا تھا میں نے ان جیسے ایماندار افسر پوری دنیا میں نہیں دیکھے۔ مجال ہے کوئی شخص رشوت یا بخشش کے بارے میں سوچ بھی لے کاش ہمارا ملک بھی ایسا ہی ہو' میں جب بھی باہر سے لوٹتا ہوں میرے دل سے یہی آواز نکلتی ہے۔

یہ جون ۱۹۹۲ء کی بات ہے واشنگٹن میں میری رہائش گاہ پر بش سینئر کی کچن کیبنٹ کا ایک ممبر مجھے ملنے آیا۔ یہ دراصل چار لوگوں کا ایک گروپ تھا جن کا بش پر بہت اثرورسوخ تھا۔ جب بش صدر بنا تو امریکہ کی دو سو بڑی اہم اور حساس پوزیشنوں پر انہی لوگوں نے تقرریاں کیں بہرحال گفتگو کے دوران پریسلر ترمیم اور پاکستان کی اقتصادی امداد پر گفتگو چل پڑی' امریکی سینیٹر نے اپنے ہونٹ میرے کانوں کے نزدیک لاتے ہوئے سرگوشی کی ''ہم پریسلر ترمیم پندرہ دن میں ختم کر سکتے ہیں'' میں چونک کر سیدھا بیٹھ گیا ''لیکن کیسے؟'' میرے جواب سے استعجاب جھلک رہا تھا ''بڑا آسان ہے اگر پاکستان فلاں کمپنی کو لابنگ کا ٹھیکہ دے دے۔'' سینیٹر نے اسی رازدرانہ لہجے میں جواب دیا۔ میرے لئے بڑی حیران کن خبر تھی بہرحال میں نے مزید تفصیلات پوچھیں تو پتہ چلا بنیادی طور پر وہ کمپنی انہی چار لوگوں کی تھی اور وہ اپنا اثرورسوخ استعمال کرتے ہوئے عموماً کام کرا لیتے تھے' میں نے فیس پوچھی تو پتہ چلا صرف دس لاکھ ڈالر سالانہ بہرحال پریسلر ترمیم کے خاتمے کے عوض رقم کچھ زیادہ نہیں تھی' میں نے دوسرے دن سیکرٹری جنرل خارجہ اکرم ذکی سے رابطہ کیا' انہوں نے نواز شریف سے بات کرنے کا وعدہ کیا' ایک ہفتہ گزر گیا لیکن اکرم ذکی کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا' میں نے دوبارہ رابطہ کیا تو اکرم ذکی نے صرف ''میاں صاحب نہیں مان رہے'' کہہ کر فون بند کر دیا' مجھے بہت افسوس ہوا' بہرحال میں نے امریکہ میں موجود چند دولت مند پاکستانیوں سے رابطہ کیا' وہ لوگ مل کر دس لاکھ ڈالر دینے کے لئے تیار ہو گئے' اسی

دوران ہمارا ایک جاننے والا پاکستانی مجھے ملا وہ گلف میں ایک بہت بڑا تعمیراتی ادارہ چلا رہا تھا اسے جب ہماری مجبوری کا پتہ چلا تو اس نے ۱۰ لاکھ ڈالر اپنی جیب سے ادا کرنے کا عندیہ دے دیا۔ یہ ہمارے لئے بڑی خوشخبری تھی ہم اگلے روز رقم کا چیک لے کر اس بینکر کے پاس چلے گئے وہ ملا لیکن اس نے یہ کہہ کر رقم لینے سے انکار کر دیا "پاکستان میں حکومت بدلنے والی ہے آپ یہ کام نئے لوگوں پر چھوڑ دیں" آپ یقین کریں یہ ہمارے لئے ایک نئی خبر تھی کیونکہ اس وقت تک پاکستان کے سیاسی حالات بالکل پرسکون تھے اور دور دور تک تبدیلی کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں اگلے ماہ پاکستان آ گیا یہاں بھی میں نے اپنے ذرائع سے سیاسی حالات کا اندرونی جائزہ لیا تو مجھے وہاں بھی کوئی گڑبڑ نظر نہ آئی۔ مجھے اس امریکی بینکر کے اعتماد اور اٹل لہجے پر بڑی حیرت ہوئی لیکن جولائی کے آخر میں جب میری ملاقات اس وقت کے آرمی چیف جنرل آصف نواز سے ہوئی تو میں نے ان کے تبدیل ہوئے لہجے سے بہت کچھ سمجھ لیا۔

میں اپنے ذرائع کا اعلان نہیں کر سکتا مگر یہ سچ ہے کہ ستمبر ۱۹۹۲ء میں ایک بہت بڑا انقلاب پاکستان کے دروازے پر دستک دے رہا تھا کچھ لوگ غلام اسحاق خان اور نواز شریف کی چھٹی کر کے کر ملک میں ٹیکنو کریٹس کی حکومت لانا چاہتے تھے یہ فارمولا اس حد تک مکمل ہو چکا تھا کہ ان لوگوں نے آئی ایم ایف کے ایک اعلیٰ عہدیدار کو وزیراعظم بننے کے لئے تیار کر لیا تھا جس نے شیروانی بھی سلوا لی تھی جبکہ وزیر خزانہ کے عہدے کے لئے شاہد جاوید برکی تیار بیٹھے تھے مجھے اطلاعات کا وزیر بننے کی پیش کش کی گئی لیکن میں نے اس خونی کھیل میں شرکت سے انکار کر دیا کیونکہ ان لوگوں کا پروگرام تھا کہ اقتدار پر قبضہ کرنے کے فوراً بعد پاکستان کے پانچ سو کے قریب اہم لوگوں کو گولی سے اڑا دیا جائے بعد ازاں ناجائز طریقوں سے دولت کمانے والے تمام لوگوں کو ٹارچر سیل میں بند کر کے ان سے کالا دھن وصول کیا جائے۔ گو منصوبے کے مطابق یہ بڑا آئیڈیل انقلاب تھا لیکن میں اس کشت و خون میں نہیں پڑنا چاہتا تھا کیونکہ اقتدار میرا منشا حیات نہیں تھا' تاہم میں نے اس سے اس منصوبے کو صیغہ راز میں رکھنے کا وعدہ کر لیا' میرے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ کار بھی نہیں کیونکہ اگر کسی کو اس منصوبے کی ذرہ بھی بھنک پڑ جاتی تو پانچ سو مقتولوں میں ایک شخص کا مزید اضافہ ہو جاتا اور وہ ہوتا ڈاکٹر اقبال والہلہ۔

ہو سکتا ہے منصوبہ آگے چل کر کامیاب ہو جاتا لیکن ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۲ء کو پاکستان کے ایک بہت بڑے اخبار کے چیف ایڈیٹر نے یہ ساری کہانی نواز شریف کے گوش گزار کر دی۔ اس

چیف ایڈیٹر کو ان "انقلابیوں" نے اپنا بندہ سمجھ کر "اعتماد" میں لینے کی غلطی کر لی تھی نواز شریف فوراً محتاط ہو گئے اور "انقلابی" فوراً بکھر گئے لیکن اس سے قبل کہ نواز شریف کے خلاف کوئی مزید سازش تیار ہوتی آصف نواز کا انتقال ہو گیا (انقلابیوں کا آج بھی یہ کہنا ہے انہیں قتل کیا گیا) اور یوں انقلاب کی وہ سازش اپنی موت آپ مر گئی اور نواز شریف کو اقتدار کے مزید چند ماہ مل گئے لیکن وہ زیادہ دیر تک اپنی پوزیشن برقرار نہیں رکھ سکے وہ ایسا کر بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ تیسری دنیا کے کسی کمزور ملک کا وزیراعظم بین الاقوامی سازشوں کے خلاف زیادہ دیر مزاحمت نہیں کر سکتا اسے گرنا ہی تھا سو وہ گر گیا۔ جنرل آصف نواز نہیں تو کوئی اور سہی ڈور ہلانے والوں کے لئے چیلوں کی کمی نہیں ہوتی۔

پاکستان میں انقلاب مولوی کے بس کی بات ہے نہ سیاستدان کے کیونکہ یہ دونوں طبقے جدید عصری تقاضوں سے آگاہ نہیں ہیں۔ ہم جب انجینئرنگ یونیورسٹی میں پڑھتے تھے تو ایک دن ہمارے وائس چانسلر نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔ پاکستان میں انجینئرنگ پڑھنے والے ایک ایک طالب علم پر ساٹھ ہزار روپے ماہانہ خرچ آتا ہے (یہ آج سے ۳۵ برس پہلے کی بات ہے) آپ خود فیصلہ کریں' کیا ہم مولوی کی تعلیم پر بھی اتنا ہی پیسہ خرچ کرتے ہیں؟ نہیں تو پھر روایتی تعلیم حاصل کرنے والا ایک محروم شخص قومی ترقی اور انقلاب کی بات کیسے سوچ سکتا ہے یہی حال سیاستدانوں کا ہے۔ جس شخص کا مسئلہ روٹی نہیں وہ ۱۳ کروڑ لوگوں کی ضروریات زندگی کے بارے میں کیسے سوچ سکتے ہیں' آپ یقین فرمائیں' اونچی سوسائٹی کی تقریبات میں یہ لوگ شراب پی کر غیر ملکیوں کے سامنے پاکستانیوں کی وہ برائیاں کرتے ہیں کہ خدا کی پناہ آپ کو شاید یقین نہیں آئے گا۔ ان ملکی سیاستدانوں کی تعداد کسی بھی طرح سوڈیڑھ سو سے کم نہیں جنہوں نے مجھ سے یہ کہا تھا "ڈاکٹر صاحب امریکی قونصلیٹ آپ کا دوست ہے ہمارے بیٹے' بھتیجے یا بھانجے کو امریکہ کا ویزہ لگوا دیں" یہ لوگ جن کی پاکستان سے کمٹمنٹ اتنی کمزور ہے' یہ ملک میں کیسے انقلاب لا سکتے ہیں۔ میں جب باہر جاتا ہوں تو مجھ سے اکثر غیر ملکی پوچھتے ہیں آپ جیسے ماہرین اور دانشور اپنے ملک کے لئے کام کیوں نہیں کرتے؟ میرے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا یہ ایسا سوال ہے جس کا جواب کسی بھی ایسے پڑھے لکھے پاکستانی کے پاس موجود نہیں جو اپنا ہنر' اپنی محنت اور اپنا ٹیلنٹ دوسرے ملکوں میں بیچ رہا ہے کیونکہ شاید ہمارے پاکستان اور ہمارے پاکستان کے اقتدار پر قابض لوگوں کو ہماری کوئی ضرورت نہیں' دیکھئے یہ ملک اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک ان لوگوں کو واپس لا

کران سے مناسب کام نہیں لیا جاتا جن کا ٹیلنٹ یورپ امریکہ اور مشرق بعید کی رگوں میں زندگی بن کر دوڑ رہا ہے۔

لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں' پاکستان کے بنیادی مسئلے کیا ہیں؟ میں ہنس کر کہتا ہوں صرف دو۔ مردم شماری اور کرپشن' لوگ حیران ہو کر سوال کرتے ہیں صرف یہی۔ تو میں کہتا ہوں ہاں یہی وہ دو مسائل ہیں جن سے سارے مسائل جنم لیتے ہیں' دیکھئے جس ملک کو اپنی کل آبادی کا علم نہیں وہ مستقبل کی تعمیر کا فارمولہ کیسے تیار کرے گا اسے کیسے علم ہوگا اسے کتنی سڑکیں درکار ہیں' لوگوں کے لئے کتنے ہسپتال' سکول اور ٹرانسپورٹ چاہیے۔ ہر سال کتنے لوگ نوکریوں کی عمروں کو پہنچتے ہیں' کتنے افراد کی شادی ہوتی ہے اور کتنے لوگ اپنی نسل کا سلسلہ آگے بڑھاتے ہیں۔ آبادی کے بارے میں کم علم کا مطلب صرف اور صرف یہ ہے کہ ہم ترقی کرنا ہی نہیں چاہتے' رہی کرپشن تو یہ صرف رشوت' لوٹ کھسوٹ اور چوری چکاری تک محدود نہیں' اگر کوئی شخص اپنا کام لگن' محنت اور ایمانداری سے نہیں کر رہا تو وہ بھی پوری طرح کرپٹ ہے' اگر دیکھا جائے تو اس نوعیت کی کرپشن مالی کرپشن سے زیادہ خطرناک ہے' پہلی کرپشن مال لوٹتی ہے جبکہ دوسری کرپشن پورے ملک کو تباہ کر دیتی ہے۔ ہم من حیث القوم ذہنی طور پر کرپٹ ہو چکے ہیں۔ ہم میں سے کون ہے جو اس ذہنی کرپشن سے بچا ہو۔ کوئی شخص' کوئی ادارہ' کوئی انسٹیٹیوٹ؟ نہیں کوئی نہیں لہٰذا تباہی ہمارا مقدر ہے۔

ملک کو بچانے کا ایک ہی طریقہ ہے پڑھے لکھے ہنرمند اور دانشور لوگ آگے آئیں اور پوری قوم کے لئے ترجیحات طے کریں۔ ایک سال تعلیم کے لئے' دوسرا سال معیشت کے لئے' تیسرا سال معاشرتی ترقی کے لئے اور اس طرح ہم آگے بڑھتے چلے جائیں' ایک ایک قدم' تھوڑا تھوڑا سفر' اگر ایسا نہ ہوا تو مجھے ڈر ہے ملک میں وہ خونی انقلاب آئے گا جو سب کو بہا لے جائے گا نہ مولوی بچے گا' نہ سیاستدان اور نہ ہی دانشور۔

میرے دفتر کا عملہ مجھ سے اکثر پوچھتا ہے" سر آپ اکثر بیٹھے بیٹھے چونک اٹھتے ہیں" میں یہ سن کر ایک قہقہہ لگاتا ہوں اور کہتا ہوں شاید میرا کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے لیکن اسی لمحے میرے اندر بہت گہرائی میں بہت سی خواہشیں ابلتی ہیں جیسے کسی پرسکون' اٹل اور پرشکوہ چٹان کے نیچے لاوا کروٹیں لیتا ہے اور اگر کبھی یہ لاوا الفاظ بن کر میرے دماغ پر دستک دے تو میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں شاید اب کوئی زاہد علی اکبر نہیں آئے گا جو آ کر مجھ سے کہے" ڈاکٹر صاحب آپ نے

اسلامک ورلڈ کا ایک اور بڑا منصوبہ تعمیر کرنا ہے' آیئے میرے ساتھ آیئے اور فرہاد بن کر چٹانیں کاٹنا شروع کر دیں۔" ہاں میں اکثر سوچتا ہوں شاید اب میرے مقدر میں چند صنعتیں' چند ملیں اور کالج سے بھاگے ہوئے لڑکے لڑکیوں کی جنسی تفریح کے لئے چند پارک بنانا ہی رہ گئے ہیں۔ اس ملک کی تعمیر کا کوئی خواب شاید اب کبھی میرے دروازے پر دستک نہ دے؟ لیکن اس کے باوجود دروازے کی طرف بڑھتی ہوئی ہر چاپ پر میرے کان کیوں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں اکثر سوچتا ہوں شاید اس لئے کہ میرے اندر کا انسان ابھی اس ملک کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوا....؟

• • •

فیچرز

یہ میرے چند فیچرز ہیں۔ تمام دوسرے صحافیوں کی طرح میری صحافت کا آغاز بھی نیوز ڈیسک سے ہوا تھا۔ میں جب میگزین میں گیا تو میں نے فیچرز لکھنے شروع کیے۔ یہ میرے ابتدائی دنوں کے مضامین اور فیچرز ہیں۔ میرا خیال ہے یہ مضامین میرے کالموں سے زیادہ دلچسپ اور زیادہ معلومات افزا ہیں۔

فیض احمد فیض

کے

نرم گوشے

٭٭٭٭٭

یہ میری صحافت کے ابتدائی دن تھے۔ میں ایک روز اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ اچانک دروازہ کھلا' خوشبو کی آندھی سی چلی اور اخبار کے اس چھوٹے سے دفتر میں رنگوں کی برسات ہونے لگی' میں ہونقوں کی طرح اسے دیکھنے لگا' اس نے میرا نام پوچھا اور پھر لمبی سی ہا کہہ کر بولی۔ ''ارے تم تو بہت چھوٹے ہو' میں سمجھی کوئی بابا ہوگا۔'' یہ بیگم سرفراز اقبال سے میری پہلی ملاقات تھی۔ وہ ساٹھ برس کی شاندار خاتون تھیں۔ ککے زئی تھیں لہٰذا ان کی سفید چاندنی سی جلد کے نیچے سرخ خون سرکتا تھا اور سرکتے سرکتے نظر آتا تھا۔ انہیں دیکھ کر محسوس ہوتا تھا وہ انسان کی شکل میں ایک شہکار ہیں۔ انہیں دیکھ کر یہ بھی محسوس ہوتا تھا جو شہکار انسانی ہاتھوں سے بنے ہوں یا انسانی خون سے' ان پر کبھی زوال نہیں آتا۔

وہ بازار روڈ پر رہتی تھیں۔ میرا دفتر ان کے گھر کے قریب تھا چنانچہ ان سے ملاقاتیں شروع ہوگئیں۔ کبھی وہ آ جاتی تھیں اور کبھی میں ان کے گھر چلا جاتا تھا' ان کے گھر جا کر معلوم ہوا ان کے عشاق کی فہرست بہت طویل ہے۔ فیض صاحب ہوں' صادقین ہوں' ابن انشا' محمد طفیل یا پھر احمد فراز سب ان کی زلف گرہ گیر کے اسیر رہ چکے ہیں۔ فیض صاحب نے اپنی عمر عزیز کا زیادہ حصہ ان کے گھر گزار دیا۔ صادقین نے ان کے لیے سینکڑوں پورٹریٹس بنائے اور ابن انشا نے اپنی آخری نظم ان پر لکھی۔ میں نے ان کی ذات' ان کی شخصیت کا جائزہ لیا تو محسوس ہوا وہ بنیادی طور پر ممتا کے رس سے بھری خاتون ہیں اور ان کے دامن میں پناہ لینے والے تمام لوگ کسی نہ کسی سطح پر بچے تھے' اور دانشوروں کے ساتھ ان کے تعلقات کی نیچر ماں اور بچے جیسی تھی۔ بیگم سرفراز اقبال کا دل رازوں کا

خزینہ تھا وہ جب میرے سامنے کھلیں تو انہوں نے بڑی بڑی شخصیات کے پردے اتار دیئے انہوں نے لوگوں کو ان کے اصل قد اور اصل رنگ وروغن میں میرے سامنے رکھ دیا۔ ان کے ساتھ دس سال تک میری ملاقاتیں رہیں اس کے بعد ان کا انتقال ہو گیا' ان کے انتقال کے بعد سی ڈی اے نے بازار روڈ' اسلام آباد کو ان کے نام سے منسوب کر دیا۔ میں آج بھی جب بیگم سرفراز اقبال روڈ سے گزرتا ہوں تو ۱۶ نمبر گھر کے سامنے رک جاتا ہوں اور اس کی گھنی بیلوں تلے گزرا وقت فلم کی طرح میرے دماغ میں چلنے لگتا ہے۔

فیض صاحب کی رومانوی زندگی پر بھی اس مضمون کا محرک بیگم سرفراز اقبال تھیں انہوں نے ایک طویل عرصہ فیض صاحب کی صحبت اور محبت میں گزارا تھا۔ جب وہ میرے سامنے فیض صاحب کا نام لیتیں تو ان کے لہجے میں محبت کے ساتھ ساتھ عقیدت اتر آتی تھی۔ ایک روز وہ فیض صاحب کا ذکر کر رہی تھیں تو میں نے اس مضمون کی ابتدائی سطریں لکھنا شروع کر دیں۔

یہ ۱۹۷۳ء کی رات تھی۔

کینیڈا میں بعض ہندوستانی گھرانوں نے فیض صاحب کے اعزاز میں ایک تقریب کا اہتمام کیا۔ کھانے کے بعد کچھ باذوق خواتین اور حضرات فیض صاحب کو لے کر ایک نیم تاریک گوشے میں بیٹھ گئے اور فرمائشوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا' "فیض صاحب ذرا دشت تنہائی میں" "فیض صاحب پھر کوئی آیا دل زار" "آپ نے اے روشنیوں کے شہر نہیں سنائی" "مجھے تو آپ کوئی تازہ چیز سنائیں' اور فیض صاحب سگار کا گہرا کش لگاتے ٹھوڑی کے نیچے ہتھیلی جما کر مسکراتے اور اپنے مخصوص کھردرے انداز سے فوراً فرمائش بجا لاتے۔ ڈرائنگ روم سے باہر مانٹریال کی مخصوص رات قطرہ قطرہ اتر رہی تھی اور اندر پیانوں کی خوشبو سرمستی کے عالم میں اُڑتی' لڑکھڑاتی اور کسی رنگین پلو سے ٹکرا کر سجدہ ریز ہو جاتی لیکن ذرا ٹھہریئے۔ وہاں صرف خوشبو نہیں تھی چند ٹھٹھری روشنیاں' فیض صاحب کی فکر کی مستی میں جھلکی چند ادھوری سرگوشیاں اور لامحدود سکون بھی تو تھا اور ان سب کے درمیان اپنے وقت کا سب سے بڑا تخلیق کار شیشے میں مچلتی آگ پر نظریں جمائے سرگوشیوں میں یوں بول رہا تھا کہ لفظ کیفیت بن کر ہر چہرے پر اُتر رہے تھے اور پھر جب رات بُری طرح بھیگ گئی اور پلکوں کا ارتعاش تک دبک کر سونے لگا تو محفل بکھرنے لگی۔ تمام ہمدم ایک ایک کر کے اُٹھنے لگے۔ پیانوں کی روشنی ماند پڑ گئی۔ خوشبو ہوا کے ساتھ چل پڑی اور رات سحر کے دروازے پر دستک دینے لگی' وہاں صرف آخری گھونٹ' آخری کش اور فیض صاحب رہ گئے۔ فیض صاحب نے ایش ٹرے میں سگار مسلا اور انگڑائی لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے لیکن اس سے قبل کہ وہ دروازے پر کھڑے میزبان جوڑے سے کمرے میں جانے کی اجازت لیتے ہال میں کانچ سا کا "آپ بہت مشکل لکھتے ہیں" فیض صاحب کو جھٹکا لگا اور انہوں نے مڑ کر چاروں طرف

دیکھا سامنے نیم تاریکی میں سرخ موم سے بنا ایک بت بیٹھا تھا۔ فیض صاحب نے بوجھل آواز میں پوچھا ''تو پھر میں کیا لکھوں'' بت نے بھرپور قہقہہ لگایا اور کہا ''آپ ہماری ہندی میں بھی تو لکھا کریں نا'' فیض صاحب نے سینے پر ہاتھ رکھا اور شیکسپیر کے شاہی کرداروں کی طرح تھوڑا سا جھک کر کہا۔ ''ضرور تعمیل ہوگی'' بت نے ایک اور قہقہہ لگایا اور اُٹھ کر اپنے خدا کے سامنے کھڑا ہو گیا' خدا نے پوچھا۔ ''آپ کیا کرتی ہیں'' بت بولا۔ ''صرف باتیں''۔ ''ہاں آپ کو صرف باتیں کرنی چاہئیں۔'' بت نے ایک اور بھرپور قہقہہ لگایا اور سارے ہال میں کانچ کی کرچیاں بکھر گئیں۔

یہ مریم تھی۔ دہلی کی مریم بلگرامی' فیض صاحب کا آخری عشق' اسی رات جب اندھیرے کی کوکھ سے صبح جنم لے رہی تھی تو فیض صاحب کے شعور پر ایک گیت دستک دے رہا تھا۔

جلنے لگیں یادوں کی چتائیں
آؤ کوئی گیت بنائیں

جن کی راہ تکتے جگ بیتے
چاہے وہ آئیں نہیں آئیں

آنکھیں موندھ کے نت پل دیکھیں
آنکھوں میں ان کی پرچھائیں

اپنے اوروں کا تاج سجا کر
بے دردی کے سامنے جائیں

جب رونا آوے مسکائیں
جب دل ٹوٹے دیپ جلائیں

پریت کی ریت انوکھی ساجن
کچھ بھی نہ مانگیں سب کچھ پائیں

فیض ان سے کیا بات چھپی ہے
ہم کچھ کہہ کر کیوں پچھتائیں

اسی رات ایک قطعہ بھی اُترا۔

اپنے انعام حسن کے بدلے
ہم تہی دامنو سے کیا لینا
آج فرقت زدوں پر لطف کرو
پھر کبھی صبر آزما لینا

اگلی صبح فیض نے یہ ساری واردات اور یہ گیت اپنی ''ہمدم دیرینہ'' سرفراز اقبال کو لکھ بھیجا۔ فیض کی نبض شناس خاتون کے لئے یہ انوکھی بات تھی۔ اس نے فوراً فیض کو لکھا جس کا جواب فیض نے بیروت سے دیا۔ لکھتے ہیں ''تم نے چاہنے والیوں کا ذکر کیا ہے' وہ تو ہیں اور اللہ انہیں خوش رکھے لیکن ہر کسی سے تو وہ کچھ نہیں مانگ سکتے نہ مل سکتا ہے جو حسن اتفاق سے وہاں میسر آ گیا تھا اور جس کی طلب ہمیشہ کی طرح باقی ہے۔ تم نے لکھا تھا کہ تم بھی تو باتیں کرتی ہو اور شاید اسی وجہ سے اچھی لگتی ہو۔ تم مجھے اچھی ضرور لگتی ہو لیکن اس میں باتیں کرنے کے علاوہ اور چیزوں کو بھی دخل ہے۔'' (دامن یوسف۔ صفحہ ۸۴)

چند دنوں کی رفاقت کے بعد مریم بلگرامی دہلی اور فیض صاحب بیروت لوٹ آئے جس کے بعد تمام تر رابطہ خط و کتابت تک سمٹ گیا۔ اسی دوران ایک بار فیض صاحب نے دہلی کا چکر بھی لگایا جہاں سے واپسی پر انہوں نے سرفراز اقبال کو ایک خط لکھا جس میں انہوں نے ''نئے تعلق'' کے بارے میں چلتے چلتے صرف ایک فقرہ لکھا لیکن یہ فقرہ کس قدر ظالم تھا اس کا اندازہ صرف فیض کے عشاق ہی لگا سکتے ہیں' لکھتے ہیں۔

''اور یہ تمہیں ابھی سے اپنی عمر کی فکر کیوں ہونے لگی! ابھی تو بقول شکیل تمہیں اپنے دامادوں کو رام کرنا ہے اور تمہاری یہی صورت رہی تو شاید ان کی اولادوں کو بھی۔ ہمیں اب کبھی کبھی یہ خیال ضرور آنے لگا ہے کہ اس عمر میں دنیا والوں سے منہ موڑ کر اللہ اللہ کرنا چاہیے لیکن تم جیسے لوگ یہ کرنے ہی نہیں دیتے بلکہ اب ہم دہلی گئے تو تم جیسے لوگوں میں ایک آدھ کا اور اضافہ ہو گیا اگرچہ یہ بات تم سے کرنی نہیں چاہیے۔'' (دامن یوسف۔ صفحہ ۸۸)

مریم بلگرامی وسنت پارک دہلی میں رہتی تھی۔ سرخ و سپید رنگت کی اس دھان پان سی خاتون میں بے انتہا مشرقیت تھی' وہ نرم ملائم آواز میں گھنٹوں باتیں کرتی تھی اور ہلکے ہلکے احساس میں ہر لحظہ پگھلتی تھی۔ اس کی یہ ادائیں فیض کے وجود کا حصہ بن گئیں۔ اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فیض

کی اس سے کتنی ملاقاتیں رہیں وہ کبھی پاکستان آئی یا نہیں اور فیض کی شاعری کے کتنے حصے میں وہ احساس بن کر دھڑکتی ہے۔ فیض کی زندگی میں یہ راز احرام مصر کی مردہ داستان کی طرح اندھیرے میں پڑا رہا یہاں تک کہ فیض نے اپنی راز دار سرفراز اقبال کو بھی زندگی میں مریم بلگرامی کا نام نہیں بتایا ہاں البتہ انتقال سے چند روز قبل جب فیض اسلام آباد میں بازار روڈ پر واقع سرفراز اقبال کے گھر آئے تو رخصت سے چند لمحات قبل انہوں نے سرفراز اقبال کو ایک لفافہ دیا اس کے بارے میں ان کا حکم تھا کہ اسے ان کی زندگی میں نہ کھولا جائے۔ یہ لفافہ ایک طویل عرصے تک سرفراز اقبال کے سوٹ کیس میں پڑا رہا۔ یہاں تک کہ فیض کی دو تین برسیاں گزر گئیں چیزیں رکھتے اور نکالتے وقت جب بھی سرفراز اقبال کی اُنگلیاں اس لفافے سے ٹکراتیں وہ اسے نکال کر دیکھتی' چھو کر اس کا لمس محسوس کرتی مگر اسے کھول کر نہ دیکھتی۔ میں نے جب اس سے اس واردات کے متعلق پوچھا تو وہ کہنے لگی۔ '' مجھے اس لفافے سے بہت ڈر لگتا تھا کیونکہ میں فیض صاحب کی واحد دوست تھی جو ان کی زندگی کے زیادہ تر رازوں سے واقف تھی لیکن فیض نے کبھی زندگی میں اتنے پُر اسرار انداز اور اتنی یقین دہانی کے ساتھ کوئی چیز مجھے نہیں دی تھی لہٰذا میں گھبراتی تھی کہ معلوم نہیں اس لفافے سے کیا نکل آئے اور میں معلوم ہونے کے بعد اس راز کو کہاں تک راز رکھ سکوں۔

'' بہر حال ایک طویل عرصے تک یہ راز اس لفافے میں بند رہا۔ اب پتہ نہیں سرفراز اقبال نے کس ذہنی کیفیت یا حادثے سے مجبور ہو کر یہ لفافہ کھولا لیکن کھلنے کے بعد اس سے چار پانچ خطوط نکلے جن پر مریم بلگرامی کا نام لکھا تھا۔ یہ خطوط جہاں ایک گہرے جذبے میں ڈوب کر لکھے گئے تھے وہاں یہ چند سطریں ایک ایسی خاتون کا پیکر بھی تراشتی ہیں جو ذوقِ مطالعہ اور جرأتِ اظہار کا مکمل ملکہ رکھتی تھی۔ ان خطوط میں نہ صرف ''ٹین ایج'' کی گرمائش پائی جاتی تھی بلکہ ایک فکری سرشاری اور سب کچھ لٹا کر بہت کچھ پا لینے کی خواہش بھی پوری قوت کے ساتھ موجود تھی۔ ان خطوط میں سے ایک خط نذرِ قارئین ہے۔

جونم

کل تمہارا محبت نامہ دیکھ کر کچھ دیر تک یقین نہ کر سکی تمہارے Optimism سے بہت ہمت بندھ رہی ہے ورنہ یہ سوچ کر اب تو آدھی ملاقات کی بھی کوئی صورت نہیں ہے' بالکل مایوس ہو چکی تھی۔ تم تو دیارِ غیر کی

بات کر رہے ہو اور میں تو سوچتی ہوں کہ کہیں پرلوک میں بھی شاید ستارے نہ مل سکیں (کیا پرلوک میں بھی ستارے ہوتے ہیں؟) اُف! کیا کیا تمہارے آنے کی آس لے کر بیٹھے تھے! یقین اس لئے تھا کہ خود ''گھوڑے'' کے منہ سے یہ خبر ملی تھی۔ کانفرنس کے شروع ہونے سے آخر ہونے تک صبح شام کاؤنٹر پر جا کر پوچھ آتی تھی یہاں تک کہ جو صاحب کاؤنٹر پر رہتے تھے اور آنے والوں کی لسٹ رکھتے تھے مجھ سے پوچھ بیٹھے کہ آپ کو ان کا بہت انتظار ہے آپ ان کی کیا لگتی ہیں۔ میں نے کہا Admirer تو کہنے لگے کہ وہ تو ہم سب ہی ہیں' اب اس کا کیا جواب..... غرض جب تمہارے نہ آنے کا یقین ہو گیا تو کچھ ایسی عجیب سی مایوس کن نا اُمیدی ہوئی کہ دل ہی بیٹھ گیا۔ پریشان دماغی اور Frustration چھپانے کے لئے بہت کچھ کام بہت جلدی کرنے کی کوشش میں سیڑھیوں سے گر گئی اور داہنا ہاتھ ٹوٹ گیا۔ چھ ہفتوں کے بعد چار روز پہلے پلاسٹر نکلا ہے تو ہاتھ کچھ عجیب ٹیڑھا میڑھا ہے چونکہ کمپونڈ فریکچر تھا۔ سنتے ہیں کبھی بھی بالکل Normal نہیں ہو سکتا اور تھوڑی بہت اکڑن ہمیشہ رہے گی۔ اتنے دنوں کے بعد یہ پہلا خط اس ہاتھ سے لکھ رہی ہوں اور خوش ہوں کہ یہ تم کو لکھ رہی ہوں۔ ویسے بائیں ہاتھ سے اپنی والدہ کو خط لکھا کرتی تھی۔ (جن کو پڑھ کر وہ خوش ہونے کے عوض میں تے سنا وہ خوب روتی تھیں) اور سوچتی تھی کہ اگر ہاتھ کھلنے کے بعد لکھ ہی نہ سکوں تو تم کو کیسے پتہ چلے گا کہ میں کیوں تمہیں لکھ رہی ہوں پھر یہ سوچتی کہ چلو ہاتھ ہی تو ٹوٹا ورنہ مر جاتی تو کون سا ان کو پتہ چل جاتا! غرض پڑھنے کے قابل تو لکھ ہی لیا۔

میرا نیا گھر اور تمہارا پودا دونوں ہی اس انتظار میں ہیں کہ کب ان کی قسمت چمکے۔ پودے نے تو اپنے آپ کو خوب سجا لیا تھا کہ تم دیکھ کر خوش ہو گے Blossom اتنے بھر گئے تھے کہ ایک پتا نظر نہیں آ رہا تھا اب تو اس میں پھل آ چکے ہیں۔ تمہارے لئے کمرہ تیار رکھا تھا اور اس سوچ میں تھی کہ کہیں تم ہوٹل ہی میں نہ رہ جاؤ۔ اب تو ہمارا گھر ایئر پورٹ سے بے حد قریب ہے۔ ٹیلی فون نمبر جلد ہی بدل کر 670689 ہو جانے والا ہے تم یہ نیا نمبر بھی لکھ رکھو۔ یہ

سب اس اُمید پر کہ وہ تین دن سے کچھ امید افزا خبریں مل رہی ہیں۔ خدا جلد ہی وہ دن لائے۔

کیا تم کو میرے پچھلے دو خط مل گئے تھے؟ میں نے ان میں بھی یہ سوال پوچھا تھا کہ تم کو اسی پتے پر خط لکھوں مگر تم نے جواب نہیں دیا۔ تمہارے دوستوں کو تمہارا پیام نہیں پہنچا سکتی ورنہ بہت کچھ Explanation کرنا پڑیں گی۔ گیت بہت خوبصورت ہے منے بھائی نے تو یہ نہیں دیا تھا البتہ وہ عربی نظم دی تھی۔ یہ عشق آباد ہے (میرے دل کے سوا کوئی اور بھی ہے۔)

اس صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ ظفر سے کتابوں کا شکریہ کہہ دینا بے حد پیار کے ساتھ۔

تمہاری

مریم''

خطوط دیکھنے کے بعد سرفراز اقبال کو مریم بلگرامی سے ملاقات کا شوق ہوا لیکن مصروفیات نے دہلی جانے کا موقع نہ دیا۔ ایک عرصے بعد جب وقت ملا تو مریم بلگرامی نہ ملی کیونکہ سرفراز اقبال کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی اس کا انتقال ہو چکا تھا۔ سرفراز اقبال بھی بڑی بے وقوف ہے جو ان خطوط سے مریم کی شدت کا اندازہ کر سکی اور نہ ہی یہ جان سکی کہ جب جذبے روحوں میں سرایت کر جاتے ہیں تو پھر روحیں زیادہ دیر تک جسموں کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتیں۔ اور یہ جان بھی کیسے سکتی تھی کیونکہ اس کے لئے تو جذباتی بلوغت درکار ہوتی ہے اور اگر یہ اس معراج پر ہوتی تو اس کا نام سرفراز اقبال نہ ہوتا مریم بلگرامی ہوتا۔

اور بہت پہلے جب ابھی پاکستان اور بھارت کی تقسیم نہیں ہوئی تھی تو سری نگر کی خنک ہواؤں' برف کی سرکتی نرم ملائم چادر اور آتش دان سے اُٹھتی مدہوش حدت میں بھی فیض کے لئے ایک دل دھڑکتا تھا۔ کشمیر کی سب سے بڑی دانشور خاتون بیگم محمودہ شاہ کا دل جس کی نشست گاہ میں رات گئے تک سماوار میں قہوہ اُبلتا رہتا اور فیض' تاثیر' عبداللہ شاہ اور غلام عباس اپنے اپنے پیالے پکڑے آتش دان کے قریب بیٹھے رہتے اور محمودہ شاہ گود میں کتاب رکھے آرام کرسی پر جھولتی رہتی۔ نہ بات نہ کلام بس خانگاہوں جیسی خاموشی اس دیوار سے اس دیوار تک بہتی رہتی جس

میں بھی آتش دان کی گیلی لکڑیوں کی چٹک سروں پر دستک دیتی ہوئی گزرتی تو وہ سب چونک کر اس کی طرف دیکھتے اور کہتے ''آپ نے کچھ کہا'' اور وہ بیگم محمودہ شاہ بڑی رسان سے گردن ہلا کر کہتی ''نہیں'' تو وہ محبوبانہ غصے سے کہتے ''نہیں نہیں ہم نے ابھی آواز سنی ہے۔ وہ مسکراتی اور کہتی تم نے اپنے اپنے گمان کی آواز سنی ہے ورنہ اس ویرانے میں آواز کا کیا کام۔ برسوں بعد جب ان واقعات کا عینی شاہد شمیم قریشی (معروف پامسٹ اور محمودہ شاہ کا لے پالک بیٹا) مجھے یہ قصہ سنا رہا تھا تو میں نے فیض کی ابتدائی شاعری میں رچی اس اُداسی کا بھید پا لیا جو ہر پڑھنے والے کی آنکھوں میں اُتر جاتی ہے۔ ہر گانے والے کی آواز میں بولتی ہے اور ہر سننے والے کے وجود سے دکھوں کی چادر کی طرح لپٹ جاتی ہے۔ محمودہ شاہ فکر سے بنی ہوئی عورت تھی' اس کے تمام جذبے کہیں بہت گہرائی میں خاموش پڑے تھے اگر کبھی کوئی عیسیٰ دروازے پر دستک دیتا اور ان جذبوں کی میت میں کوئی حرکت بیدار ہو جاتی تو یہ لمحے جلد گزر جاتے۔ ان کی آواز ان کی حرکت' ان کی تڑپ اس کے وجود سے باہر نہ چھلکتی۔ پانی برف کی تہہ توڑ کر باہر نہ اُبلتا۔ فیض جانتے تھے وہ ان کے بارے میں سوچتی ہے' دل ہی دل میں ان کے شعروں پر داد دیتی ہے' ان کی نیلی آنکھوں میں جذبوں کے چھوٹے چھوٹے ستارے بھی جھلملاتے ہیں لیکن اس کی زبان سے اقرار کا ذائقہ اُڑ چکا تھا وہ لفظ ہی بھول چکی تھی جن کی دستک سے بند کواڑ کھلتے ہیں اور خون فٹ بال بن کر پسلی پر ضرب لگاتا ہے۔ مجھے نہیں پتہ وہ خاتون فیض کی باقی زندگی میں سایا بن کر ان کے ساتھ ساتھ چلتی رہی یا وہ اس کی لاش سری نگر کی کسی برفیلی کھائی میں دفن کر آئے لیکن یہ بات طے ہے کہ فیض کے دوست زندگی بھر ان کی طویل اداسی' خاموشی اور دنیا سے بیزارگی کی کوئی وجہ دریافت نہ کر سکے کیونکہ وہ یہ بھول گئے تھے کہ دھماکوں کے بعد خاموشی ہمیشہ گہری ہوتی ہے اور رونق اُجڑنے کے بعد ان کی اُداسی بھی اتنی جلدی نہیں جاتی۔

ادھر ایف سیون کی ایک گلی میں دھان پان سی ادھیڑ عمر خاتون ہوتی تھی۔ وقت جس کے بالوں میں سلیٹی رنگ بن کر چمکتا تھا۔ مرجھائی جلد کے نیچے بھاگتا دوڑتا لہو اس کی گئی گزری شادابی کا ثبوت پیش کرتا تھا جس کی مرمریں انگلیوں میں سگریٹ دھواں دیتا تھا اور جس کے نرم ہونٹوں پر شاعرانہ ملاحت ڈیرے ڈالے رہتی تھی اور یہی تھی وہ خاتون (شاید اس کا نام مسز قیوم تھا) تھی۔ جو ہر رات اس عظیم شاعر کی وادی گمان سے گزرتی اور تخلیق کے سارے تار ہلا کر چلی جاتی۔ اگر کبھی تلخی ایام فیض کے گرد گھیرا تنگ کر دیتی یا تیر دشنام سینے کے آر پار ہو جاتا تو خاک بہ سر

اور خوں بادامن ہو کر اس کے دروازے پر آ کھڑے ہوتے اور وہ اپنی نرم انگلیوں سے ایک ایک کر کے روزنامہ کام کے تمام کانٹے چن لیتی۔ ایک روز سرفراز اقبال نے فیض صاحب سے پوچھا۔

''آپ کی زندگی میں اور کون کون آیا؟''

فیض مسکرائے اور کہا۔

''دل زار میں شمار کا حوصلہ کہاں ہے۔''

سرفراز اقبال نے دکھی دل کے ساتھ دوبارہ پوچھا لیکن کوئی ایک جس سے ملنے کے بعد آپ کا جی چاہا کاش ساری زندگی اس کے ساتھ گزر جاتی۔

''ہاں ایک ہے۔'' فیض نے سگریٹ کا گہرا کش لیا اور بولے۔ ایف سیون کے اس بت نے ہمیں زندگی بھر توحید پرست نہ ہونے دیا۔ اگر ہم ڈاکو ہوتے تو اسے ضرور اٹھا کر لے جاتے۔''

جب سرفراز اقبال مجھے یہ قصہ سنا رہی تھی تو میں نے ہنس کر کہا۔ فیض صاحب ڈاکو ہی تھے کیونکہ سینوں سے دل نکال لینا عام لوگوں کے بس کی بات نہیں ہوتی۔

• • •

حکمرانوں کے دسترخوان

اس مضمون کا محرک بہت دلچسپ تھا' ۱۹۹۶ء میں اخبارات میں ایک چھوٹی سی خبر شائع ہوئی' اس خبر میں انکشاف ہوا۔ ''وزیراعظم نے وزیراعظم ہاؤس کا چیف شیف معطل کر دیا۔'' تفصیلات میں لکھا تھا۔ ''وزیراعظم نے اپنے لیے سویٹ ڈش تیار کرائی' یہ ڈش جب وزیراعظم تک پہنچی تو انہیں ایمرجنسی میں ایک میٹنگ میں جانا پڑ گیا' انہوں نے جاتے جاتے سویٹ ڈش فریج میں رکھوا دی۔ رات گئے وزیراعظم واپس آئیں تو انہوں نے سویٹ ڈش لانے کا حکم دیا' وزیراعظم ہاؤس کا عملہ کچن میں پہنچا تو یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا وزیراعظم کی سویٹ ڈش فریج سے چوری ہو چکی ہے۔ اس ''چوری'' کی اطلاع جب وزیراعظم تک پہنچی تو انہوں نے چیف شیف کو معطل کر دیا۔ یہ خبر بہت دلچسپ تھی' میں نے جونہی یہ خبر پڑھی' میں نے سوچا پاکستان کے سابق اور موجودہ حکمرانوں کے دسترخوان ایک دلچسپ موضوع ہے اگر اس پر تحقیق کی جائے اور اس تحقیق کی بنیاد پر ایک طویل فیچر لکھا جائے تو قارئین اس میں دلچسپی لیں گے۔

یہ فیچر ۱۹۹۶ء میں اخبار میں شائع ہوا اور بے شمار قارئین نے اسے پسند کیا۔

......

قائد کی صحت بری طرح گر رہی تھی۔

کھانا پینا تقریباً بند ہو چکا تھا۔ ایک سلائس صبح کھاتے اور ایک شام کو دودھ میں بھگو کر دیا جاتا۔ بینائی تقریباً جواب دے چکی تھی۔ اُٹھنے' بیٹھنے اور چلنے پھرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح اپنے عظیم بھائی اور کرنل الٰہی بخش اپنی زندگی کے عظیم ترین مریض کی گرتی ہوئی صحت پر بہت پریشان تھے۔ جب نقاہت حد سے گزرنے لگی تو معالج اپنے مریض کی خوراک کے بارے میں غور کرنے لگے۔ اسی دوران انہیں بتایا گیا قائداعظم بمبئی میں ''کپورتھلہ برادرز'' کے کھانے بہت پسند فرمایا کرتے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد یہ برادرز پاکستان ہجرت کر آئے اور آج کل پنجاب کے کسی شہر میں اقامت پذیر ہیں۔ کرنل الٰہی بخش نے فوراً کراچی بات کی جہاں سے حکومت پنجاب کو کپورتھلہ برادران کی تلاش کا حکم جاری ہو گیا۔ خفیہ ادارے حرکت میں آئے اور دو دن بعد فیصل آباد کے کسی دور اُفتادہ مقام سے ان دونوں بھائیوں کو برآمد کر کے زیارت بھیج دیا گیا۔ کرنل الٰہی بخش نے انہیں کچھ سمجھایا اور وہ باورچی خانے میں اپنے کام میں جت گئے۔ اس شام جب قائداعظم کو کھانا پیش کیا گیا تو انہوں نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ دوسرے روز دوبارہ کھانا پیش ہوا تو قائد نے اسی رغبت کا مظاہرہ کیا۔ شام کو جب ایک بار پھر طشتری لائی گئی تو قائداعظم کھاتے کھاتے ٹھٹکے اور کرنل الٰہی بخش کو مخاطب کر کے پوچھا۔ ''آج کل میرا کھانا کون بنا رہا ہے؟'' کرنل الٰہی بخش نے یہ الفاظ سنے تو ان کا سینہ فخر سے پھول گیا اور وہ سیدھے کھڑے ہو کر بولے۔ ''سر کپورتھلہ برادرز'' قائداعظم نے کھانے سے فوراً ہاتھ کھینچ لیا اور پوچھا ''وہ یہاں کیسے آئے؟'' جواباً الٰہی بخش نے بڑے پُرجوش انداز سے ساری واردات سنا دی۔

قائداعظم کا رنگ غصے سے سرخ ہو گیا اور انہوں نے اسی وقت ''کپور تھلہ برادرز'' کو طلب کیا۔ انہیں تین دن کی تنخواہ دی' پھر فیصل آباد سے زیارت تک ان کے سفر پر اٹھنے والے اخراجات کا چیک کاٹا' وہ چیک خزانے میں جمع کرانے کا حکم دیا اور پھر فرمایا۔ ''ایک غریب ملک کا غریب گورنر جنرل اس عیاشی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔''

ذوالفقار علی بھٹو تک پاکستان کے حکمرانوں کے باورچی خانوں اور دستر خوانوں کی تاریخ خاموش تھی۔ نہ مینوتھ باورچی نہ لمبے چوڑے بیرے اور نہ ہی سینکڑوں ہزاروں برتن۔ زیادہ تر حکمران جب گورنر جنرل ہاؤس' قائداعظم ہاؤس' ایوان صدر یا وزیراعلیٰ ہاؤس منتقل ہوتے تو اپنا باورچی ساتھ لاتے جسے اپنی ذاتی جیب سے تنخواہ دیتے تھے۔ باورچی گورنر جنرل ہاؤس کے کسی بیلدار' چپڑاسی یا چوکیدار کو اپنی مدد کے لئے شامل کر لیتا جو ''روٹی'' کے لالچ میں سبزیاں کاٹتا' گوشت صاف کرتا' آلو پیاز کترتا اور گرم مصالحے پیستا۔ صاحب کے کھانے کا وقت ہوتا تو ٹیبل پر پلیٹیں' گلاس' نیپکن اور چھری کانٹے رکھتا جبکہ کھانا سرو کرنے کی تمام ذمہ داری خود باورچی کی ہوتی تھی۔ اکثر اوقات ایسا بھی ہوتا جب کھانے پر صاحب کا کوئی دوست مدعو نہ ہوتا تو وہ اپنے تمام ملازمین کو بلا کر اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دے دیتے جسے وہ لوگ فوراً قبول کر لیتے تھے لیکن یہ روایات بھی دوسری روایات کی طرح آہستہ آہستہ دم توڑتی چلی گئیں اور اب وزیراعظم ہاؤس' ایوان صدر' گورنر ہاؤسز اور وزرائے اعلیٰ کی رہائش گاہوں کے باورچی خانوں کے ماہانہ اخراجات کروڑوں تک چلے جاتے ہیں جو براہ راست سرکاری خزانے سے ادا کئے جاتے ہیں۔

خان لیاقت علی خان کے پاس جموں کا ایک کشمیری باورچی ہوتا تھا جس کا اصل نام یوسف پانڈے تھا لیکن اسے سب صرف ''پانڈے'' کہہ کر بلاتے تھے۔ یہ باورچی زندگی بھر قائد ملت کی خدمت کرتا رہا۔ جب خان صاحب طالب علم تھے تو یہ ان کے ساتھ ہاسٹلوں میں رہا۔ بعد ازاں جب وہ عملی سیاست میں آئے تو بھی یہ ان کی مسلسل خدمت کرتا رہا۔ پاکستان بننے کے بعد اس نے جموں واپس جانے کی بجائے خان صاحب کے خاندان کے ساتھ کراچی آنے کو فوقیت دی۔ ''پانڈے'' نہ صرف خان صاحب کی پسندیدہ ڈشوں کے بارے میں جانتا تھا بلکہ اسے یہ بھی علم تھا کہ صاحب کس وقت کیا پسند کرتے ہیں اور کتنی مقدار میں۔ لیاقت علی خان اپنے باورچی خانے کے تمام اخراجات اپنی جیب سے ادا کرتے تھے۔ صبح ناشتا گھر بھر کے ساتھ کرتے دوپہر کا کھانا پانڈے سائیکل پر ان کے دفتر پہنچاتا اور رات کو اگر وہ جلدی فارغ ہو جاتے تو گھر آ

کر کھانا کھا لیتے' بصورتِ دیگر مختلف تقریبات میں ہی تھوڑا بہت کھا لیا کرتے تھے۔ ہاں البتہ وہ جتنی دیر گھر رہتے پانڈے سے بار بار قہوہ طلب کرتے تھے اور وہ ان کا اس قدر مزاج آشنا تھا کہ جوں ہی کال بیل بجتی وہ قہوے سے لبالب کیتلی' چینی کی چھوٹی چھوٹی پیالیاں اور شکر دان ٹرے میں سجا کر حاضر ہو جاتا۔ خان صاحب اس ساز و سامان کو دیکھ کر ہر بار پوچھتے پانڈے تمہیں کیسے علم ہوا میں قہوہ پینا چاہتا ہوں۔ پانڈے کا ایک ہی جواب ہوتا تھا۔ ''حضور ساری زندگی آپ کی چاکری میں گزری اگر اب بھی آپ کی عادتوں کا پتہ نہ چلے تو لعنت ہو ہم پر۔'' خان لیاقت علی خان کے قتل کے بعد بھی پانڈے ان کے خاندان کے ساتھ ہی رہا بلکہ جب بیگم رعنا لیاقت علی خان سفیر بن کر ملک سے باہر گئیں تو پانڈے کو اپنے ساتھ روم لے گئیں۔

گورنر جنرل غلام محمد کے پاس سرکاری باورچی تھا جو گریڈ ۱۴ کے سرکاری اہلکار کی تنخواہ پاتا تھا۔ تاہم کھانے اور مشروبات کے تمام اخراجات گورنر جنرل اپنی ذاتی جیب سے ادا کرتے تھے البتہ کراکری گورنر جنرل ہاؤس کی ملکیت تھی جس کی پشت پر سبز رنگ کا سٹیکر لگا ہوتا تھا جس پر ''حکومت پاکستان'' درج ہوتا تھا۔ گورنر جنرل ہاؤس میں سرکاری تقریبات کے دوران آرمی کے باورچی اور بیرے منگوائے جاتے تھے جو تقریب کے بعد واپس یونٹوں میں چلے جاتے تھے۔ غلام محمد جب زیادہ بیمار ہوئے تو ان کی خوراک ''سوپ'' تک محدود ہو کر رہ گئی چنانچہ باورچی خانے میں ہر وقت مختلف دیگچیوں میں مختلف قسم کے سوپ تیار پڑے رہتے تھے جنہیں گورنر جنرل کو پلانے کی ذمہ داری ان کی سوئس سیکرٹری مس روتھ بورل کی تھی۔ وہ بڑے اہتمام سے سوپ ٹرے میں رکھتی غلام محمد کی ''وہیل چیئر'' کے نزدیک لاتی۔ اے ڈی سی فوراً گورنر جنرل کے سامنے چھوٹی سی میز رکھتا' مس بورل ٹرے اس پر جما کر غلام محمد کے سینے پر سفید براق نیپکن پھیلاتی اور پھر چینی کی نفیس چمچ کے ساتھ گورنر جنرل کو سوپ پلانے لگتی۔ فالج کے بعد گورنر جنرل سوپ پینے کی زیادہ تر ''استطاعت'' کھو چکے تھے لہٰذا سوپ کا زیادہ حصہ ان کے نیپکن پر آ گرتا اور ہر چمچ کے بعد گورنر جنرل کی سوپ میں لتھڑی باچھیں اور ٹھوڑی صاف کرنا بھی مس روتھ بورل کے فرائض میں شامل تھا جسے وہ بڑی نفاست سے نبھاتی تھی۔ گورنر جنرل کے علاوہ مس روتھ بورل' اس کی بوڑھی والدہ اور باورچی غلام محمد کے کچن سے کھانا کھاتے تھے جبکہ کسی دوسرے رکن مملکت یا گورنر جنرل ہاؤس کے ملازم کو کچن سے کوئی چیز حاصل کرنے کی سختی سے ممانعت تھی جس پر باورچی سختی سے کاربند رہتا تھا لیکن اس کے باوجود ماہ کے آخر میں جب غلام محمد بلوں کی پڑتال کرتے تو باورچی کو بلا کر ضرور

ڈانٹتے تھے۔ اس دوران ان کا موقف عموماً یہ ہوتا تھا کہ چار افراد کا جن میں ایک تقریباً معذور' دوسرا بوڑھا (مس بورل کی والدہ) ایک سمارٹ خاتون جو پیٹ بھر کر کھانے کی عادی نہیں اور ایک سوکھے سڑے باورچی کے کھانے کا بل اتنا زیادہ کیسے آ سکتا ہے؟ اس کا مطلب ہے تم' وہ باورچی کو مخاطب کرتے' ہاں تم اپنی سرکاری ذمہ داریاں پوری نہیں کر رہے اور دوسرے لوگ کچن میں گھس کر ''گورنر جنرل آف پاکستان'' کے کھانے کی اشیاء چوری کرتے رہتے ہیں۔ اس دوران باورچی لاکھ صفائیاں پیش کرتا لیکن غلام محمد فریق مخالف کی بات سننے کے قائل نہیں تھے۔ چنانچہ یوں ایک آدھ گھنٹے کی یہ یک طرفہ ڈانٹ اس حکم پر ختم ہوتی کہ باورچی آئندہ مزید احتیاط سے کام لے گا۔ اس دور کے اکثر ملازمین کا یہ بھی کہنا تھا کہ لنچ ٹائم پر گورنر جنرل کچن کا اچانک دورہ بھی کیا کرتے تھے تاکہ ان لوگوں کو موقع واردات پر ہی پکڑ لیں جو ان کے کھانے کی اشیاء چوری کر کے کھا جاتے ہیں لیکن انہیں عموماً ناکام ہی لوٹنا پڑتا تھا۔ سرکاری تقریبات کے دوران جب آرمی کے باورچی آتے اور تمام سامان خورد و نوش حکومتی فنڈ سے خریدا جاتا تھا تو گورنر جنرل اپنے باورچی کو سختی سے ہدایات کرتے تھے کہ وہ بچ جانے والا کھانا فریج میں محفوظ کر لے اور آئندہ پورا ہفتہ وہ لوگ یہی کھانا کھائیں گے۔ ان تقریبات میں گورنر جنرل کے لئے خصوصی طور پر سوپ تیار ہوتا تھا جس کی اچھی خاصی مقدار وہ محفوظ کرا لیتے تھے اور پھر دنوں تک پیتے رہتے۔

سکندر مرزا کے کچن کا سارا انتظام و انصرام بیگم ناہید مرزا کے ہاتھ میں تھا۔ وہ خود ملازمین کے ساتھ بازار جاتی تھیں۔ پوری تسلی کر کے سامان خورد و نوش خریدتی تھیں اور بعد ازاں وقفے وقفے سے کچن میں جا کر ایک ایک چیز کا حساب نوٹ بک میں درج کرتی رہتی تھیں۔ اس دور میں گورنر جنرل ہاؤس میں تقریبات بہت ہوتی تھیں لہٰذا کچن کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ایک حصہ سرکاری تقریبات کے لئے کھانے اور مشروبات کا اہتمام کرتا تھا جس کے تمام تر اخراجات گورنر جنرل ہاؤس کے فنڈز سے ادا کئے جاتے تھے جبکہ دوسرا حصہ سکندر مرزا کا ذاتی کچن کہلاتا تھا جس کے اخراجات گورنر جنرل کی تنخواہ سے منہا ہوتے تھے۔ سکندر مرزا عموماً اپنے ذاتی کچن سے ہی کھانا کھاتے تھے۔ عام طور پر ناشتے میں بیکن و جیم' دو سلائس تھوڑا سا مکھن اور کافی کا ایک مگ ہوتا تھا۔ دوپہر کا کھانا بھی وہ اپنے خاندان کے ساتھ ٹیبل پر کھاتے تھے جو تھوڑی سی ترکاری' مچھلی کے ایک آدھ پیس اور کبھی تھوڑے سے گوشت اور چپاتیوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ شام کے کھانے میں وہ ابلے ہوئے چاول' مرغی کا شوربا اور تھوڑا سا میٹھا پسند کرتے تھے جبکہ

''مشروبات'' کا سارا کنٹرول براہ راست خاتون اول کے ہاتھ میں تھا جو گورنر جنرل کے تیزی سے بڑھتے ہوئے وزن' دل کے امراض کے غلبے اور سانس کے مسائل کے باعث انہیں بڑی احتیاط سے ''مشروب'' بنا کر دیتی تھی جس پر سکندر مرزا کو عموماً شکایت رہتی تھی۔ دفتر میں ان کا کافی اور چائے کا سامان الگ تھا جب مہمان آتے تھے تو سرکاری خرچ پر ان کی تواضع کی جاتی تھی۔ جبکہ گورنر جنرل کا کپ ان کے ذاتی خرچ سے تیار کیا جاتا تھا۔ بیگم ناہید مرزا اس کا بھی بڑا حساب رکھتی تھی۔ ہو سکتا ہے بیگم صاحبہ کے یہ احکامات اس وقت سکندر مرزا کو بُری طرح کھلتے ہوں لیکن آخری عمر میں یہی پابندیاں ان کے لئے بڑی آسودگیاں لے کر آئیں کیونکہ جب انہیں معزول کر کے جلاوطن کر دیا گیا اور وہ لندن کے ایک معمولی سے فلیٹ میں مقیم ہوئے تو بیگم ناہید مرزا کو ایک ہوٹل کے عام سے ملازم کی تنخواہ میں گزارا کرتے ہوئے زیادہ مسائل کا شکار نہ ہونا پڑا۔ یہ معمولی تنخواہ پانے والا ملازم پاکستان کا سابق گورنر جنرل اور صدر سکندر مرزا تھا۔

چوہدری محمد علی بڑے صابر' سیر چشم اور درویش صفت شخص تھے' وہ اپنی وزارت عظمیٰ کے دور میں وزیراعظم ہاؤس منتقل ہونے کی بجائے اپنے نجی فلیٹ ہی میں مقیم رہے جہاں کوئی ملازم نہیں تھا۔ تین کمروں کے اس فلیٹ کا سارا کام ''خاتون اول'' کو خود اپنے ہاتھوں سے کرنا پڑتا تھا جب چودھری صاحب وزیراعظم بنے تو خاتون کو گمان گزرا کہ شاید اب ان کے خاوند کی تنخواہ بڑھ جائے گی اور وہ انہیں کام کاج کے لئے ایک ملازم رکھ دیں گے لیکن جب ''وزیراعظم'' نے انہیں یہ بتایا کہ ان کی تنخواہ میں اضافے کی بجائے کمی آ چکی ہے تو ان کے سارے ارمانوں پر اوس پڑ گئی اور وہ دوبارہ کچن میں گھس کر ''ہانڈی روٹی'' کے دھندے میں اُلجھ گئیں۔ چودھری صاحب صبح دفتر آتے وقت اپنا ٹفن ساتھ لاتے تھے جس میں عموماً ساگ' آلو کی بھجیا' کریلے گوشت یا کبھی کبھار مرغی کے چند بھنے ہوئے ٹکڑے ہوتے تھے' رہی روٹیاں تو وہ چودھری صاحب تنور سے منگوا لیتے تھے۔ لنچ کے دوران اگر کوئی مہمان وہاں موجود ہوتا تو چودھری محمد علی اپنی روایتی گرم جوشی سے اسے بھی تناول ماحضر کی دعوت دے دیتے تھے جسے عموماً لوگ ''وزیراعظم پاکستان'' کی دعوت سمجھ کر قبول کر لیتے تھے پھر تنور سے چار پانچ روٹیاں منگوائی جاتیں' ٹیبل پر ''پرائم منسٹر'' کا لنچ بکس کھولا جاتا جسے بیرہ گرم کر کے جب کھانا سرو کرنے کا وقت آتا تا خاتون اول کھانے کی ٹرے لاتی اور مرد اول ٹیبل پر پلیٹیں' چمچ' کانٹے اور پیالیاں سجاتے' کھانے کے دوران پانی ختم ہو جاتا تو وزیراعظم خود جگ بھر کر لاتے اور ایک ایک مہمان کے گلاس میں پانی انڈیلتے' سرکاری تقریبات میں کھانا

چودھری صاحب کو اچھا نہیں لگتا تھا لہٰذا اس وقت جب سارے اہلکار مرغن کھانوں کی قابوں کے پیچھے لپک رہے ہوتے یا گلاس سے گلاس ٹکرا رہے ہوتے چودھری محمد علی چائے کی چھوٹی سی پیالی ہونٹوں سے لگائے بیٹھے رہتے یا ایک پلیٹ میں تھوڑے سے خشک چاول ڈال کر آہستہ آہستہ چبا رہے ہوتے۔ وہ پیٹ بھر کر کھانا اس لئے نہیں کھاتے تھے کہ گھر میں ان کی اہلیہ میز پر کھانا لگائے ان کا انتظار کر رہی ہوتیں چنانچہ انہیں خواہ کام میں رات کے بارہ ہی کیوں نہ بج جاتے وہ کھانا گھر جا کر ہی کھاتے تھے۔

سہروردی چل پھر کر کھانے کے قائل تھے۔ جہاں لنچ کا وقت ہو گیا وہیں کھانا منگوا کر کھا لیا۔ رات ان کی معمولاً ''خفیہ سرگرمیوں'' میں گزرتی تھی لہٰذا وہاں کھانے پینے کا کسے ہوش ہوتا تھا ہاں البتہ وہ صبح ناشتا وزیراعظم ہاؤس میں ہی کرتے تھے جہاں ان کی بیٹی ان کا انتظار کر رہی ہوتی تھی۔ وہ ناشتے کی میبل ہی پر انتظامیہ کے افسروں کو ایک ایک کر کے طلب کرتے اور رات کے سارے احکامات منسوخ کر کے نئے حکم جاری کرتے۔ اس دوران وہ اگر کسی افسر سے خوش ہوتے (ایسا موقع کبھی کبھی ہی آتا تھا) تو اسے اپنے ساتھ ناشتے کی دعوت دیتے جسے وہ اپنے لئے بہت بڑا اعزاز سمجھ کر فوراً قبول کر لیتا تھا۔ اس دور میں وزیراعظم ہاؤس کا کچن کچھ کچھ بیرل تھا' سٹاف کو بھی وہاں سے کھانا اور مشروبات مل جاتے تھے لیکن ایک خاص حد تک کیونکہ اس کے بعد بل کی منظوری وزیراعظم سے لینا پڑتی تھی جس کے امکانات بہت کم ہوتے تھے۔

فیروز خان نون کا اپنا ذاتی باورچی تھا جو کراچی میں ان کے ذاتی گھر میں رہتا تھا۔ دن میں دو مرتبہ وزیراعظم اور ان کے سارے عملے کا کھانا دفتر پہنچانا اس کی ذمہ داری ہوتی تھی جسے وہ وزارت عظمٰی کے آخری وقت تک نبھاتا رہا۔ اس سارے کچن کا خرچ وزیراعظم اپنے ذاتی اکاؤنٹ سے ادا کرتے تھے اور اس ضمن میں سرکاری خزانے سے ایک پیسہ وصول نہیں کرتے تھے۔ ان کے سیکرٹری الطاف گوہر نے ایک بار جب ان کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرائی تو وہ ہنس کر بولے۔ ''بالشک روٹی پانی کھلانے پلانے سے رزق کم نہیں ہوتا' بڑھتا ہے۔ میری جاگیریں جتنا اناج پیدا کرتی ہیں وہ میں کہاں لے جاؤں گا۔ اچھا ہے کچھ حصہ آپ لوگوں کے کام بھی آ جائے۔'' ان کے دورِ اقتدار میں ہونے والی نوے فیصد تقریبات کے اخراجات بھی انہوں نے خود ہی برداشت کئے۔ جبکہ مہینے میں ایک یا دو بار سارے سٹاف کی دعوت کرنا بھی ان کی زندگی کا معمول تھا۔ جس میں وہ پرتکلف کھانے کے دوران سب کو خوب لطیفے سناتے' ان کے زیادہ تر

لطیفے جاگیردار طبقے کی حماقتوں اور سیاستدانوں کی بے وقوفیوں کے گرد گھومتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کا ایک عجیب شوق تھا۔ وہ نئے شادی شدہ جوڑوں کو کھانے کی دعوت دیتے تھے چنانچہ سرکاری حلقوں میں جتنی شادیاں ان کے دور میں ہوئیں وہ شاید ہی کسی دوسرے عہد میں ہوئی ہوں۔

ایوب خان کا عہد سادگی کا دور تھا۔ صدر نسبتاً چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے جہاں ان کے تمام تر اخراجات ذاتی اکاؤنٹ سے ادا کئے جاتے تھے۔ گھر کا سارا انتظام و انصرام بیگم ایوب کے ہاتھ میں تھا' وہ کچن کو بھی خود ہی چلاتی تھیں۔ سودا سلف ذاتی باورچی اور ایک آدھ دوسرا ملازم لاتا تھا۔ کھانے کے کمرے کے لئے صرف ایک ویٹر تھا جو لنچ ڈنر کے دوران کھانا سرو کرتا اور باقی اوقات میں ایوب خاندان کے ذاتی مہمانوں کی تواضع کرتا۔ سرکاری تقریبات کا شعبہ گھریلو کچن سے بالکل الگ تھا اور اسے براہ راست صدر کا سیکرٹری چلاتا تھا۔ بجٹ سے رقم کی ڈیمانڈ کرنا' ملازمین رکھنا' مینو تیار کرنا اور تقریب کے دوران آرائش و زیبائش کا انتظام اسی سیکرٹری کی ذمہ داری تھی جس میں صدر حصہ نہیں لیتے تھے۔ دفتر میں صدر کے ذاتی اور سرکاری مہمانوں کی تواضع سرکاری رقم سے کی جاتی تھی ہاں البتہ صدر صبح اور شام کا کھانا اپنے گھر کھاتے تھے جس کا اہتمام ان کی فیملی کرتی تھی۔

صوبائی حکومتوں کی تاریخ میں عبدالرب نشتر اور ملک امیر محمد خان دو ایسے گورنر گزرے ہیں جن کے دور میں گورنر ہاؤس پنجاب کا کچن عملاً بند رہا۔ نشتر تو سرے سے ایک سرکاری پیسہ بھی اپنے اور اپنے خاندان پر خرچ کرنے کے روادار نہیں تھے چنانچہ سرکاری خدمت کے دوران وہ جو چائے یا کافی پیتے تھے شام کو اس کا بل ادا کر دیتے تھے۔ رہے ملک امیر محمد خان تو انہوں نے ایک حکم کے تحت سرکاری کچن بند کرا دیا اور عملے کو دوسرے شعبہ جات میں بھیج دیا تھا۔ ان کا کھانا ان کا ذاتی ملازم بناتا تھا جسے وہ کالا باغ سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ ذاتی مہمانوں کے لئے نواب صاحب اپنی جیب سے بازار سے کھانا منگواتے تھے جبکہ گورنر ہاؤس کے چائے پانی کا سارا خرچ وہ خود برداشت کرتے تھے۔ رہا ان کا عملہ تو وہ اپنا کھانا روزانہ گھر سے لاتا تھا۔

یحییٰ خان کے دور میں ایوانِ صدر کے کچن کے اخراجات یکدم بڑھ گئے کیونکہ یہ وہ دور تھا جب ''مشروباتِ مغرب'' کو کچن کا باقاعدہ حصہ بنا دیا گیا تھا۔ ڈائننگ ہال میں ایک خوبصورت بار بنایا گیا تھا جس میں صبح' دوپہر' شام اور رات کے مختلف قسم کے مشروبات کی درجنوں بوتلیں رکھوائی گئیں۔ جن کے بارے میں سختی سے آرڈر تھا کہ یہ ختم نہیں ہونی چاہئیں اگر کسی بوتل میں

گلاس بھر مشروب ہے تو اسے فوراً ہٹا کر اس کی جگہ بھری ہوئی بوتل رکھ دی جاتی۔ ان مشروبات کو ''سرو'' کرنے کے لئے پڑھے لکھے سمارٹ باورچی اور خوبصورت بیرے رکھے گئے۔ جو سارا دن بیرس کے نازک گلاسوں میں معزز مہمانوں کی تواضع کرتے رہتے۔ اس دور میں پہلی مرتبہ ایوان صدر کے مینو میں چائنیز' یورپین اور دیسی کھانے شامل کئے گئے جو بغیر کسی پیشگی نوٹس کے فوراً پیش کئے جا سکتے تھے۔ اسی دور میں کچن کے سٹاف میں بھی اضافہ کر دیا گیا۔ کچن کے انتظامات چلانے کے لئے ایک چھوٹی سی باڈی بنائی گئی جو تین افراد پر مشتمل تھی۔ تمام مالی اور انتظامی معاملات کی رکھوالی ان کی ذمہ داری تھی۔ ایک پرچیزنگ کمیٹی تھی جو مارکیٹ سے مختلف اشیاء خریدتی تھی جبکہ بیروں کی وردیوں' چھٹیوں اور ڈیوٹیوں کا حساب رکھنے کے لئے الگ سٹاف رکھا تھا۔

گو یحیٰی خان کے دور میں ایوان صدر کا کچن بڑی حد تک شاہی خاندان کا باورچی خانہ بن گیا تھا لیکن اسے جو عروج ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں حاصل ہوا وہ اس سے پہلے حاصل ہوا اور نہ ہی بعد ازاں' اولاً ایوان صدر اور ثانیاً وزیراعظم ہاؤس میں دنیا کے تین اعلیٰ تربیت یافتہ شیف رکھے گئے جن کے گریڈ اور سہولتیں وفاقی حکومت کے ایڈیشنل سیکرٹریوں کے برابر تھیں۔ ان میں سے ایک دیسی کھانوں' دوسرا چائنیز کھانوں اور تیسرا ولائتی کھانوں کا ماہر تھا۔ ہر شیف کے پاس ۱۲ بیرے تھے جو مخصوص کھانوں کو مخصوص روایتی انداز سے پیش کرنے میں ماہر تھے۔ ہر نشست پر سارے کھانے پیش کئے جاتے تھے۔ وزیراعظم ان میں سے جو پسند کرتے ٹھیک' باقی کھانے بعد ازاں سٹاف آپس میں تقسیم کر لیتا تھا۔ جب وزیراعظم کھانے کی میز پر آ کر بیٹھتے تھے تو ایک کلرک ہاتھ میں کاپی پنسل اُٹھا کر کھڑا ہو جاتا اور وزیراعظم کھانے کے دوران اسے ایسی ڈشوں کا نام لکھواتے رہتے جو وہ اگلے کھانے کے دوران کھانا چاہتے ہیں۔ علاوہ ازیں کلرک ان ڈشوں کے نام بھی نوٹ کرتا رہتا جنہیں اس وقت وزیراعظم نے ایک سے زیادہ بار شرف قبولیت بخشا۔ بعد ازاں یہ لسٹ شیف حضرات کو دے دی جاتی جس سے وہ کھانوں کے نام پڑھ کر انہیں آئندہ کے مینو میں مستقل طور پر شامل کر لیتے تھے۔ بھٹو صاحب کھانے کے سلسلے میں اس قدر ''صاحب ذوق'' تھے کہ انہیں اگر کسی تقریب میں کوئی کھانا پسند آ جاتا تو وہ میزبان سے ''خانساماں'' سے ملنے کی خواہش ظاہر کرتے جو یقیناً فوراً پوری کر دی جاتی' بھٹو صاحب اس کے ہنر کی کھل کر تعریف کرتے اور آخر میں میزبان سے اسے چندروز کے لئے ''مانگ'' لیتے۔ وزیراعظم ہاؤس آ کر وہ خانساماں اس وقت تک اپنے فن کا مظاہرہ کرتا رہتا جب تک بھٹو صاحب کا جی اس ڈش سے نہ

اوب جاتا۔ بھٹو صاحب اپنے مہمانوں کو بھی منفرد اور خوش ذائقہ کھانے کھلانے کے شوقین تھے۔ غیر ملکی مہمانوں کو تو وہ خصوصی طور پر بلا کر نئے نئے کھانے کھلاتے تھے۔ اس دور میں زیادہ تر اجلاس کھانے کی میزوں پر ہوتے یا اجلاس کا اختتام کھانے پر ہوتا تھا۔ اس دور میں کابینہ کے ارکان اور اعلیٰ سول اور فوجی حکام کا خیال تھا کہ جب وزیراعظم کسی کو خصوصی طور پر رات کو کھانے پر بلائیں تو اس کا مطلب ہے وہ اس سے کسی خاص مسئلے پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں لہٰذا سازشی حضرات ہر گزری شب کا ''شیڈول'' منگوا کر وزیراعظم کے مہمانوں کے نام پڑھتے اور پھر گفتگو کا اندازہ لگاتے۔ بھٹو سے جنرل ضیاء الحق اور ان کے ساتھی کور کمانڈرز کی آخری ملاقات بھی کھانے کی میز پر ہوئی تھی جس میں ناکامی کے بعد ملک میں مارشل لاء لگ گیا۔

ذوالفقار علی بھٹو کھانے اور کھلانے کے کس قدر شوقین تھے اس کا اندازہ فقط ایک واقعے سے لگایا جا سکتا ہے۔ اپنے دورہ امریکہ کے دوران بھٹو نے ہنری کسنجر کو پاکستانی سفارتخانے میں رات کے کھانے کی دعوت دی جسے امریکی سیکرٹری خارجہ نے قبول کر لیا۔ دن طے ہو گیا تو بھٹو نے سارے عملے کو جمع کر کے معزز مہمان کے لئے مینو پر مشاورت شروع کر دی۔ کسی نے کہا کسنجر چائنیز کھانے بہت پسند کرتے ہیں۔ کسی نے کہا وہ ایک بار مجھ سے سندھ کی روایتی ڈشوں کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ کسی نے کہا ایک سفارتی تقریب میں انہوں نے فرائی مچھلی دوبارلی تھی۔ ایک صاحب نے کہا وہ جب بھی کسی عرب ملک جاتے ہیں تو ہرن کا گوشت خصوصی فرمائش پر طلب کرتے ہیں' وغیرہ وغیرہ۔ لیکن بھٹو نے ساری تجاویز مسترد کر دیں کیونکہ وہ اپنے معزز مہمان کو ایسا کھانا کھلانا چاہتے تھے جو انہوں نے اس سے قبل کبھی نہ چکھا ہو' بہرحال دو اڑھائی گھنٹے کی بحث کے بعد کسی طرف سے ''بھنے ہوئے بٹیر'' کی تجویز آئی۔ بھٹو نے سنا تو چونک کر تجویز کنندہ کو دیکھا اور گردن ہلا کر بولے ''یس ہیئر از دی آئٹم'' بھٹو کی منظوری ملتے ہی سارا عملہ کالے بٹیروں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ سارے واشنگٹن کی ٹولنٹن مارکیٹیں کھنگال ڈالی گئیں' دوسرے شہروں میں فون کئے گئے۔ بڑے ہوٹلوں کی انتظامیہ سے پوچھا گیا لیکن پورے امریکہ میں کہیں کالے بٹیر دستیاب نہ ہوئے لہٰذا رات کو مجبوراً کراچی سے بٹیر منگوانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اگلے روز وزیراعظم کا خصوصی طیارہ پاکستان آیا اور یہاں سے دو ہزار کالے بٹیر لے کر واپس چلا گیا۔ لیکن بٹیر آئے تو ایک اور مسئلہ کھڑا ہو گیا وہ تھا انہیں پکانے کے لئے کسی ماہر کی ضرورت جو امریکہ میں دستیاب نہیں تھا۔ اس مسئلے پر ایک اور اعلیٰ سطحی اجلاس ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ فوری طور پر پاکستان سے

''ماہر کک'' بھی منگوائے جائیں اور طیارہ ایک بار پھر واشنگٹن سے کراچی روانہ ہو گیا۔ جہاں وزارت خارجہ کے اعلیٰ حکام نے حکم ملتے ہی بٹیر بھوننے کے درجن بھر ماہر باورچی اکٹھے کر لئے تھے۔ قصہ مختصر دیسی خانساموں نے دیسی مصالحہ جات سے رات دن کی مشقت سے بٹیر بھونے جنہیں دیدہ زیب قابوں میں سجا کر ٹیبل پر رکھ دیا گیا۔ معزز مہمان کو پیش کئے جانے والے مینو کارڈ پر باوقار انگریزی میں بٹیروں کے حسب نسب' ان کے پکانے کے طریقے اور ذائقے پر ایک نوٹ لکھا گیا اور اسے نمایاں کرنے کے لئے اس کے گرد سنہری روشنائی سے بارڈر لگایا گیا۔ شام کو جب معزز مہمان کھانے پر تشریف لائے تو بھٹو صاحب نے خود مینو پیش کیا جسے کسنجر نے بغیر دیکھے ایک طرف رکھ دیا اور فلسطین میں کروٹ لیتے حالات پر محتاط انداز میں گفتگو شروع کر دی۔ اس دوران غیر محسوس طریقے سے بٹیروں کی قاب ان کے سامنے کر دی گئی لیکن معزز مہمان نے اپنی قریب ترین ڈش سے تھوڑا سا کھانا لیا اور چند نوالے لے کر ہاتھ کھینچ لیا۔ آدھ گھنٹے کی اس ملاقات کے آخر میں کسنجر کا سیکرٹری ہال میں داخل ہوا اور بڑے احترام سے انہیں ایک کارڈ پیش کیا جس پر ان کا اگلا پروگرام درج تھا۔ ''اتنے بجے سے اتنے بجے تک...... پر فلاں سے ملاقات۔'' کسنجر نے گھڑی دیکھی اور اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''ویل مسٹر پرائم منسٹر وی ویل میٹ سون'' ہوا میں ہاتھ لہرا کر سب کے سلام کا جواب دیا اور رخصت ہو گئے اور پیچھے چند مایوس چہرے اور سینکڑوں بھنے ہوئے بٹیر رہ گئے جنہیں اپنے وقت کے سب سے بڑے سفارتی نمائندے کا لمس تک نصیب نہ ہوا۔

جنرل ضیاء الحق کی خوراک بہت سادہ تھی۔ ملک پر قابض ہونے کے بڑے عرصے تک وہ آرمی چیف ہاؤس ہی میں رہے جہاں ان کے پرانے خانسامے ان کا کھانا تیار کرتے تھے اور وہ گھر بھر کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ صبح ناشتے پر سب سے ملاقات ہوتی تھی۔ دوپہر کا کھانا وہ زیادہ تر گھر پر کھاتے تھے۔ اگر کبھی کسی مصروفیت کے باعث بروقت گھر نہ پہنچ سکتے تو فون کر کے گھر والوں کو کھانے پر انتظار نہ کرنے کی ہدایت کر دیتے تھے۔ عموماً رات کے کھانے کے بعد سویٹ ڈش لیتے تھے جس کے بارے میں ان کا خانساماں جانتا تھا لہٰذا وہ بدل بدل کر ڈشیں بناتا رہتا تھا۔ جب وہ آرمی ہاؤس سے ایوانِ صدر منتقل ہوئے تو بھی ان کی خوراک اسی طرح سادہ رہی تاہم انہوں نے ایوان صدر کا کچن تقریبات اور مہمانوں کے لئے وقف کر دیا۔ تقریباً روز کوئی نہ کوئی چھوٹی موٹی تقریب ہوتی جس میں وہ مہمانوں کو کھانا ضرور کھلاتے۔ جنرل ضیاء کے دور میں آرمی چیف ہاؤس' وزیراعظم ہاؤس اور ایوانِ صدر کے بار بند کر دیئے گئے اور اس کے سارے عملے کو

چھٹی کرا دی گئی۔

ذوالفقار علی بھٹو کے برعکس محترمہ بے نظیر بھٹو کا ڈائننگ ٹیبل ایک ''کنجوس خاتون'' کے دسترخوان کا منظر پیش کرتا تھا۔ بعض طبی مسائل کے باعث بینظیر مصالحہ دار چٹ پٹی چیزیں نہیں کھا سکتی تھیں لہٰذا ان کا دسترخوان اُبلی سبزیوں' اُبلے چاولوں' شوربے اور جوسوں تک محدود تھا۔ ان کے برعکس آصف علی زرداری خوش خوراک شخص تھے لہٰذا اکثر ڈائننگ ٹیبل پر وزیراعظم اور ''مرد اوّل'' میں ہلکی پھلکی جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ بعض لوگوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ آصف علی زرداری وزیراعظم ہاؤس کی بجائے کسی ریسٹورنٹ میں کھانا کھانا زیادہ پسند کرتے تھے۔ اگر کبھی کچھ لوگ کھانے پر مدعو ہوتے تو کھانا میریٹ ہوٹل سے منگوایا جاتا تھا۔ بے نظیر بھٹو ایک ہی چیز کو وقفے وقفے سے کھانے کی عادی تھیں اسی لئے انہوں نے جون ۹۶ء میں اپنا ایک شیف نوکری سے بے دخل کر دیا جسے بڑی منتوں کے بعد بحال کر کے او ایس ڈی لگا دیا گیا۔ اس شیف پر الزام تھا کہ اس کی موجودگی میں فلپائنی آیا کچن میں رکھی ہوئی وزیراعظم کی چاٹ کھا گئی۔ ۱۹ گریڈ کا یہ شیف حکومت کی تبدیلی تک سٹیبلشمنٹ ڈویژن میں او ایس ڈی رہا۔

میاں محمد نواز شریف کشمیری تپاک اور پنجاب کی روایتی مہمان نوازی کا مجسمہ ہیں۔ پنجاب کی وزارت اعلیٰ اور بعدازاں وزارت عظمیٰ کے دور میں انہوں نے زندگی کے مختلف شعبہ جات سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو جس قدر دعوتیں دیں وہ وزیراعظم ہاؤس کی تاریخ میں کسی وزیراعظم نے نہیں دیں۔ اپنے گذشتہ دور کے بارے میں میاں نواز شریف کا دعویٰ ہے کہ وہ کھانے کے سارے بل اپنی جیب سے ادا کرتے تھے اور اس دور میں بھی وہ اس روایت کو نبھائیں گے لیکن ان کا یہ دعویٰ صرف کاغذوں تک محدود رہا ان کے دور میں وزیراعظم ہاؤس کا بجٹ ۱۷ کروڑ تھا۔

قائداعظم سے لے کر میاں نواز شریف تک ہم اگر ایوانِ اقتدار کے دسترخوانوں کا جائزہ لیں تو ہم انہیں بڑی آسانی سے دو ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ یحییٰ خان سے پہلے اور یحییٰ خان کے بعد اور ہم بڑی غیر جانبداری سے یہ اندازہ بھی لگا سکتے ہیں کہ پہلے دور کے زیادہ تر حکمران اپنے کھانے کے اخراجات اپنی جیب سے دیتے تھے۔ وہ لوگ بے ایمان تھے درست۔ وہ سازشی اور اقتدار کے بھوکے بھی تھے' یہ بھی درست۔ لیکن وہ کرپٹ نہیں تھے۔ وہ سرکاری خزانے کے ذاتی استعمال کے مجرم نہیں تھے جبکہ دوسرے دور کے حکمران نہ صرف اپنے ذاتی اخراجات

سرکاری خزانے سے پورے کرتے تھے بلکہ انہوں نے عوام کی رگوں سے کشید ہونے والی دولت کو ذاتی آرام' آسائش اور عیاشی پر صرف کیا۔

آخر میں اپنی تاریخ سے صرف دو سوال کرنے کی جسارت کروں گا۔ حکمران عوام کے رکھوالے ہوتے ہیں یا عوام حکمرانوں کی آیائیں؟ اور دوسرا وہ رکھوالا جو خود ہی اپنے گھر کو لوٹنے لگے اس سے بڑا چور دنیا میں کوئی اور ہوتا ہے؟

اور لوگو! جس ملک میں گونگے بہرے لوگ رہتے ہوں وہاں کے وزیراعظم ہاؤسوں میں ہر سال دس پندرہ کروڑ روپے چولہوں میں پھونک دیئے جائیں تو کوئی بڑی بات نہیں اور وہاں کا وزیراعظم دس لاکھ روپے کے بٹیر بھون کو مہمانوں کے حضور پیش کردے تو بھی کوئی بڑی بات نہیں اور یہ بھی تو کوئی بڑی بات نہیں کہ اس غریب ملک کو قائداعظم کے بعد کوئی غریب حکمران نہیں ملا جو افلاس اور بیماری کے ہاتھوں دم توڑ دے لیکن عوامی خزانے کو چند سو روپوں کے نقصان سے بچا لے۔

● ● ●

پروفیسر احمد رفیق اختر

پروفیسر احمد رفیق آج لوگوں کے لیے اجنبی نہیں ہیں' اس وقت پاکستان اور بیرونِ ملک ان کے لاکھوں ''مرید'' موجود ہیں' میری ان سے پہلی ملاقات ۱۹۹۳ء میں گوجر خان میں ہوئی تھی' اس ملاقات کا محرک جناب ممتاز مفتی تھے' مفتی صاحب پروفیسر صاحب سے بہت متاثر تھے' وہ اکثر ان کا تذکرہ کرتے رہتے تھے' میں نے ایک دن ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا تو مفتی صاحب نے مجھے ان کا ٹیلی فون نمبر دے دیا' میں نے پروفیسر صاحب سے ٹیلی فون پر بات کی' انہوں نے مجھے گوجر خان بلا لیا' زیرِ نظر مضمون اس پہلی ملاقات کا احوال ہے' میں نے یہ مضمون ۱۹۹۵ء میں لکھا تھا' یہ مضمون میڈیا میں پروفیسر صاحب کا پہلا تعارف ثابت ہوا۔

آج پروفیسر صاحب کے پرستاروں کی تعداد گننا ناممکن ہے۔ ان بے شمار پرستاروں میں ان کا ایک پرستار میں بھی ہوں' ان سے میری محبت اب ۱۳ویں برس میں داخل ہو گئی ہے' کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے وہ پروفیسر صاحب جو کبھی صرف ہمارے ہوتے تھے وہ اب پوری دنیا کے پروفیسر صاحب ہو چکے ہیں۔ وہ سب کے پروفیسر صاحب بن چکے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی خوشی ہوتی ہے اب ان سے فیض یاب ہونے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا ہے۔

......

اکیسویں صدی پروفیسر احمد رفیق کی صدی ہے۔

دو برس پہلے گوجر خان میں ان کے گھر داخل ہوا تو ایک کلین شیو شخص کو پلنگ پر آلتی پالتی مارے بیٹھے دیکھا۔ ہاتھ میں سگریٹ سلگ رہا تھا۔ ایش ٹرے ٹوٹوں سے لبالب بھری تھی۔ سامنے ڈش پر سی این این کا کوئی پروگرام چل رہا تھا اور ''کلین شیو'' اس میں بُری طرح منہمک تھا۔ میں بھی بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے لگا۔ پروگرام امریکہ میں ہم جنس پرستی پر تھا' وقفہ ہوا تو ''کلین شیو'' نے میری طرف دیکھ کر ریموٹ کنٹرول کا بٹن دبایا اور کہا۔ ''آپ کو معلوم ہے ہم جنس پرستی کا آغاز کہاں سے ہوا؟'' میں نے بے وقوفوں کی طرح نفی میں سر ہلا دیا۔ ''ہوں'' کلین شیو نے ہنکارا بھرا' لمبا سا کش لیا اور کہا۔ سپارٹا میں ایک بار ۔ اور پھر دنیا کے قدیم اور جدید جنسی رجحانات پر ایک طویل لیکچر شروع ہو گیا۔ درمیان میں کلین شیو پانی پینے یا سگریٹ سلگانے کے لئے رکتا اور خاموشی کے چند لمحات کے بعد دوبارہ شروع ہو جاتا۔ ایک گھنٹے بعد جب اس کی طرف سے خاموشی کا وقفہ طویل ہوا تو میں اس کے علم' دانائی' روانی اور خوبصورت انگریزی کے اثر میں بھیگ چکا تھا۔ کلین شیو نے سگریٹ کا آخری کش لیا۔ فلٹر تک جلے ٹوٹے کو ایش ٹرے میں مسلا اور مجھ سے پوچھا۔ ''جی حکم کیجئے۔'' میں نے عرض کیا۔ ''پروفیسر احمد رفیق سے ملاقات کا شوق یہاں کھینچ لایا۔ اگر ہیں تو ملا دیں۔'' کلین شیو نے قہقہہ لگایا اور ذرا سا رک کر جواب دیا۔ ''جی مل لیں مجھے ہی احمد رفیق کہتے ہیں۔'' یہ سن کر مجھے شدید دھچکا لگا۔ میں وہاں کسی ''بزرگ'' سے ملنے گیا تھا۔ لیکن وہاں تو کوئی اور ہی شخص بیٹھا تھا' ٹھیک ہے وہ صاحب علم ہے' انگریزی بہت خوبصورت بولتا ہے' لہجے میں مٹھاس اور اثر کی مقناطیسیت ہے' گرم جوش ہے' لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ اسے ''بزرگ'' مان لیا

جائے۔ میں اسی مایوسی کے عالم میں اٹھ کر چل پڑا تو چائے آ گئی۔ مجبوراً مجھے بیٹھنا پڑ گیا اور آج سوچتا ہوں اگر عین موقع پر چائے نہ آتی تو میں زندگی کے حیرت انگیز تجربے سے محروم رہ جاتا میں پروفیسر احمد رفیق سے محروم رہ جاتا۔

پروفیسر احمد رفیق میں ''بزرگوں'' والی کوئی بات نہیں' چہرے پر گھنی داڑھی نہ آنکھوں میں سرمے کی دم دار لکیر' تن پر سبز چوغا' نہ ہاتھ میں عصا' بات بات پر استغفر اللہ کی ولدوز چیخ نہ اللہ ہو کا جگر پاش نعرہ' اگربتی کی خوشبو نہ گلاب کا عطر' فرش پر قالین نہ دیواروں کے ساتھ گاؤ تکیوں کی باڑ' ادب و آداب نہ حاضرین میں گناہ کا تاسف وہاں بزرگی کی کوئی نشانی نہیں' اگر ہے تو صرف بات بے بات قہقہہ لگاتا ایک تروتازہ چہرہ' ۵۵ برس کا چٹکلے چھوڑتا شوخ نوجوان' کوئی آ جائے تو آ جائے' چائے ہوگی تو آ جائے گی' نہیں ہوگی تو خوبصورت خیال کو باتوں میں بھگو بھگو کر کھاتے رہیں' کھاتے رہیں جب تھک جائیں تو اٹھ کر چلے جائیں۔ وہاں آنے پر پریشانی ہوگی نہ جانے پر خوشی' آپ برسوں آتے جاتے رہیں اسے کبھی ''بزرگ'' نہیں پائیں گے۔ اس پر کبھی ''حال'' طاری نہیں ہوگا۔ کبھی ''ذکر'' کا کرب نہیں ہوگا' کبھی نیکی کا تفاخر نہیں ملے گا۔ اگر ملے گی تو انتہائی ذہانت ملے گی' بے انتہا علم ملے گا' لامحدود اپنائیت اور اس اُفق سے اس اُفق تک پھیلی محبت ملے گی۔

پروفیسر احمد رفیق کا کشف' کشف نہیں فراست ہے' فراست کشف کی ریفائن قسم ہے جس میں ''سالک'' کو یک سوئی کی ضرورت نہیں پڑتی' کائنات خود ہی سمٹ کر ہتھیلی پر رائی بن جاتی ہے لہٰذا جوں ہی کسی شخص کی آواز پروفیسر کے کانوں سے ٹکراتی ہے ذات کے ساتوں پردے اُٹھ جاتے ہیں۔ ظاہری اور باطنی کیفیات کھل کر سامنے آ جاتی ہیں جیسے روشنی کا وجود سات رنگوں میں تقسیم ہو جائے اور مخاطب اُٹھتے وقت یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ وہ شخص ہے جو مجھ کو مجھ سے زیادہ جانتا ہے لیکن جب پروفیسر سے پوچھا جائے تو وہ مسکرا کر کہتا ہے یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں صرف ریاضت ہے۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے علم اسماء عنایت کیا۔ ''یہ علم اسماء کیا ہے؟'' وہ کہتا ہے یہ علم ایک ہزار برس پہلے حضرت محی الدین عربیؒ نے دریافت کیا۔ ان کے بعد کسی صوفی نے اس پر ہاتھ نہیں ڈالا کیونکہ اس میں قرآن فہمی اور انسانی ذات کی باریکیوں پر عبور کے ساتھ ساتھ تمام جدید علوم سے واقفیت بھی ضروری ہے اور صوفیاء کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا تھا لہٰذا وہ سیدھے سادھے کشف سے کام چلا لیتے تھے' لیکن میری مشکل پسند طبیعت مجھے اس طرف لے آئی۔ خدا نے

رہنمائی کی اور یہ علم میری ذات کا حصہ بن گیا۔ مزید وضاحت مانگی جائے تو وہ کہتا ہے قرآن مجید میں ۱۴ مقطعات ہیں مثلاً **ص' قاف' طٰہٰ' حم' یٰسین' الم' الر' طسم' عسق' المر' المص' کھیٰعص**۔ یہ ۱۴ مقطعات قدرت کی ۱۴ ہارڈ ڈسکیں ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے پوری نسلِ انسانی کے احوال درج کر دیئے ہیں۔ بس جو اللہ تعالیٰ کے کمپیوٹر کو چلانا سیکھ جائے اس پر قدرت کے اسرار منکشف ہو جاتے ہیں۔ پوچھا جائے۔ ''آپ قدرت کا یہ کمپیوٹر کیسے چلاتے ہیں؟'' تو وہ کہتا ہے کہ جب کوئی شخص ملتا ہے تو میں اپنے حواس کا مشاہدہ صفر پر لے آتا ہوں۔ دماغ میں روشنی کی پٹی سی نظر آتی ہے جس میں سوال کا جواب ہوتا ہے۔ پوچھا جائے' کبھی آپ کو قدرت کے کمپیوٹر نے غلط اطلاع بھی دی تو وہ ہنس کر کہتا ہے نہیں' کیونکہ جب خدا کسی شخص کی ذات کا حصہ بنتا ہے تو وہ اس کے ہاتھ پاؤں اور زبان بن جاتا ہے اور خدا کی زبان سے غلط اطلاع نشر نہیں ہو سکتی۔ میں نے پروفیسر سے دس برس کی رفاقت میں قدرت کے اس کمپیوٹر کے کئی مظاہر دیکھے جن کا ذکر ممکن نہیں' کیونکہ اس سے مضمون کے افسانوی بن جانے کا خدشہ ہے۔

پروفیسر نماز' روزے اور حج کی تلقین نہیں کرتا۔ پوچھا جائے تو وہ کہتا ہے' تصورِ خدا کے بغیر نماز' نماز نہیں ایکسرسائز ہوتی ہے۔ مذہب میں اس قدر بگاڑ آ چکا ہے کہ لوگوں کے خدا اور اصل خدا میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پوچھا جائے اصل خدا کی ہیئت کیا ہے؟ وہ کہتا ہے خدا کی ہیئت دکھائی نہیں جا سکتی صرف سمجھائی جا سکتی ہے' کہا جائے سمجھا ہی دیں تو وہ کہتا ہے۔ ''جہاں خدا ہوتا ہے وہاں خوف اور دکھ نہیں ہوتا اور مسجدوں سے باہر نکلنے والوں میں سے کتنے ہیں جن کی ذات میں خوف اور دکھ نہیں؟'' پوچھا جائے آپ کون ہیں؟ وہ کہتا ہے میں خدا کا ایجنٹ ہوں۔ لوگوں کو جھوٹے خداؤں سے الگ کر کے اصل خدا کی پہچان کراتا ہوں پھر انہیں خدا کے راستے پر ڈال کر خود واپس گھر آ جاتا ہوں۔ وہ کامیاب ہو جائیں تو ان کا نصیب' نہ ہوں تو خدا کی مرضی' میری ڈیوٹی ختم۔ پوچھا جائے اور نماز؟ تو وہ کہتا ہے جب درخت پر پھل تیار ہو جائے تو ٹہنی خود ہی جھک جاتی ہے۔ خدا ایک بار انسان کی ذات کا حصہ بن جائے تو پیشانی سجدے کے بغیر رہ ہی نہیں سکتی۔ میرا کام انسان کو خدا کے سامنے کھڑا کرنا ہے' ان کے درمیان آشنائی کا ٹوٹا رشتہ بحال کرنا ہے۔ انہیں سجدوں پر مجبور کرنا نہیں' کیونکہ یہ اس کا کام ہے جس نے پیشانیاں بنائیں اور سجدے بھی' جس کا کام اسی کو ساجھے۔

پروفیسر تصوف کے سارے مروجہ نظام کو ہی یک جنبشِ قلم مسترد کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے

نشہ انسان کا شروع سے مسئلہ رہا ہے۔ انسان سرمست ہونا چاہتا ہے۔ وہ دنیا کے دکھوں سے بھاگنا چاہتا ہے اور نشہ وہ عمل ہے جو انسان کے یہ دونوں ازلی مسائل حل کر دیتا ہے۔ یہ الگ بات ہے جب کسی کا نشہ ٹوٹتا ہے تو زندگی کے دکھ پہاڑ بن کر اس کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔ نشہ کیسے شروع ہوا؟ یہ سوال آج کے انسان کو اکثر سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ میں نے اس فیچر میں اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی۔

......

ہاروت اور ماروت نے شراب کو حقیر چیز جان کر منہ سے لگا لیا تو بابل کی زہرہ دیوی نے قہقہہ لگا کر کہا۔ نادان فرشتو! تم پر زمین کا جادو چل چکا ہے۔ اب تم قتل بھی کرو گے بدکاری بھی کرو گے اور مجھے اسم اعظم بھی سکھاؤ گے...... اور فرشتوں جن کے ہونٹوں پر شراب کی سرخی اور زبان پر ترشی کا احساس ابھی گہرا نہیں ہوا تھا اور معدوں کے اندر تڑپنے والی حدت نسوں تک نہیں پہنچی تھی' انہوں نے نفی میں گردن ہلا کر کہا۔ ہم فرشتے ہیں اور دنیا کی حقیر چیزیں فرشتوں کے ایمان کی فصیلیں عبور نہیں کیا کرتیں۔ لیکن جب نشے نے شعور کے دروازے پر دستک دی تو زبان نے سینہ قدرت کے سارے راز فاش کر دیئے اور جسم غلاظتوں کے جزو بن گئے۔ ہوش آنے پر دونوں فرشتے چاہِ بابل میں اُلٹے لٹکے تھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لئے سزا تھی اور روزِ محشر تک انہوں نے یہ سزا بھگتنا تھی' کیونکہ یہ شراب نوشی کی سزا تھی جسے منہ لگانے کے بعد سینوں کے سارے راز اُبل پڑتے ہیں اور اخلاقیات کی ساری بندشیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ انسان اشرف المخلوقات کی بجائے صرف خطا بن کر رہ جاتا ہے۔ یہی تاریخ انسانی کا متفقہ نتیجہ ہے۔

خود فراموشی کے لئے شراب دنیا کا قدیم ترین ذریعہ ہے۔ تمام مقدس کتابوں اور تمام تہذیبی آثار میں شراب نوشی کے حوالے ملتے ہیں۔ مصر' روم' یونان اور ہندوستان کی تہذیبوں میں اس کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ فراعنہ مصر کے احرام کی کھدائی کی گئی تو پرانے زیورات' صحائف' ملبوسات اور جنگی ساز و سامان کے ساتھ ساتھ بڑی تعداد میں آلاتِ مے کشی بھی برآمد ہوئے۔ اہلِ روم انگور کی شراب کشید کر کے اس میں سرخ رنگ ملاتے تھے اور پھر پورے شہر میں مے نوشی کی اجتماعی تقریبات ہوتیں۔ جب نشے کی دیوی اہلِ شہر کے بالوں میں نرم اُنگلیاں پھیرتی تو تمام حجابات اُٹھ جاتے۔ میں تو اور تو میں کی کیفیت وارد ہوتی اور جب صبح کی روشنی پھیلتی تو ہر بیٹی باپ

اور ہر بھائی بہن سے آنکھ چرا رہا ہوتا۔ یونانی اپنی دیویوں اور دیوتاؤں کو شراب میں غسل دے کر مذہبی فریضہ انجام دیتے اور پھر سنگی مجسموں کے پیروں کے قریب گری متبرک شراب کے حصول کے لئے تلواریں سونت لیتے۔ سقراط اور اس کے شاگرد شراب کے گھڑے کے گھڑے چڑھا کر ننگے پاؤں برف پر پھرتے رہتے اور ارسطو کا دانشور جنگجو سکندر اعظم کا باپ ایک بار پی کر لڑھک گیا تو سکندر نے شاہی محل کی چھت پر کھڑے ہو کر اعلان کیا' مقدونیہ کی مائیں دیکھیں کہ وہ اپنے بچوں کو جس شخص کی شجاعت اور بہادری کی داستانیں سناتی ہیں آج وہ ایک پیالہ شراب سے شکست کھا گیا۔ اے اہل مقدونیہ! دیکھو تمہارے سپہ سالار کی ٹانگوں میں اتنا دم نہیں کہ وہ بستر تک پہنچنے کے لئے اس کا بوجھ اُٹھا سکیں۔ اے مقدونیہ کے لوگو گواہ رہنا سکندر شراب نہیں پیے گا کیونکہ سکندر کو شکست سے نفرت ہے۔ جزیرہ نما عرب کے بدو مٹی کے پیالوں میں بدبودار شراب ڈال کر پیتے اور جب مرد و زن ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جاتے تو کپڑے اتار کر طواف کعبہ میں مصروف ہو جاتے کیونکہ ان کی نظر میں عبادت و ریاضت کا اس سے زیادہ معتبر ذریعہ کوئی اور نہیں تھا۔ اور ہندوستان جب چکلے شانوں اور چوڑے جبڑوں والے آریاؤں کے بھاری بھرکم رتھ رکے تو ان پر بڑے بڑے مٹکوں میں ''سوم رس'' بھی تھا۔ جس سے بدبو کے بھبکے اُٹھتے تھے اور ان پر بیٹھنے والی مکھیاں پرواز کا قرینہ بھول جاتی تھیں۔ آریائی لوگ جب ان مٹکوں سے ''سوم رس'' کے پیالے بھر بھر کر پیتے تو ان کے تمام فکر اندیشے اور خوف کند ہو جاتے۔ رات کی سیاہی چاندنی کی چادر بن جاتی۔ تیز چبھنے والی گرم ہوائیں نسیم سحر کے جھونکوں کا روپ دھار لیتیں اور ہمالیہ کی سرد ہوائیں الاؤ میں ڈھل جاتیں۔ مقامی باشندوں نے آقاؤں کے ساتھ ساتھ اس متبرک مشروب کا بھی آگے بڑھ کر سواگت کیا' شراب کی اثر پذیری ویدوں کا حصہ بن گئی۔ ہندومت کی پرانی کتابوں میں شراب کو یہ حیثیت حاصل ہے کہ ان میں دیوی اور دیوتا شراب کے گھروں میں رہتے ہیں۔ شراب ہی اوڑھتے اور شراب ہی بچھا کر سوتے ہیں اور خوش ہونے پر شراب ہی کی شکل میں انعام و اکرام سے نوازتے ہیں۔

ہندوستان کے مغل شہنشاہوں میں بھی شراب بہت مقبول تھی۔ ظہیرالدین بابر بلا کا مے نوش تھا۔ اس کے لئے سمرقند سے شراب ''درآمد'' کی جاتی تھی جو سمرقند کے مخصوص انگوروں سے کشید کی جاتی تھی لیکن ''کنواہہ'' کی لڑائی میں جب اسے مضبوط فوجوں کا سامنا کرنا پڑا تو اس نے منت مانی کہ اگر اس معرکے میں اسے فتح نصیب ہوئی تو وہ کبھی شراب کو منہ نہیں لگائے گا۔ منت

پوری ہوئی اور اس نے سارے لشکر کے سامنے آلات مے نوشی توڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے شراب سے توبہ کر لی لیکن اس کی اولاد اس قسم کے دائرے میں نہیں آتی تھی چنانچہ اس کے بعد مغل شہنشاہ' شہزادے' امراء اور درباری اہلکار زندگی بھر ''لال پری'' کی زلف گرہ گیر کے اسیر رہے۔ شہنشاہ جہانگیر روزانہ ۱۹ تولے دو آتشہ شراب پیتا تھا۔ اس کثرت استعمال سے اس کا جگر جواب دے گیا۔ سانس لینے میں دشواری رہنے لگی لہٰذا مجبوراً وہ شراب نوشی کے بعد اونٹنی کا دودھ پیتا۔ اس نسخہ سے اس کی سانس تو بحال ہو جاتی لیکن جسم بُری طرح ناطاقتی کا شکار ہو جاتا۔ شہنشاہ ہندوستان جس کی مملکت خداداد کی سرحدیں برما' چین اور ایران تک وسیع تھیں اس کو چار کہار ڈولی میں بٹھا کر دربار لاتے جہاں شہنشاہ کو چند الفاظ کی ادائیگی کے بعد کھانسی کا دورہ پڑتا اور انہیں سہارے کے لئے ملکہ عالیہ نور جہاں کے دست حنریں کی ضرورت پڑتی۔ شہنشاہ کی قوت فیصلہ عملاً جواب دے چکی تھی چنانچہ بات کرنے کے دوران شہنشاہ ملکہ عالیہ کا رُخ انوار کو دیکھتا رہتا جہاں رُخ زیبا پر ناگواری کے اثرات ظاہر ہوتے وہیں عالم پناہ اپنا فیصلہ تبدیل کر دیتے۔ جہانگیر بڑی فراخ دلی سے شراب کو اپنی تمام تر ناطاقتی کا ذمہ دار ٹھہراتا تھا۔ اس لئے ہندوستان میں اس کے دور میں شراب بنانے' بیچنے اور پینے کی سزا موت رکھی گئی تھی۔ لیکن جہاں ''زنجیر عدل'' ہی شراب میں بھیگی ہو وہاں عوام کو ساقی گری سے کون روک سکتا ہے ...اور آخر میں ایک پیالہ شراب' سیخ کباب اور ملکہ نور جہاں کا دیدار عالم پناہ کی آخری خواہش تھی۔ شاہ جہاں اور ان کے ایک آدھ بیٹے کے سوا ساری اولاد کی شامیں بادہ و ساغر کی روشنی میں گزرتیں اور صبحیں نشاط نو کا پیغام لے کر طلوع ہوتیں۔ اورنگ زیب کے دور میں نسبتاً سکون رہا۔ عالم پناہ کے مذہبی رجحانات کے باعث کاروبار مے زیر زمین چلا گیا۔ امراء مخبروں سے بچ بچا کر گھروں میں شراب پیتے اور منہ کی بدبو چھپانے کے لئے پیاز استعمال کرتے لیکن اورنگزیب کے بعد ہندوستان میں ایسا دور بھی آیا جب محمد شاہ رنگیلا شراب پی کر دربار میں سر عام پیشاب کرتا تھا اور درباری اس انداز خسروانہ پر خوشی سے ناچنا شروع کر دیتے تھے جبکہ آخری شہنشاہ ہند بہادر شاہ ظفر کی غیرت و حمیت کو شراب کی دیمک اس قدر چاٹ چکی تھی کہ غدر کے دوران جب شاہ اسلامی لشکر کی قیادت کے لئے نکلے تو لال قلعے کے سامنے ہی گھوڑے سے گر گئے۔

جنگ عظیم دوم میں پے در پے شکستوں کے بعد جب اتحادی فوجیں ہمت ہار گئیں اور فوجی ''بلڈی وار'' سے جان چھڑانے کی کوشش کرنے لگے تو برطانوی حکومت نے ان کا شراب کا

کوٹہ بڑھا دیا۔ گلگت کی سرحد پر تعینات امریکی فوجیوں کو "رم" فراہم کی گئی۔ برفیلی ہواؤں میں دشمن کا انتظار کرنے والے امریکی فوجیوں پر اس نسخے نے بڑے خوش کن اثرات مرتب کئے۔ جلد ہی رم فوجی خچروں کو بھی پلائی جانے لگی اس سے ان کی کارکردگی بھی بڑھ گئی۔ انگریز سرکار مشرق وسطیٰ، برصغیر اور یورپ کے محاذوں پر لڑنے والے دیسی سپاہیوں کو لڑنے مرنے پر اکسانے کے لئے بے تحاشا شراب پلاتی تھی اور فوجی نشے کی ترنگ میں "دشمن" کے کیمپوں میں داخل ہو جاتے تھے نتیجتاً جان سے جاتے تھے۔ یہ تجربہ زیادہ عرصہ تک کامیاب نہ رہا کیونکہ کثرت شراب نوشی اور خوراک کی کمی کے باعث بہت جلد فوجوں کی قوت مدافعت جواب دے گئی۔ سانس کی بیماری اور نمونیہ کے حملے ہونے لگے۔ نتیجتاً ہر کیمپ کی پچیس سے تیس فیصد نفری ہسپتالوں تک جا پہنچی۔ مجبوراً جنگ کے آخر میں شراب کے کوٹے میں تخفیف کرنا پڑی اور سرد علاقوں کے فوجی ٹھکانوں پر رم کی ترسیل عملاً روک دی گئی۔ اس اقدام سے فوجیوں میں مزید بے دلی پھیلی انگریز دور کے بعد ایک لمبے عرصے تک پاکستان آرمی کو شراب کا کوٹہ ملتا رہا جبکہ بھارتی فوجی کیمپوں اور میسوں میں شراب کا استعمال ابھی تک جاری ہے۔

صدیوں سے پنجاب کے جاگیردار اپنے کمیوں کو شراب پلا کر دشمن پر وار کرنے کے لئے بھیجتے آ رہے ہیں۔ اس اقدام سے دشمن مر جائے تو ست بسم اللہ دوسری صورت میں کمی مر جائے تو بھی دشمن کو مقدمات میں پھنسا کر انتقام لے لیا جاتا۔ سکھ بھی باہم لڑائی جھگڑوں سے پہلے دماغ "گرم" کرنے کے لئے اجتماعی شراب پیتے تھے۔ "جٹیاں" پیالے بھر بھر کر گھبرو نوجوانوں کو پلاتی جاتیں اور ساتھ ڈھول پیٹ پیٹ کر بہادری اور شجاعت کے گیت گاتی جاتیں۔ اس عمل سے سکھ جتھوں کا دماغ مزید "سردارانہ" ہو جاتا اور پھر وہ گھمسان کا رن پڑتا کہ اللہ کی پناہ۔ کسی کا بازو سلامت نہیں تو کسی کی ٹانگ غائب، کوئی وہیں میدان کارزار میں جان دے گیا اور کوئی گھر پہنچ کر زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسا۔ غرض پنجاب کے سکھوں کی تمام تر بہادری شراب کے مرہون منت تھی۔

شراب کے بعد پوست دنیا کا دوسرا بڑا نشہ ہے۔ جس سے نشے کی ۱۸ اقسام کشید کی جاتی ہیں۔ ان میں افیون پہلے نمبر پر ہے۔ پوست کی فصل تیار ہونے کے بعد اس کے ڈوڈوں کو چھوٹے چھوٹے چیرے دے دیئے جاتے ہیں۔ جن سے لیس دار مواد بہنے لگتا ہے۔ اس مواد کو جمع کر کے خشک کر لیا جائے تو سیاہ رنگ کی برفی سی بن جاتی ہے اسے افیون کا نام دے دیا جاتا ہے۔

یہ نام کس نے کب اور کیوں رکھا اس کا تو علم نہیں لیکن زمانہ قدیم سے افیون کا استعمال ہندوستان میں جاری ہے۔ نشے باز افیون کی گولی دودھ یا پانی کے ساتھ نگل جاتے ہیں جو معدے میں جا کر نشئی پر اونگھ طاری کر دیتی ہے، پلکیں بوجھل ہو کر آنکھوں پر گر جاتی ہیں قدم بہکنے لگتے ہیں اور آواز بھرا جاتی ہے۔ نشئی اس کیفیت کو ترنگ کہتے ہیں۔ اس حالت کے خاتمے کے بعد بھی دیر تک جسم میں ہلکی ہلکی سنسناہٹ ہوتی رہتی ہے جو دراصل "ھل من مزید" کا نقارہ ہوتی ہے۔ مغل شہنشاہ ہمایوں خان اس لت کا بری طرح شکار تھا۔ شاہ کو سونے کی پیالی میں افیون گھول کر پلائی جاتی تھی۔ جس کے بعد تاجدار ہند ایک پلیٹ دودھ کی بالائی نوش جاں فرما کر لیٹ جاتے اور کاروبار سلطنت مصاحبین کے ہاتھ میں چلا جاتا۔ ہمایوں خان اس لت کی وجہ سے جسمانی غلاظت، کنجوسی، بزدلی اور کاہلی کی ضرب المثال تھا۔ اس کا انتقال بھی افیون کے نشے میں سیڑھیوں سے گر کر ہوا۔ نوابین اودھ میں بھی افیون کھانے کا رواج عام پایا جاتا تھا۔ نوابین خود کو افیونی کی بجائے "چنیا بیگم کے عشاق" کہلاتے تھے۔ افیون خوردنی کے لئے نواب شائقین کے لئے تقریبات کا اہتمام کرتے، جہاں اجتماعی طور پر اس کا نشہ کیا جاتا اور چنیا بیگم کے عشاق ترنگ میں کیا کیا حرکات کرتے اس کا تصور تک محال ہے تاہم پنڈت رتن ناتھ سرشار کا سدا بہار ناول "فسانہء آزاد" کا لکھنوی کردار "خوجی" اپنی حرکات وسکنات سے افیون خوردنی کی کیفیات کی کسی نہ کسی حد تک تشریح ضرور کرتا ہے۔

چین میں افیون بہت کم پیدا ہوتی تھی۔ ۱۷ویں صدی کے شروع میں برطانوی اور فرانسیسی تاجروں نے چینیوں کو افیون خوردنی پر لگا دیا۔ نشہ عام ہوا تو چینی حکمران مانچو نے ۱۸۳۸ء میں اس پر پابندی لگا دی۔ نتیجتاً برطانیہ نے چین کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ۴۲-۱۸۳۹ء میں چین میں افیون کی جنگ لڑی گئی جس میں انگریزوں کو فتح حاصل ہوئی۔ جس کے بعد برطانوی تاجر بڑی خوش اسلوبی سے چین کو بھارت سے افیون اور کوکین فراہم کرنے لگے یہاں تک کہ پوری قوم افیونی ہو گئی۔

افیون کے علاوہ پوست کے بے شمار استعمال ہیں۔ جن میں کچھ کا احوال درج ذیل ہے۔

پوست کے ڈوڈے گھوٹ کر پئے جاتے ہیں۔ اس کے پتوں کا حلوہ بنایا جاتا ہے، ڈوڈوں سے نکلنے والے باریک دانوں "خشخاش" کو باریک پیس کر اس میں دودھ ملا کر پیا جاتا

ہے۔ پوست کو پانی میں اُبال کر صاف کیا جاتا ہے پھر اس کی گولیاں بنائی جاتی ہیں جن کو خاص قسم کے حقے میں لپیٹ کر بھی پیا جاتا ہے اسے ''چانڈو'' کہتے ہیں۔ آج سے بیس پچیس برس پہلے لاہور میں مزنگ، گنٹی سمیاں اور حکیماں بازاروں کے خستہ حال جھلے مکانوں میں درجنوں چانڈو خانے قائم تھے۔ یہاں نشے باز گندی زمین پر لیٹ کر سر کے نیچے اینٹ رکھتے، دو روپے دے کر ''چانڈو'' لگاتے اور تین گھنٹے تک ماؤف العقل ہو کر ''سو'' جاتے۔ پاکستان میں نشوں کے جدید طریقے آنے کے بعد یہ چانڈو خانے بند ہو گئے لیکن مشرق بعید اور یورپ میں یہ ابھی تک قائم ہیں۔ لندن کے مضافات میں چینیوں نے کئی چانڈو خانے بنا رکھے ہیں جہاں گوروں کی لاپرواہ نسل ''اوپیم سموکنگ ڈینز'' کے مزے لیتی رہتی ہے۔ پچاس اور ساٹھ کی دہائی میں پوست سے دو نئے کیمیائی عناصر کشید کیے گئے یہ عناصر Demerol اور Codein کے نام سے مشہور ہوئے۔ کوڈین کے بارے میں ابتدائی تصور تھا کہ یہ کھانسی میں افاقہ دیتی ہے لہٰذا کوڈین کھانسی کے تمام شربتوں کا لازمی جزو بن گئی۔ پاکستان میں جب منشیات پر پابندی لگائی گئی تو نشے باز ''کف سیرپ'' کی طرف دوڑ پڑے۔ لوگ چھ روپے کی شیشی لے کر منہ سے لگا کر پوری پی جاتے۔ بعض نشے باز تو نیند کی گولیوں کے ساتھ چار چار بوتلیں چڑھا جاتے۔

افیون کو ایک کیمیائی عمل سے گزار کر اس سے مارفین الگ کر لی جاتی ہے۔ یہ مارفین ٹیکے کے ذریعے جسم میں داخل کی جاتی ہے جس کے بعد مریض کی جسمانی دردیں تھوڑی دیر کے لئے ختم ہو جاتی ہیں۔ ابتداً مارفین طبی نکتہ نظر سے استعمال کی جاتی رہی لیکن بعد ازاں نشے بازوں نے اس کو بھی نشے کی شکل دے دی۔ پاکستان کے شہروں اور قصبات میں اکثر ایسے نشئی نظر آنے لگے جن کی جیبوں میں مارفین کی بوتل ہوتی اور انہیں جہاں ضرورت پڑتی خود ہی انجکشن تیار کر کے لگا لیتے۔

دنیا میں منشیات نے باقاعدہ کاروبار کی شکل اختیار کی تو سسلی کا جزیرہ ''پلرمو'' ڈرگز کا ہیڈ کوارٹر بن گیا۔ منشیات فروشوں نے یہاں ''ڈرگ مافیا'' کے نام سے ایک زیر زمین سلطنت کی بنیاد رکھی جس کا کنگ ''گاڈ فادر'' کہلانے لگا۔ مافیا نے تمام جدید سائنسی سہولیات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے منشیات کا زہر پوری دنیا میں پھیلا دیا۔ ہر ملک میں ان کے اڈے تھے اور ہر ملک میں ان کے ایجنٹ۔ ''پیداواری'' اہمیت کے حامل ممالک میں مافیا نے سیاست دانوں کو خریدا۔ بیوروکریسی، عدلیہ اور فوج میں اپنے بندے بھرتی کرائے اور پھر اپنی مرضی کی حکومتیں بنوا کر گندم

چنے اور گنے کے کھیتوں میں پوست، بھنگ اور کوکا کاشت کرائی۔ گاڈ فادر کے اثر نفوذ کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ دنیا کے کسی بھی حکمران کو چند منٹ کے نوٹس پر قتل کرا سکتا ہے اور کسی بھی علاقے کو مکمل طور پر صفحۂ ہستی سے مٹا سکتا ہے۔

۱۹۷۸ء میں ''پلرمو'' کی خفیہ لیبارٹری میں ایک کیمیادان کام کرتا تھا۔ لوگ اسے جسمانی بدصورتی کے باعث ''ہیرو'' کہتے تھے۔ اس نے ۱۹۷۸ء میں مارفین اور سرکے کے تیزاب کے کیمیائی عمل سے ایک نیا عذاب دریافت کر لیا۔ اس وقت کے علم تھا کہ ایلومینیم کے ذرے میں پڑا یہ مٹھی بھر سفید سفوف چند برس بعد دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ ہو گا اور لاس اینجلس سے لے کر پولینڈ اور بحرِ اسود سے لے کر بحیرہ عرب تک کروڑوں لوگ اس زہر کا شکار ہو کر زندگی سے موت کی بھیک مانگ رہے ہوں گے۔ اس سفوف کو ابتداً ''سنو'' کا نام دیا گیا لیکن جب وزن میں ہلکی، ذائقے میں تلخ اور بدبو میں سرکے سے ملتی جلتی اس سنو کو دنیا جہاں سے پذیرائی ملی تو اسے خالق کے نام کی مناسبت سے ''ہیروئن'' کا نام دے دیا گیا۔ ڈرگ مافیا نے ہیروئن سازی کے لئے اٹلی اور فرانس میں وسیع پیمانے پر پوست کی کاشت شروع کرا دی۔ مافیا کے کارندے مفلوک الحال کسانوں کو اغوا کر کے لاتے اور انہیں بنجر زمینوں پر ہل چلا کر موت کی کاشت پر مامور کر دیا جاتا۔ جب یورپ میں سختی ہوئی تو ڈرگ مافیا کے اہلکار ترکی اور شام سے افیون لے کر اس سے مارفین کشید کرتے اور اسے اپنے ذاتی بحری جہازوں میں یورپ لے جاتے جہاں اس میں کیمیائی اجزا ملا کر ہیروئن تیار کر لی جاتی۔ امریکہ میں ہیروئن فروشی کا سارا دھندہ اطالوی سمگلروں کے ہاتھ میں تھا جہاں یہ لوگ دو کروڑ روپے کلو کے حساب سے ہیروئن فروخت کرتے تھے۔ انتہائی منفعت بخش کام دیکھ کر مشرق بعید کے کسانوں نے بھی اپنے کھیتوں میں پوست کی کاشت شروع کر دی اور جلد ہی تھائی لینڈ، کمبوڈیا اور مکاؤ منشیات کی سنہری مثلث بن گئی۔ ادھر بھی پابندیاں سخت ہوئیں یہ تو کاروبار پاکستان کے شمال مغربی علاقوں اور افغانستان کی سرحدوں پر پہنچ گیا۔ جہاں کے غریب قبائلی کاشتکاروں نے اپنے چھوٹے چھوٹے گھروں کو ہیروئن کی لیبارٹریاں بنا لیا۔ دنیا جہاں کے سمگلروں نے کراچی، لاہور اور راولپنڈی میں اپنے اڈے قائم کیے اور ہماری ''پراڈکٹ'' دنیا کے تمام جدید ممالک کی مارکیٹوں میں پہنچنے لگی۔ پاکستان میں ہیروئن پر مزید تحقیق ہوئی اور اس میں چند دیسی اشیا بھی ڈال دی گئیں جس سے اس کی رنگت خیالی ہو گئی اور اس کی سنگینی میں بھی اضافہ ہو گیا۔

حسن بن صباح کے قلعہ الموت میں پہلی مرتبہ بھنگ کو بطور نشہ متعارف کرایا گیا۔ اس نے ایک جنت تعمیر کرائی جہاں دودھ اور شہد کی نہریں بھی تھیں اور سفید سنگ مرمر کی بارہ دریاں بھی اور ان بارہ دریوں میں سفید براق لباس میں ملبوس حوریں بھی' حسن کے کارندے مضافات سے مضبوط تن و توش کے دیہاتی پکڑ کر لاتے اور انہیں بے ہوش کر کے جنت میں پھینک دیا جاتا۔ ہوش آنے پر انہیں جنتی ہونے کی نوید سنائی جاتی۔ پھر حوریں بھنگ کے پیالوں سے ''جنتی'' کی پرورش شروع کر دیتیں چند ہفتوں کے بعد خوشخبری سنائی جاتی کہ انہیں چند روز کی آزمائش کے لئے دوبارہ زمین پر بھیجا جا رہا ہے۔ جنتی خوش ہو جاتا اسے زہر میں بجھا خنجر دے کر کسی مسلم عالم یا سپہ سالار کے قتل کے لئے روانہ کر دیا جاتا اور وہ بھنگی اسے حکم خداوندی سمجھ کر جان لڑا دیتا۔ بعد ازاں مسلم رہنماؤں کی دعوت پر ہلاکو خان نے حملہ کر کے یہ جنت تاراج کر دی۔ حسن بن صباح مارا گیا اور قلعہ الموت کھنڈر بن گیا لیکن بھنگ کی وباء پوری دنیا میں پھیل گئی۔ باریک سبز پتوں والے اس پستہ قامت پودے سے نشے کی چھ اقسام کشید کی جاتی ہیں۔ بھنگی اس کے خشک پتے گھوٹ کر ان میں بادام اور چار مغز ملا کر پیتے ہیں۔ ان کے پتوں کو تمباکو کی طرح کاغذ میں لپیٹ کر پیا جاتا ہے جبکہ چرس' گانجا اور مدھک بھی اسی سے اخذ کی جاتی ہے۔

میکسیکو میں زمانہ قدیم سے Cactus نامی کانٹے دار درخت کے پتے کھانا اور جڑیں ابال کر پینا مذہبی فریضہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کو بعض لوگ ''متبرک کھمبی'' اور اکثر God's Flash کا نام دیتے ہیں جبکہ عربی میں اسے زقوم اور اردو میں تھوہر کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں چار مختلف مقامات پر تھوہر کا نام آتا ہے۔ قرآن مجید میں جہاں گناہ گاروں کو دوزخ کے عذاب سے ڈرایا جاتا ہے وہاں کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں کو اذیت رسانی کے لئے تھوہر کھلایا جائے گا۔ ۶۰ کی دہائی میں کولمبیا کے سمگلروں نے طویل ''ریسرچ'' کے بعد دوزخیوں کی اسی خوراک سے ایل۔ ایس۔ ڈی نامی سفوف اخذ کیا جو انتہائی مہلک نشہ ثابت ہوا۔ یہ سفوف قرآن مجید کی پیشگوئی کے عین مطابق پیٹ میں جا کر کھولتا ہے۔ دماغ میں پہنچ کر تمام اعصاب کو سن کر دیتا ہے اور نشئی دنیا و مافیہا سے لاتعلق ہو جاتا ہے۔ ایل۔ ایس۔ ڈی کی دریافت کے بعد کولمبیا کے سمگلر اس قدر خود سر ہو گئے تھے کہ انہوں نے سزا سنانے والے متعدد جج ہلاک کر دیئے۔

کوکین کی دریافت بھی کم عجیب نہیں۔ برازیل کے جنگلوں میں ''کوکا'' نام کا ایک پودا کثرت سے اگتا ہے۔ پرانے زمانے میں یہاں کے باسی اس پودے کی جڑیں ابال کر جانوروں

کے زخموں پر لگاتے تھے جس سے ڈھور ڈنگروں کا درد فوراً رفع ہو جاتا تھا۔ دنیا میں منشیات کی ترویج کے ساتھ ہی کیمیا دان ''کوکا'' کی طرف متوجہ ہو گئے اور جلد ہی اس کے ست سے ''کوکین'' تیار کر لی گئی۔ یہ سفید سفوف ابتداً جنسی ادویات میں استعمال ہوا لیکن بعد ازاں مخصوص امراض کے ماہرین نے اس کا براہ راست استعمال شروع کرا دیا جس کے بعد یہ نشے کی حالت میں مارکیٹ میں آ گیا۔ ۱۹۶۴ء میں لاہور کے بازار حسن کے ایک پان فروش نے پہلی مرتبہ پان کے ذریعے کوکین متعارف کرائی' اس کے ''مخصوص'' گاہکوں کی پذیرائی کے بعد پان فروش کے کاروبار کو چار چاند لگ گئے۔ تھوڑے ہی عرصے میں بھید کھل گیا اور پان فروش کو پولیس پکڑ کر لے گئی لیکن یہ فارمولا دوسرے پان فروشوں کے ہاتھ جا لگا اور یوں لاہور کے ۲۰ فیصد پان فروش یہ دھندہ کرنے لگے۔ ۶۶ء' ۶۷ء میں برانڈرتھ روڈ کا ایک پان فروش اس نسخے کے لئے بڑا مشہور تھا وہ مخصوص پان کو ''بم'' کہتا تھا اور کوئی بھی گاہک سوا روپیہ دے کر یہ بم خرید سکتا تھا۔ یہ پان کھانے کے فوراً بعد گاہک کی زبان سوجھ جاتی اور وہ دو گھنٹے تک بولنے سے معذور ہو جاتا ہاں البتہ اس کی جنسی طاقت میں ضرور اضافہ ہو جاتا۔

ادویات میں نشہ آور اجزاء کے استعمال کا آغاز ویدک طب سے ہوا جس سے متاثر ہو کر مسلم اطباء نے بھی اپنے نسخوں میں منشیات کا بلا جواز استعمال شروع کر دیا۔ اس طرح دانت درد سے زکام آشوب چشم سے جسمانی کمزوری تک کی زیادہ تر ادویات میں پوست اور بھنگ استعمال ہونے لگی۔ میڈیکل سائنس اور سرجری کے آغاز کے ساتھ ہی طبی نکتہ نظر سے منشیات کا استعمال ناگزیر ہو گیا۔ حادثے کے بعد اور آپریشن کے دوران مریض کا احساس درد دور کرنے کے لئے اسے مارفین اور پیتھے ڈین کا انجکشن لگایا جانے لگا۔ گو چند روپے کے اس ٹیکے کے بعد مریض درد کے احساس سے آزاد ہو جاتا تھا لیکن انجکشن کا اثر ختم ہونے کے بعد تکلیف زیادہ شدت سے وار کرتی تھی لہٰذا مجبوراً مریض کو پھر انجکشن دینا پڑتا۔ اس عمل کے دوران مارفین کی لذت بعض مریضوں کی نسوں میں رچ بس جاتی اور وہ اس کے مستقل عادی ہو جاتے جس کے بعد ان کی باقی زندگی منشیات کے اردگرد گھومتی رہتی۔ یہاں تک تو بات قابل قبول تھی کیونکہ مارفین کی زد میں آنے والی آبادی کسی بھی طرح اشاریہ ۵ سے زائد نہیں تھی لیکن نیند کی ادویات کی ایجاد کے بعد غیر محسوس طریقے سے عام آدمی کی زندگی میں بھی منشیات داخل ہو گئیں مسکن ادویات کا استعمال ابتداً اعلیٰ سوسائٹی سے شروع ہوا جہاں بزنس مین' سیاست دان' وکلاء اور زندگی کے دوسرے مصروف

شعبوں سے وابستہ وہ لوگ یہ ادویات لینے لگے جنہیں کم نیند کی شکایت تھی۔ ظاہر ہے ان ادویات کے استعمال کے بعد ان کی یہ شکایت رفع ہوگئی تو ان لوگوں نے اپنی نجی محفلوں میں بڑے فخر سے ان جادوئی گولیوں کا ذکر شروع کر دیا جس سے سننے والوں کا متاثر ہونا قدرتی امر تھا لہٰذا خواب آور ادویات کے استعمال کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا۔ جلد ہی ترقی یافتہ ممالک میں مسکن ادویات فیشن بن گئیں لوگ سونے سے قبل گولی کھانا قابل فخر سمجھنے لگے اور جن لوگوں کو دوا کے بغیر نیند آجاتی انہیں غریب اور گنوار تصور کیا جانے لگا۔ دواساز کمپنیوں نے مارکیٹ دیکھ کر دھڑا دھڑ مسکن ادویات بنانا شروع کر دیں۔ آج یہ گولی تو کل فلاں گولی اسی دوڑ میں پانچ سات برس قبل جرمنی میں نیند کی ایک ایسی حیرت انگیز دوا دریافت ہوئی جو نہ صرف تھکے ہوئے اعصاب کو سکون دیتی تھی بلکہ ''مریض'' اگلے روز خود کو ہشاش بشاش بھی محسوس کرتا تھا۔ اس گولی نے یورپ میں تہلکہ مچا دیا۔ ہر مرد کے کوٹ کی جیب اور ہر خاتون کے پرس میں یہ گولی ضرور ہوتی تھی۔ اس تریاق کی شہرت یورپ سے نکلی تو امریکہ، مشرق وسطیٰ آسٹریلیا اور مشرق بعید میں بھی ان گولیوں کی تیاری شروع ہوگئی لیکن پھر ایک حادثہ ہوگیا۔ فرانس کی ایک حاملہ عورت نے کچھ عرصہ تک دوا کھائی جب اس کے ہاں بچہ پیدا ہوا تو اس کی ٹانگیں اور ہاتھ غائب تھے۔ چند روز بعد اسی محلے کی ایک عورت نے بھی معذور بچے کو جنم دیا۔ تحقیقات کے بعد معلوم ہوا وہ بھی یہی دوا استعمال کر رہی تھی۔ اس کے بعد پوری دنیا سے معذور بچوں کی پیدائش کی اطلاعات آنے لگیں۔ بلجیئم کی ایک عورت نے اپنے معذور بچے کو قتل کر دیا۔ ایک امریکی عورت نے ہسپتال کی انتظامیہ کو اسقاط حمل پر مجبور کیا انکار پر وہ اس کام کے لئے سویڈن چلی گئی۔ اس خوفناک تجربے کے بعد حاملہ عورتوں کے لئے خواب آور ادویات کے استعمال پر پابندی لگا دی گئی۔

ڈیپریشن اور فرسٹریشن کی دریافت کے بعد مسکن ادویات کا استعمال مزید بڑھ گیا کیونکہ ان نشئی مرکبات کے استعمال سے اضطراری کیفیت کے شکار شخص کی حسیات کند ہوجاتی ہیں اور وہ دوا کے اثر تک پرسکون رہتا ہے۔ ان مرکبات کو نشے کی گولیاں یا خواب آور ادویات کے ٹائٹل سے بچانے کے لئے ''ٹرینکلائزرز'' کا نام دے دیا گیا۔ اس وقت ۱۵۰ ایسی ادویات مارکیٹ میں موجود ہیں جو سکون یا نیند لانے کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔ طبی نسخوں میں کثرت استعمال اور دواساز اداروں کی پبلسٹی کے باعث معمولی گھبراہٹ، بے قراری اور ذہنی خلجان میں ان ادویات کا استعمال ناگزیر ہوتا جا رہا ہے۔ ۸۰ فیصد پڑھے لکھے لوگوں کو ان ادویات کے نام تک

حفظ ہیں جونہی کوئی شخص پریشانی محسوس کرتا ہے فوراً بازار سے گولی خرید کر کھا لیتا ہے اور کبوتر بلی کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ لیکن ''نشہ اُترنے'' کے بعد ذہنی پریشانی دوگنی جسامت میں بدستور سامنے کھڑی ہوتی ہے۔

نشے کے خلاف اسلام کی خدمات کا ذکر کئے بغیر یہ کہانی مکمل نہیں ہوتی۔ نبی کریم ﷺ نے جب دعوت اسلام شروع کی تو عرب معاشرے میں شراب سمیت ہر قسم کی مروجہ منشیات عام تھیں۔ لوگ (بشمول مسلمان) پی کر بہک جانا عیب نہیں سمجھتے تھے۔ مدینہ منورہ میں جب ان شرابیوں کے ہاتھوں امن کے مسائل پیدا ہونے لگے تو ارشاد باری تعالیٰ کی گونج سنائی دی۔ ''تم سے شراب اور جوا کے بارے میں پوچھا جاتا ہے ان کو بتاؤ کہ ان میں بہت زیادہ نقصان اور گناہ ہے اگرچہ فوائد بھی ہیں۔ (البقرۃ۔ ۲۱۹) اس آیت کے اترنے کے بعد لوگوں کو پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ شراب اور جوا نقصان دہ ہیں مگر ابھی یہ صرف اطلاع تھی کچھ دنوں بعد جب مسلمانوں کا ایک گروہ محفل ناؤ نوش میں مصروف تھا تو نماز کا وقت ہوگیا۔ ان لوگوں نے اسی حالت میں نماز شروع کر دی لیکن نشے کے غلبے کے باعث ترتیب بگڑ گئی۔ رکوع کی جگہ سجدہ، سجدہ کی جگہ قیام ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے جب اپنے بندوں کی یہ حالت دیکھی تو فوراً حکم فرمایا۔ ''تم لوگ نشے کی حالت میں نماز کے قریب بھی نہ جایا کرو۔'' (النساء ۴۳) فرمانِ خداوندی بہت واضح تھا لہٰذا کوئی مسلمان سرتابی کا سوچ تک نہیں سکتا تھا لیکن یہاں ایک اور مسئلہ کھڑا ہوگیا۔ مے نوشی کے تمام اوقات میں کوئی نہ کوئی نماز آتی تھی لہٰذا شرابیوں کے لیے ساغر و مینا سے پرہیز ممکن تھا اور نہ قضا ورکوع و سجود قبول تھی اسی دوران جب ایک دن مسلمانوں کا ایک گروہ مے نوشی میں مصروف تھا۔ حضرت انسؓ ساقی گری کر رہے تھے تو ایک شخص نے آ کر کہا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے شراب اسلام میں حرام قرار دے دی گئی ہے۔ ہاتھ وہیں رک گئے۔ پیالے ہونٹوں سے الگ ہوگئے۔ جس کے منہ میں شراب کا گھونٹ تھا اس نے وہیں اُگل دیا اور جس کے معدے سے شراب کی بُو اُٹھ رہی تھی اس نے فوراً حلق میں اُنگلی ڈال کر قے کر دی۔ صرف یہی نہیں پورے مدینہ منورہ میں جس گھر میں بھی شراب کا مٹکا موجود تھا اہلِ خانہ نے باہر لا پٹخا پھر اس دن سارے شہر سے شراب کی بُو اُٹھ رہی تھی لیکن یہ بو زیادہ دیر تک قائم نہ رہی چند ہی لمحوں بعد صحرا کی ہوا اسے ساتھ لے اُڑی اور باقی رہ گئی ایمان کی خوشبو جس نے ایک عرصے تک گلستان رسالت کو مہکائے رکھا۔

رسول کریم ﷺ کے ایک دوست ثقیف روس میں تھے۔ یوم الفتح پر وہ شراب کا تحفہ لے

کر آئے۔ آپؐ نے فرمایا کیا تم کو علم نہیں اللہ تعالیٰ نے اس کو حرام کر دیا ہے تو اس نے فوراً اپنے غلام کے کان میں کہا تم یہ شراب بازار میں جا کر فروخت کر دو۔ نبی کریم کو اس کی سرگوشی کا علم ہوا تو انہوں نے فرمایا۔ ''جس نے اس کا پینا حرام کیا اس نے اس کی فروخت بھی حرام قرار دی۔'' لہٰذا وہ شراب بطحا میں بہا دی گئی۔ (مسلم' احمد' نسائی)

حضرت ابوطلحہؓ کی پرورش میں ایک یتیم بچہ تھا انہوں نے اس کی وراثت سے فصل کے موقع پر شراب خرید لی تاکہ قیمت بڑھنے پر فروخت کر کے یتیم کو رقم دے دی جائے لیکن اس دوران شراب حرام ہو گئی تو وہ نبی اکرمؐ کے پاس آئے آپ نے سارا قصہ سن کر فرمایا۔ ''اسے جلا دو'' حضرت ابوطلحہؓ نے پھر پوچھا۔ ''اس کا سرکہ نہ بنا لوں'' تو فرمایا۔ ''نہیں'' (احمد' ابوداؤد) ایک اور جگہ نبی اکرمؐ نے یہ فرما کر کہ ہر نشہ آور چیز خمر ہے اور ہر نشہ دینے والی چیز حرام ہے تمام تر منشیات کے خلاف فیصلہ دے دیا۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے جس چیز کی زیادہ مقدار سے نشہ ہوتا ہے اس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہوتی ہے۔ (ابن ماجہ) حضرت طارق بن سویدؓ نے ایک بار نبی اکرمؐ سے پوچھا ہمارے ملک میں انگور بہت ہوتے ہیں کیا ہم ان کو نچوڑ کر استعمال کر لیں تو آپ نے فرمایا۔ ''نہیں۔'' انہوں نے پھر دریافت کیا ہم اس سے بیماریوں کا علاج کرتے ہیں؟ آپؐ نے کہا یہ دوا نہیں بلکہ بذاتِ خود ایک بیماری ہے۔'' (مختلف' مسلم' احمد)

مختلف امراض میں منشیات کے استعمال سے مریض کو وقتی فائدہ ضرور ہوتا ہے لیکن بعد ازاں یہی فائدہ مرض کو مزید بگاڑ دیتا ہے مثلاً نمونیہ اور کھانسی کے ہر مریض کو برانڈی پلائی جاتی تھی پھر تجربات سے معلوم ہوا برانڈی کی وجہ سے پھیپھڑوں میں خون کے سفید خلیے کم ہو جاتے ہیں نتیجتاً قوت مدافعت بالکل ختم ہو جاتی ہے اور پھیپھڑوں میں زخم اور پلوری پیدا ہو جاتی ہے جس سے مریض مرض موت کا شکار ہو جاتا ہے اسی طرح زکام میں برانڈی استعمال کرنے والوں میں دیکھا گیا کہ جو زکام عام حالات میں صرف تین روز میں ٹھیک ہو جاتا تھا وہ ۹ دن تک طویل ہو گیا۔ ایک دور میں دل کے امراض میں وہسکی استعمال کرائی جاتی تھی لیکن جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ اس ''علاج'' سے خون کی نالیاں سکڑ جاتی ہیں اور دماغ کو خون کی مطلوبہ مقدار نہیں ملتی جس سے فشار خون لاحق ہو جاتا ہے۔ بعض اطباء کھانسی کے دوران پوست کے مرکبات استعمال کراتے ہیں لیکن اس سے کھانسی تو درست ہو جاتی ہے لیکن پھیپھڑوں میں بلغم جم جانے کے باعث سانس کی بندش ہو جاتی ہے۔ عام دردوں کا علاج چرس بھی تجویز کیا جاتا ہے لیکن اس علاج سے جسم کے دیگر

مقامات پر بھی دردیں شروع ہو جاتی ہیں جس کا واحد علاج چرس کے بہت سے سگریٹ ہوتا ہے۔ اس طرح کے پے در پے علاج کے بعد جسم توڑ پھوڑ کا شکار ہو جاتا اور معدے میں ایک دائمی سوزش آنتوں میں جلن' قبض' بواسیر' جگر کی خرابی' پیٹ میں پانی' خون کی نالیوں کا سکڑاؤ' بلڈ پریشر' دل کا دورہ' چڑچڑاپن' غصہ' اشتعال' ڈپریشن' فرسٹریشن' بے ہمتی' ناکامی کا گہرا احساس اور مظلومیت طاری ہو جاتی ہے۔ منشیات استعمال کرنے والے لوگ اخلاقی انحطاط کا بھی شکار ہو جاتے ہیں' جھوٹ دھوکا دہی' چوری چکاری' جھوٹی قسمیں اٹھانا' گالیاں دینا اور عزیز رشتہ داروں کی تذلیل ان لوگوں کا وطیرہ بن جاتا ہے۔ صاحبو یہ کیسا علاج ہے جس سے خرابی کی سینکڑوں علامتیں اٹھتی ہیں۔

اس وقت منشیات دنیا کا سب سے بڑا بزنس ہے امریکہ میں ہر شہری سال میں سو گیلن شراب پیتا ہے' دنیا کے ۳۰ ممالک میں بڑے پیمانے پر پوست اور بھنگ کاشت کی جاتی ہے' جنوبی امریکہ کے تقریباً تمام ممالک میں تھوہر موجود ہے جہاں سے ایل۔ ایس۔ ڈی ستوف کشید ہوتا ہے' سینکڑوں دوا ساز کمپنیاں مسکن ادویات کی شکل میں نشہ آور مرکبات مارکیٹ میں بیچ رہی ہیں اور یہ سب مل کر انسانی زندگی میں وہ آلودگی پھیلا رہی ہیں جس سے بچ نکلنا انسان کے بس کی بات نہیں اور یہ حقیقت ہے منشیات اکیسویں صدی کا سب سے بڑا مسئلہ ہو گا ایٹم بم اور ایڈز سے بھی بڑا مسئلہ کیونکہ یہ جسم سے پہلے دماغ پر اثر کرتی ہیں۔ سوچ کا عمل تباہ کرتی ہیں' نیکی اور بدی کا احساس ختم کرتی ہیں۔ موت سے محبت اور زندگی سے نفرت پیدا کرتی ہیں۔ اور جب یہ سب کچھ ہو جائے تو انسان کو موت سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ عقل بھی نہیں' قانون بھی نہیں اور جمہوریت بھی نہیں ... اور یہ لوگ کتنے بے وقوف ہیں جو اس انسان کو ایٹم بم اور ایڈز سے ڈرا رہے ہیں جو اپنے ہی لہو کی حدت سے پگھل رہا ہے جو پہلے سے ہی موت کا انتخاب کر چکا ہے...... بے شک زمانے ہی کی قسم انسان خسارے میں ہے۔

• • •

ہم جنوں کی دنیا میں رہتے ہیں

جن کون ہیں؟ یہ ہیں بھی یا نہیں؟ اور اگر یہ ہیں تو یہ کہاں رہتے ہیں؟ یہ وہ سوال ہیں جو اکثر ہمارے ذہنوں پر دستک دیتے رہتے ہیں۔ یہ سوال میرے ذہن میں بھی اُٹھتے رہتے تھے۔ میں ان سوالوں کے جواب تلاش کرنے نکلا تو میں حیرت کی ایک ایسی دنیا میں چلا گیا جس نے مجھے مزید الجھا دیا۔ میں اس خواہش کی تمام اُلجھنیں آپ کے حوالے کر رہا ہوں کہ شاید آپ میں سے کوئی شخص آگے بڑھے۔ اس موضوع پر مزید تحقیق کرے اور ہزاروں لاکھوں برسوں کے ان سلگتے سوالوں کی آگ بجھا دے۔

......

......اور پھر تخلیق کا مرحلہ آ گیا

تو رب العزت نے آگ جلائی یہ بڑا سا الاؤ جس کے شعلوں کی کوئی حد نہ تھی اور جس کی تپش قرب و جوار کی ہر چیز کو پگھلا رہی تھی۔ پھر اذن خداوندی ہوا اور اس آگ کے نور سے ملائکہ تخلیق پا گئے اور اوپر اٹھتے شعلوں سے جنات بنا دیئے گئے۔ سیاہ دھوئیں کے مرغولے دیو بن گئے اور یوں کائنات پر تخلیق کا پہلا مرحلہ مکمل ہو گیا۔ (عجائب القصص)

جنات کا پہلا جن مارج تھا پھر اس کی بیوی مرجہ پیدا کی گئی وہ دونوں قریب آئے تو پہلے حمل سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئی' پھر حمل ٹھہرا تو ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ یوں ہر ملاپ سے ایک جوڑا پیدا ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ان کی تعداد ۷ ہزار تک جا پہنچی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان پر عائلی قانون نافذ کر دیا۔ نر اور مادہ کے جوڑے بنا دیئے گئے۔ انہیں عقد کے بندھن میں باندھ دیا گیا اور وہ خاندان' گروہوں اور قبیلوں میں بٹنے لگے پھر ایک وقت آیا جب ان کی نسل کا کوئی شمار و قطار نہ رہا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں رتبوں کے لحاظ سے زمین' ہوا اور آسمان پر آباد کیا جو زمین پر آئے وہ بہت جلد شریر ہو گئے۔ کفر و شرک کو اپنا شعار بنایا اور قتل و غارت گری کو پیشہ اور جو ہوا میں تھے' ان میں سے کچھ شریر تھے اور کچھ اللہ تعالیٰ کے اطاعت گزار جبکہ آسمان پر آباد ہونے والے فوراً ذکر الٰہی میں ڈوب گئے اور فکر یزداں میں بھیگ گئے...... یہی اللہ تعالیٰ کے مقرب ''بندے'' تھے...... اور انہی میں سے ایک عزازیل (شیطان) بھی تھا جس نے بنوالجان کی لڑکی سے شادی کی تو اسے اللہ تعالیٰ نے کثرت اولاد سے نوازا۔ اس کے ہزاروں بیٹے اور ہزاروں

بیٹیاں تھیں وہ رب العزت کے اس انعام کا حق دار بھی تھا کیونکہ اس کی پلکیں ہر لحہ عبادت و ریاضت سے بوجھل اور ہونٹ ذکر الٰہی سے لرزیدہ رہتے تھے اور جب اللہ تعالیٰ نے ایک ہزار برس کی عبادت کے بعد اس کا درجہ بلند کیا اور وہ دوسرے آسمان پر آ ٹھہرا تو اس نے مزید شدومد سے عبادت شروع کر دی پھر ہزار برس بعد اس کے لئے تیسرے آسمان کے دروازے بھی وا ہو گئے تو اس کی گردن کثرت عبادت سے مزید جھک گئی اور پیشانی سجدوں کی تاریخ بن گئی یوں اس کے درجے بلند ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ اسے ساتویں آسمان پر قرب الٰہی نصیب ہو گیا (القدس و الخلیل)

ایک روز زمین رب العزت کے حضور شکوہ کناں ہوئی۔ یا باری تعالیٰ یہ تم نے کس مخلوق کو میرے اوپر سوار کر دیا جس نے قتل و غارت گری کو اپنا شعار اور شر انگیزی کو عادت بنا رکھا ہے۔ جس نے میرے سینے میں تباہی و بربادی کا بیج بویا اور جو ہر روز اس بربادی کی فصل کاٹتی ہے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت عامر بن عمیر بن الجان کو پیغمبر بنا کر قوم جن پر اتارا لیکن ان بدبختوں نے اقرار نبوت کے چند روز بعد ہی انہیں شہید کر دیا پھر حضرت صاعق بن ماعق بن مارد بن الجان نبی بن کر اترے وہ بھی چند روز بعد ہی ان ''شیطانوں'' کی فتنہ پروری کا شکار ہو گئے پھر اللہ تعالیٰ ہر برس ایک نبی اتارتا اور وہ چند روز بعد اسے قتل کر دیتے۔ یہاں تک کہ ۸ سو برسوں میں ۸ سو انبیا ان کے ہاتھوں شہید ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں عذاب کی وعید سنائی۔ قہار نے اپنے قہار ہونے کا ثبوت دیا تو زمین پر جنات کی ایک وسیع آبادی صاف ہو گئی جو چند صالحین بچے انہوں نے غاروں میں چھپ کر جان بچائی پھر ایک صالح شخص کو حاکم مقرر کر دیا گیا اور ۳۶ ہزار برس تک زمین پر امن و امان رہا لیکن جب ان کی تعداد دوبارہ بڑھ گئی تو انہوں نے اپنی پرانی روش اختیار کی۔ اللہ تعالیٰ نے پھر عذاب اتارا اور چند صالحین نے غاروں میں چھپ کر جان بچائی اور ان پر بھی ایک صالح شخص کو حاکم مقرر کر دیا گیا پھر ۳۶ ہزار برس تک زمین پر امن رہا لیکن ...... اور یہ عمل ایک لاکھ ۴۲ برس تک جاری رہا لیکن جنات کی سرشت تبدیل نہ ہوئی آخر کار اللہ تعالیٰ نے ''عزازیل'' کو فرشتوں کی فوج کے ساتھ زمین پر بھیجا انہوں نے جنات اور دیوؤں کی بڑی تعداد کو قتل کر دیا جو باقی بچے انہوں نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت قبول کر لی (لفرت کعب احبار) آئمہ کرام اس دور کو حضرت آدم کی پیدائش کا سن قرار دیتے ہیں۔

عزازیل حضرت آدم کو سجدہ نہ کرنے کی پاداش میں ''ابلیس'' بنا تو وہ اپنے ۹ بیٹوں کو

ساتھ لے کر زمین پر اتر آیا۔ ''حیوۃ الحیوان'' کے مطابق شیطان نے اپنے بیٹے ہفاف کو صحرا میں شر پھیلانے 'لاقس اور ولہان کو نمازوں کے دوران وسوسے پیدا کرنے 'زلبنور کو جھوٹی تعریف اور جھوٹی قسموں کے لئے اکسانے 'مثر کو ماتم گریبان پھاڑنے اور سینہ کوبی کے لئے تیار کرنے، ابیض کو انبیاء کے دلوں میں وسوسے ڈالنے 'اعور کو زناکاری پر اکسانے، واسم کو گھروں میں فساد ڈالنے اور مطوس کو افواہ سازی پر لگا دیا۔ شیطان کے زمین پر اترنے کے بعد جنات کو اپنے برادر بزرگ کی رہنمائی مل گئی وہ اس کے گرد جمع ہو گئے اس نے تمام جنات اپنے بیٹوں میں تقسیم کر دیئے یوں زمین پر شر، گمراہی اور سفلی طاقتوں کی تاریخ کا آغاز ہو گیا۔

شیطان نے سب سے پہلے بنی قابیل کے کچھ لوگوں کو جنات قابو کرنے کا عمل سکھایا۔ انہوں نے چلہ کشی سے اس سرکش مخلوق پر قابو پا لیا۔ عامل اپنے ان جنات کے ذریعے غائب کے احوال جمع کرتے 'دشمنوں کی کھیتیاں جلاتے، مال مویشی مرواتے، بستیوں میں وبائیں پھیلاتے، لوگوں میں نفسانی خواہشات ابھارتے، گروہوں اور خاندانوں میں غلط فہمیاں پیدا کر کے انہیں لڑاتے اور انبیاء کے خلاف عوامی رائے ابھارتے۔ یہ عامل اپنی ان ''طاقتوں'' کے ذریعے اس وقت کے معاشرے میں بڑے ممتاز تھے لہٰذا وہ مرنے سے قبل اپنے جنات اپنی آل اولاد میں تقسیم کر جاتے یوں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سفلی علوم کے ماہرین کی ایک جماعت الگ ہوتی چلی گئی اور یہی لوگ بعد ازاں کاہن کہلائے۔

حضرت سلیمانؑ تک انسانی تاریخ جنات، دیو، بھوت اور چڑیلوں کی شر انگیزیوں سے بھری پڑی ہے۔ یہ لوگ بلا روک ٹوک انسانی بستیوں میں داخل ہوتے اور تباہی و بربادی پھیلا کر چلے جاتے۔ تیار کھیتیاں اجاڑ دیتے' مال مویشی مار دیتے، گھر کا ساز و سامان توڑ پھوڑ دیتے' خوبصورت خواتین اور مردوں پر اپنا ''سایا'' ڈال کر انہیں اپنا غلام بنا لیتے لیکن حضرت سلیمانؑ کی آمد کے فوراً بعد ان کی کارروائیوں میں کمی آ گئی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمانؑ کو صرف انسانوں پر نبی نہیں بنایا تھا بلکہ جنات سمیت تمام مخلوقات پر حکمران بنا کر بھیجا تھا اور انہوں نے آتے ہی جنات، دیو، پری اور دوسری مخفی مخلوقات کے لئے حدود و قیود طے کر دیں جن کی خلاف ورزی پر ان کو کڑی سزائیں دی جاتی تھیں۔ ان سزاؤں میں سزائے موت، عمر قید، انسانی بستیوں سے ہمیشہ کے لئے جلاوطنی اور جسمانی اذیت بھی شامل تھیں۔ اگر تمام آسمانی کتب اور صحائف ربانی کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت سلیمانؑ ہی انسانی تاریخ کے پہلے

انسان تھے جو پہلی مرتبہ ان مخفی طاقتوں کو انسان کے زیر اطاعت لائے جبکہ ان سے قبل جن، دیو اور چڑیلیں انسانی بستیوں کے لئے ہوا ہوتی تھیں۔ حضرت سلیمانؑ موقع بہ موقع انسانی طاقتوں کا مظاہرہ کر کے جنات کا اعتماد توڑتے اور انہیں ان کی حیثیت کا احساس دلاتے رہتے تھے۔ اس ضمن میں ملکہ بلقیس کا واقعہ بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ سورۃ نمل کے مطابق جب حضرت سلیمانؑ نے سبا کی ملکہ بلقیس کا تخت منگوانے کی خواہش ظاہر کی تو آپ کے دربار میں بیٹھے دیو/جن ''راکھس'' نے کہا میں دربار برخاست ہونے سے قبل آپ کے حضور پیش کر سکتا ہوں لیکن حضرت سلیمان کے وزیر آصف بن برخیا جو انسان (بعض مفسرین انہیں آپؑ کا چچازاد بھائی قرار دیتے ہیں) اور اسم اعظم کے ماہر تھے، نے اپنی روحانی طاقت سے پلک جھپکنے سے قبل تخت حاضر کر دیا۔ جنات پر حضرت سلیمانؑ کے دبدبے کا یہ عالم ہے کہ آج بھی اگر کسی ویران جگہ پر کوئی مخفی مخلوق کسی شخص کو گھیر لے اور وہ حضرت سلیمانؑ کو آواز دے تو وہ بھاگ کھڑی ہوتی ہے۔

کاہنیت کو باقاعدہ پیشے کی شکل مصریوں نے دی۔ دریائے نیل کی وادیوں میں انسانی ہنگاموں سے دور ویرانوں میں کاہنوں کے معبد ہوتے تھے جہاں دور دور سے غرض مند آتے اور کاہن اپنے جنات سے ان کا احوال سن کر بیان کر دیتے اور خوب جی بھر کر سونا چاندی لوٹتے۔ یہ کاہن زر کثیر کے عوض اپنے زائرین کے تمام جائز و ناجائز کام بھی کرتے تھے جن میں دشمن کی نسل کشی، مالی بربادی اور قتل تک شامل ہوتا تھا۔ مصری معاشرے میں کاہنوں کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ مصری خاندان اپنے کاہنوں سے پہچانے جاتے تھے۔ جس کا کاہن مضبوط بااصول اور زیادہ روحانی اثر و رسوخ والا ہوتا اس کی معاشرے میں بڑی توقیر ہوتی لوگ اپنی امارت ظاہر کرنے کے لئے ایک سے زائد کاہنوں سے بھی ربط جوڑتے تھے جبکہ بعض کتب میں آیا ہے کہ قدیم مصر کے شاہی خاندان کے بعض افراد کے پاس پانچ پانچ سو کاہن تھے۔ اس دور میں اگر کوئی کاہن مر جاتا تو اس سے وابستہ تمام خاندانوں میں صف ماتم بچھ جاتی کیونکہ انہیں یقین ہوتا کہ جوں ہی اس واقعہ کی خبر ان کے دشمن کو ہو گی اس کا کاہن ان پر حملہ کر دے گا لہذا کسی کاہن کی بیماری یا بڑھاپے کی صورت میں اس کے ''گاہک'' احتیاطاً دوسرے کاہن کا بندوبست کر لیتے تاکہ اس کاہن کی موت کی صورت میں دوسرا فوراً اس کی جگہ لے لے۔ رہی کاہنوں کی بات تو جس کاہن کے پاس زیادہ جنات، دیو، بدروحیں اور چڑیلیں ہوتیں وہ اعلیٰ اور بلند مرتبت کاہن سمجھا جاتا خود فرعون بھی اپنے درباری کاہنوں کے سامنے اس قدر لاچار تھا کہ ان کی اجازت کے

بغیر کوئی فرمان جاری نہیں کرتا تھا۔

اہل یونان اور بابل کے کاہنوں نے جنات قابو کرنے کا طریقہ مصریوں سے سیکھا اور اس میں علم نجوم، قیافہ اور دست شناسی شامل کر کے اسے دو آتشہ بنا دیا۔ اہل بابل جنات کی تسخیر کا اقرار نہیں کرتے کیونکہ وہاں اسے برا سمجھا جاتا تھا لہذا وہ جنات کے ذریعے حاصل ہونے والی تمام تر معلومات کو علم نجوم اور دست شناسی کے کھاتے میں ڈال دیتے۔ ان کے جنات اس قدر طاقتور تھے کہ وہ لوگوں کا مقدر تک پڑھ لیتے تھے اور کاہن زمین پر چند آڑھی ترچھی لکیریں کھینچ کر تمام کچا چٹھا بیان کر دیتے۔ ان کی اسی دسترس کے باعث اہل بابل پر عذاب اترا اور ان کی چھتیں بنیادوں پر الٹا دی گئیں۔

عربی میں ہر نظر نہ آنے والی چیز کو جن کہا جاتا ہے اسی لئے نظر نہ آنے کی خصوصیت کے باعث بہشت کو ''جنت'' کا نام دیا گیا۔ اہل عرب نے تسخیر جنات کا قاعدہ دجلہ و فرات کے کاہنوں سے سیکھا اور شروع شروع میں یہ بھی ان سے وہی کام لیتے تھے جو دیگر اقوام کے کاہن لیتے لیکن جنات کی ماورائی طاقت سے متاثر ہو کر چند نسلوں کے بعد لوگوں نے ان کی باقاعدہ پرستش شروع کر دی۔ مقاتلؒ کہتے ہیں عرب میں جنوں کی پرستش کا آغاز اہل یمن نے کیا جہاں ابتداً لوگوں نے سفر کے دوران بآواز بلند جنات کی پناہ لینا شروع کر دی وہاں سے یہ عادت قبیلہ بنی حنیفہ تک پہنچی جس کے ایک گروہ نے اسے معمول بنا لیا اور پھر کچھ ہی عرصہ بعد پورے عرب میں جنوں کے نام کی نذر چڑھانے اور نیاز دینے کا رواج پڑ گیا۔ نبی اکرمؐ کی تشریف آوری سے قبل تو یہ صورتحال تھی کہ عرب میں دوران سفر جب کوئی خوفناک مقام آتا، آندھی طوفان یا بارش گھیر لیتی تو اہل قافلہ بآواز بلند کہتے ''ہم اس علاقے کے جنات کے سردار کی پناہ مانگتے ہیں وہ آئے اور اپنے ماتحت جنوں سے ہمیں بچائے۔'' عرب کے تمام لوگ نظر بد سے حفاظت اور جائز و ناجائز کاموں کی بجا آوری کے لئے جنات کے چڑھاوے چڑھاتے اور منتیں مانگتے۔ علامہ بیہقیؒ کا کہنا ہے عرب جب نیا مکان بناتے، زمین خریدتے یا ان کے ہاتھ کوئی خزانہ آ لگتا تو وہ جنات کو خوش کرنے کے لئے جانوروں کی قربانی دیتے تھے۔ عربوں کی ان حرکات کے باعث...... جنات اس قدر متکبر ہو گئے کہ وہ خود کو انسانوں کا بھی سردار سمجھنے لگے اور ان سے وہی سلوک کرنے لگے جو حقیر مخلوقات سے کیا جاتا ہے۔

نبی اکرمؐ کی بعثت سے قبل کاہنوں کے حکم پر جنات آسمانوں تک چلے جاتے تھے جہاں

وہ فرشتوں کی گفتگو سن کر ان میں اپنی طرف سے مبالغہ شامل کرتے اور آ کر اپنے آقاؤں کو بتا دیتے اور کاہن ان معلومات کی بناء پر پیش گوئی کر دیتے جن میں سے کچھ سچ ثابت ہوتیں اور کچھ غلط لیکن جب نبی اکرمؐ پر پہلی وحی اتری تو آسمان کے گرد آگ کا ایک حصار کھینچ دیا گیا جسے عبور کرنا جنات کے بس کی بات نہیں تھی اس روز جو بھی جن آسمان کی طرف بڑھا اسے چنگاریوں نے آ گھیرا اور وہ زخمی ہو کر واپس زمین پر آ گرا۔ اس حادثے نے جنات کی سلطنت میں کھلبلی مچا دی۔ وہ سب بزرگ ابلیس کی طرف بھاگے تو اس نے کہا ہو نہ ہو ضرور زمین پر کوئی بڑا واقعہ پیش آیا ہے تم پوری دنیا میں پھیل جاؤ اور اس کا کھوج لگاؤ (عبداللہؓ بن عباس، مسند احمد) جنات حکم کے مطابق پوری زمین پر پھیل گئے لیکن بڑے عرصے تک انہیں کوئی سراغ نہیں ملا۔ اسی دوران جب نبی اکرمؐ اہل طائف کو دعوت اسلام دینے کے لئے نکلے تو راستے میں ''بطن نخلہ'' کے مقام پر رات بسر کی۔ صبح نماز فجر کے بعد آپؐ تلاوت قرآن مجید فرما رہے تھے تو وہاں سے جنات کے قبیلے نصیبین کے سات جنوں کا گزر ہوا۔ آئمہ کرام ان جنوں کا نام جساد، مسا، شاصرہ، ابن لارب، الامین، الخضم اور آنے لکھتے ہیں۔ ان جنات نے نبی اکرمؐ کو دیکھا تو فوراً ایمان لے آئے۔ (قرآن مجید کی سورۃ احقاف اور سورۃ جن میں اس واقعے کا تفصیل کے ساتھ ذکر ہے) ان جنوں نے اپنے قبیلے میں واپس جا کر نبی اکرمؐ کا تذکرہ کیا اور دوسروں کو بھی ایمان لانے کی دعوت دی۔ اس واقعے کی تصدیق اس طرح بھی ہوتی ہے کہ ایک بار مکہ مکرمہ کے اندر در حجون میں اور دو مرتبہ مدینے کے میدان بقیع وغرقد میں (حضرت عبداللہؓ بن مسعود بھی آپؐ کے ہمراہ تھے) نبی اکرمؐ نے جنات کو درس و تدریس سے قبل حصار کھینچ کر انہیں اس میں بٹھا دیا دوسری صبح حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے میدان میں ۷۰ اونٹوں کے بیٹھنے کے نشان دیکھے۔ ایک بار نبی اکرمؐ اچانک مفقود ہو گئے تو صحابہ کرامؓ پریشان ہو گئے لیکن دوسری صبح آپ کو غار حرا کی طرف سے آتے ہوئے دیکھا گیا، ایک بار مکہ کے اونچے علاقے میں جنات سے ملاقات ہوئی۔ ایک بار مدینہ کے باہر (حضرت زبیرؓ آپؐ کے ساتھ تھے) اور آخری بار ایک سفر کے دوران جب حضرت بلالؓ بن حارث آپ کے ہمراہ تھے۔

بعثت رسولؐ کے بعد جنات کی دنیا میں تین بڑی تبدیلیاں آئیں۔ ایک ان کی مستقبل بیان کرنے کی صلاحیت ختم ہو گئی اور وہ گزرے ہوئے کل اور حال کی باتیں بیان کرنے تک محدود ہو گئے۔ دوسری بڑی تبدیلی یہ آئی کہ ان میں مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت تیار ہو گئی جو نہ صرف

دوسرے جنات کو نیکی کی تلقین کرتی تھی بلکہ صالح مسلمان انسانوں کو ان کے شر سے بھی محفوظ رکھتی اور تیسری تبدیلی خدا پر کامل یقین رکھنے اور نبی اکرمؐ کے عشق کی شمع اپنے سینے میں جلائے رکھنے والے تمام مسلمان ان سفلی طاقتوں کے شر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئے ... اور اب کسی بھی شخص پر کوئی سفلی، غیر مرئی یا ناری مخلوق حملہ کرے تو وہ کسی عامل کی مدد کے بغیر آیت الکرسی، چاروں قل، سورۃ جن یا سورۃ مزمل کی تلاوت شروع کر دے تو وہ فوراً اس سایہ بد سے محفوظ ہو جاتا ہے لیکن اگر ایمان ہی کمزور ہو تو ... تو شاید کلام حق ساتھ نہیں دیتا۔

جناب مجید الحسن جنات کے موکلات اور روحانیت کے ماہر ہیں وہ اپنے عملی تجربے اور روحانی مشاہدے کی بنیاد پر جنات کے بارے میں کہتے ہیں۔

غیر مرئی مخلوق کی چھ اقسام ہیں فرشتے، جنات، دیو، پری، چڑیل اور بھتنے۔ فرشتے نوری مخلوق ہیں لہٰذا وہ تو دائرہ بحث سے ہی باہر ہیں رہی۔ ناری مخلوق تو یہ قبیلوں کی شکل میں رہتی ہے۔ ہر قبیلے کا اپنا سردار اور بادشاہ ہوتا ہے ان کا کوئی سنٹرل نظام تو نہیں لیکن ان کی اپنی بیوروکریسی ضرور ہے۔ ان کے بھی دفتر ہیں۔ سیکرٹریٹ عدالتیں اور جیلیں ہیں۔ ان کے بھی سکول، کالج اور یونیورسٹیاں ہیں، ان میں بھی ہندو، عیسائی، یہودی اور کمیونسٹ ہیں۔ ان میں بھی غنڈے بدمعاش نیک اور بد ہیں۔ ان میں بھی طاقتور کمزور پر ظلم کرتا ہے مثلاً میرے پاس ایک جن تھا وہ ڈیڑھ برس غائب رہا میں نے بہت تلاش کرایا لیکن نہ ملا۔ ایک دن میں نے مراقبہ کیا تو دیکھا اسے ایک چڑیل نے غار میں قید کر رکھا ہے۔

یہ لوگ اُجاڑ، بیابان، کم آباد اور سرسبز و شاداب علاقوں میں رہتے ہیں آپ نے اکثر ویرانوں میں دیکھا ہوگا کہ ایک جگہ بہت صاف ستھری ہے جیسے ابھی ابھی جھاڑو دیا گیا ہے اور یہاں گھاس کا ایک تنکا تک نہیں یہی ان کا ٹھکانہ ہے۔ اس حد میں داخل ہونے، پیشاب کرنے یا تھوکنے والا پوری زندگی ان کے عذاب کا نشانہ بنا رہتا ہے۔ یہ پھولوں کے تیز خوشبودار پودوں اور پکے پھلوں کے درختوں پر بھی ہوتے ہیں لہٰذا بھری دوپہر اور اندھیری راتوں میں ان درختوں کے قریب جانے والے ان کے دام میں پھنس جاتے ہیں۔ ان کے ٹھکانے کی ایک بڑی نشانی خوف ہے۔ آپ کو کسی جگہ پر اچانک خوف آ گھیرے اور اس جگہ سے ہٹنے کے بعد وہ خوف بتدریج کم ہو جائے تو سمجھ لیں وہ جنات کی جگہ تھی۔

اسلام آباد جنات کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ یہاں ہر گھر میں جن رہتے ہیں۔ یہاں جنوں کی دو

بستیاں ہیں۔ ایک بری امام کی طرف وہاں نیک اور مسلم جن رہتے ہیں دوسری سریا چوک کی طرف جائیں تو قبرستان کے قریب یہاں بری چیزیں رہتی ہیں جو رات بارہ بجے کے بعد کتوں، بلیوں، سوروں اور پرندوں کی شکل میں باہر نکل آتی ہیں۔

تمام تر وبائیں چڑیلیں پھیلاتی ہیں۔ ان میں ''املا صبین'' نامی چڑیل دوران حمل بچوں کو معذور بناتی ہے اور باقی عام زندگی میں ان گندی چڑیلوں کے جسم سے بد بو اٹھتی اور وائرس نکلتے ہیں جو فضا میں داخل ہو کر لوگوں کو مریض بناتے ہیں۔ ایک بار میری بچی کو خارش ہو گئی میں نے بہت علاج کرایا لیکن بے سود مجبوراً میں نے عمل کیا تو میرے سامنے چڑیل آ گئی اس کا پورا جسم گلا ہوا تھا اور اس سے سرانڈ آتی تھی۔ میرے پوچھنے پر کہنے لگی ''تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے'' میں نے اپنی طاقتوں کو حاضر کیا تو انہوں نے بتایا کہ تم واقعی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے کیونکہ یہ امرلی سے شہر میں آئی ہے۔ بہر حال میں نے دیکھا وہ جس علاقے سے گزرتی وائرس پھیلاتی چلی جاتی اور اس علاقے کے تمام لوگ خارش کے مریض ہوتے چلے جاتے۔ وہ چھ ماہ تک یہاں رہی کائنات میں ایسی چڑیلیں بھی ہیں جن کے جسم سے ریچھ جیسی بو اٹھتی ہے یہ جہاں سے گزرتی ہیں وہاں سانس کی بیماریاں پھیلاتی جاتی ہیں۔

ہر پانچ چھ برس بعد قدرت ایک مخصوص مخلوق کو چند گھنٹوں کے لئے آزاد کرتی ہے تو یہ چنگھاڑتے ہوئے شہروں کی طرف بھاگتے ہیں جس کے بعد بڑی تیز آندھی آتی ہے' درخت جڑوں سے اکھڑ جاتے ہیں' کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ جاتے ہیں' پول الٹ جاتے ہیں اور زندگی کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اس مخلوق کی واحد نشانی تیز سیٹی کی آواز ہے جو آندھی کے ساتھ ساتھ پورے شہر میں سنائی دیتی ہے۔ اس سیٹی اور آندھی میں ایک خوف ہوتا ہے جسے ہر شخص محسوس کرتا ہے۔ میں نے اس مخلوق کو اکثر دیکھا۔ یہ ہوا میں بازو چلاتے ہوئے آتی ہے اور تباہی پھیلا کر واپس چلی جاتی ہے' اب پتہ نہیں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی کیا حکمت ہے۔

جنات کی شکلیں بالکل انسانوں کی طرح ہوتی ہیں یہ عام آدمی کو نظر نہیں آتے لیکن یہ جب چاہیں کسی بھی شکل میں ظاہر ہو سکتے ہیں۔ جنہیں ہم پہچان نہیں سکتے اس ضمن میں نبی اکرمؐ کا فرمان ہے۔ جنات تین حالتوں میں رہتے ہیں' حشرات الارض کی شکل میں، ہوا میں ہوا کی طرح اور زمین پر بنی نوع انسان کی شکل میں۔ ان کی عمریں بہت طویل ہوتی ہیں' میرے پاس ایک جن آیا اس کی عمر پندرہ سو سال سے زائد تھی اور اسے نبی اکرمؐ کی زیارت کا شرف حاصل تھا' ان کی

تعداد انسانوں سے زیادہ ہے اور یہ دنیا کے تمام خطوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان کی عادات اور معیار بھی انسانوں جیسے ہوتے ہیں۔ شہروں کے جن پڑھے لکھے اور سمجھدار ہوتے ہیں۔ جبکہ دیہات' صحرا اور ویرانوں کے ان پڑھ گنوار' میرے پاس جرمنی سے ایک جن آیا بڑا دانشور اور سائنسی علوم کا ماہر جن تھا مجھے اس سے گفتگو کرتے وقت بڑی دقت ہوئی۔

ان کی خوراک انسانوں جیسی ہوتی ہے۔ یہ لوگ اپنی الگ کاشتکاری' باغبانی اور کیٹل فارمنگ کرتے ہیں۔ بعض شریر جن انسانوں کی چیزیں بھی چرا کر کھا جاتے ہیں لیکن ان کے معاشرے میں اس حرکت کو بہت برا تصور کیا جاتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جو عامل جن قابو کرتا ہے' اس جن کے نان نفقے کی ذمہ داری اس کے کندھے پر آ پڑتی ہے اور وہ سائل سے حاصل ہونے والی رقم سے جن کو بھی کمیشن دیتا ہے' یہ جنات انسانی شکل میں بازاروں سے خریداری بھی کرتے ہیں۔

ہر جن کا ایک کوڈ ورڈ ہوتا ہے۔ یہ ایک لفظ بھی ہو سکتا ہے اور الفاظ کا مجموعہ بھی عامل جن قابو کرنے کے لئے مخصوص وقت مخصوص جگہ پر یہ مخصوص کوڈ ورڈ مخصوص تعداد میں دہراتا ہے۔ ایک تواتر سے یہ عمل کرنے سے جن عامل کے قبضے میں آ جاتا ہے تاہم اس دوران اس عامل کی جان کو بہت خطرہ ہوتا ہے اگر اس کے پیچھے اس کا استاد نہ ہو تو معمولی سی غلطی سے وہ جان سے جاتا ہے یا پاگل ہو جاتا ہے مثلاً ایک جننی ''توت بتوتی'' ہے جب بھی کوئی اسے قابو کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ اس کے سامنے بندے تیل میں بھون کر کھانا شروع کر دیتی ہے' اس دوران اگر عامل ڈر جائے تو یہ اسے فوراً مار دیتی ہے۔

جنوں کے پاس ریڈیائی طاقت ہوتی ہے۔ یہ سارے کام اسی سے لیتے ہیں۔ بہت تیز پرواز کرتے ہیں اور چند ہی سیکنڈ میں مطلوبہ معلومات لے آتے ہیں' میرے پاس ایک دیو ''کرتاس'' ہے' وہ چند سیکنڈ میں جہلم سے ایک بدمعاش جن کو پکڑ کر میرے پاس لے آیا۔ یہ ریڈیائی لہروں سے ایک دوسرے سے لڑتے ہیں۔ طاقتور جن کمزور جن کو جلا کر بھسم کر دیتا ہے' اسی طاقت سے انسانوں کے دماغ پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اسی کے ذریعے بیماریاں پھیلاتے ہیں' یہ علم غائب بالکل نہیں جانتے صرف حال اور گزرے کل کا احوال بیان کر سکتے ہیں۔

عامل ابتداً انہیں آنکھیں بند کر کے دماغ کی سکرین پر دیکھتے ہیں لیکن جوں جوں ان کا مشاہدہ اور علم بڑھتا جاتا ہے توں توں وہ کھلی آنکھوں سے بھی انہیں دیکھ سکتے ہیں۔ تین قسم کے

لوگوں کو تنگ کرتے ہیں ایک وہ جنہوں نے دانستہ یا نادانستہ ان کی "پرائیویسی" خراب کی دوسرے کمزور ایمان اور کمزور نفسیات کے لوگ اور تیسرے وہ خوبصورت مرد و زن جن پر ان کا دل آ جائے کیونکہ جنات بیک وقت مادی اور غیر مادی خصوصیات کے باعث حسن جمال بھی رکھتے ہیں لہٰذا وہ پوری طرح ان جذبات سے عاری نہیں جو انسانوں کا خاصا ہیں۔

• • •

خان لیاقت علی خان

خان لیاقت علی خان کا قتل ہماری تاریخ کا وہ راز ہے جو آج تک نہیں کھل سکا۔ دنیا یہ کہتی ہے جو قوم ۵۵ برسوں میں اپنے پہلے وزیراعظم کے مجرموں کا فیصلہ نہیں کر سکی وہ آئندہ کون سے ستاروں پر کمند ڈالے گی۔ اس مضمون میں اس قتل کی چند گرہیں کھلتی ہیں۔ اس مضمون کی بنیاد ہماری وزارت خارجہ کے ایک ریٹائرڈ سیکرٹری ہیں۔ یہ صاحب روم میں بیگم رعنا لیاقت علی خان کے ساتھ کام کر چکے ہیں۔ بیگم صاحبہ وقتاً فوقتاً ان کے ساتھ اپنی معلومات شیئر کرتی رہیں۔ انہوں نے آگے چل کر یہ معلومات میرے ساتھ شیئر کیں اور یوں یہ مضمون بن گیا۔

* * * * * *

''بیگم رعنا لیاقت علی خان ان دنوں روم میں پاکستان کی سفیر تھیں' حکومت نے خان لیاقت علی خان کے قتل کے بعد ان کے خاندان کے لیے پانچ ہزار روپے وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ یہ رقم اخراجات کے لیے بہت کم تھی لہٰذا ان کی مشکلات کو دیکھتے ہوئے بیگم صاحبہ کو روم میں سفیر لگا دیا' بیگم صاحبہ کو پینے کی عادت تھی۔ میں اس وقت روم کے پاکستانی سفارتخانے میں تھرڈ سیکرٹری تھا' میں فارن سروس کا ایک جونیئر آفیسر تھا۔ بیگم صاحبہ کے جگر پر ورم آ چکا تھا' لہٰذا ڈاکٹروں نے انہیں ''مشروبات مغرب'' سے پرہیز کا پابند بنا دیا تھا۔ ان دنوں ان کی شامیں بڑی اُداس ہوتی تھیں۔ لوگوں سے میل ملاقات بند ہو چکی تھی۔ سفارتی تقریبات میں بھی ہم سے کوئی شخص ان کی بیماری کا بہانہ کر کے نمائندگی کر دیتا تھا' آفس کے اُمور میں بھی وہ کم ہی دلچسپی لیتی تھیں۔ ہاں البتہ وہ ہر شام اپنے گھر کی بالکونی میں ''میز'' سجا کر بیٹھ جاتیں اور ''آنکھوں میں تو دم ہے'' کی تصویر بن کر پانی میں چھپی آگ کو حسرت سے دیکھتی رہتیں۔ ایک روز میں نہایت ہی اہم فائل پر ان کے دستخط لینے کے لئے بالکونی میں داخل ہوا تو وہ مجھے دیکھ کر مسکرائیں اور کرسی منگوا کر مجھے سامنے بٹھا لیا۔ فائل کے مطالعے کے بعد انہوں نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ''مسٹر زکی' جو شخص تو جوانی میں خوشی کے گھونٹ نہیں بھرتا وہ باقی زندگی دکھوں کا پیالہ منہ سے لگائے بیٹھا رہتا ہے۔ تمہارے سامنے دنیا کے بہترین مشروبات پڑے ہیں انجوائے یور سیلف'' لیکن میں نے بڑی شائستگی سے انکار کر دیا ''تو آپ نہیں پیتے؟'' وہ مسکرا کر بولیں' ''جی میں پیتا ہوں لیکن کام کے دوران نہیں۔'' میں نے پھر شائستگی سے کہا۔ ''کوئی بات نہیں آج سے یہ بھی تمہاری آفیشل ڈیوٹی میں شامل ہے۔'' اب میرے لئے انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ پھر یہ معمول بن گیا اور میں اور میرا ایک دوسرا سفارتکار ساتھی ہر شام یہ ''ڈیوٹی'' سرانجام دینے بالکونی میں آتے اور ''خوشیوں'' کے گھونٹ بھرتے رہتے

اور وہ ہمیں حسرت سے دیکھتی رہتیں۔ جب ان کے تئیں ہماری آنکھوں اور کانوں کا ہمارے شعور سے رشتہ کمزور پڑ جاتا تو وہ بولنے لگتیں۔ اپنی ابتدائی زندگی کی باتیں، خان رکن الدولہ شمشیر جنگ نواب رستم علی خان کے دوسرے بانکے سجیلے بیٹے اور اپنے شاندار خاوند کی باتیں، پھر محلاتی سازشوں اور سیاستدانوں کی بے رحمی کے قصے اور جب رات بالکونی میں اترنے لگتی تو وہ اپنے خاوند کے قاتلوں کا ذکر لے بیٹھتیں۔ اس دوران ان کی آنکھیں ہمارے چہرے ٹٹولتی رہتی تھیں۔ مجھے یقین ہے اگر کسی لمحے انہیں ذرا سا بھی شک گزر جاتا کہ ان دو مدہوشوں میں سے ایک نہ صرف پوری طرح حواس میں ہے بلکہ ان کی ایک ایک بات اپنے حافظے کے روزنامچے میں درج کر رہا ہے تو یہ راز ان کے سینے میں ہی دفن رہ جاتا وہ کچھ نہ کہتیں، وہ کبھی نہ بولتیں۔

آتشیں رنگت کے بوڑھے سفارتکار نے ہاتھ کا پنجہ چہرے سے ہٹا کر مجھے دیکھا اور مسکرا کر بولا۔ وہ غلام محمد کو اپنے خاوند کا قاتل سمجھتی تھیں۔ ان کا خیال تھا سکندر مرزا، مشتاق گورمانی اور ایوب خان بھی اس سازش میں برابر کے شریک تھے۔'' وہ اکثر بتاتیں ۱۹۵۰ء کے آخر میں سیکرٹری دفاع سکندر مرزا جی ایچ کیو میں ایڈجوٹنٹ جنرل ایوب خان کے ساتھ وزیراعظم ہاؤس آئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ موسم سرما کے آغاز کی ایک شام تھی۔ خان صاحب ان دونوں کے ہمراہ سٹڈی میں چلے گئے۔ جہاں وہ دو گھنٹے تک پتہ نہیں کیا باتیں کرتے رہے لیکن جب وہ لوگ واپس چلے گئے تو میں نے اپنے میاں کو بڑا مضطرب پایا۔ وہ رات گئے تک قہوہ پیتے رہے اور ڈرائنگ روم میں ٹہلتے رہے۔ ان کی پریشانی دیکھ کر میرا دل خوف سے لرزتا رہا لیکن میرے اندر خان صاحب سے سوال کا حوصلہ نہیں تھا کیونکہ اس قسم کی کیفیت میں وہ مزید گھبرے ہو جاتے تھے۔ صبح فجر کی اذان سے تھوڑی دیر پہلے انہوں نے چونک کر آگے پیچھے دیکھا تو مجھے صوفے پر پریشان پایا۔ وہ مسکرائے اور مجھے مخاطب کر کے بولے'' رعنا تم ابھی تک جاگ رہی ہو'' میں اپنی نشست سے اٹھی اور ان کے قریب جا کر بولی۔'' جب ملک کا وزیراعظم اتنا پریشان ہو کہ اسے رات دن تک کا احساس نہ ہو تو رعایا کیسے سوئے گی؟'' انہوں نے قہقہہ لگایا اور کہا نہیں زیادہ پریشانی کی بات نہیں۔ فوج کے کچھ لوگ ہماری فارن پالیسی سے مطمئن نہیں ہیں، وہ چاہتے ہیں ہم روس کو دوست بنا لیں، یہ لوگ ہمارے مسائل نہیں سمجھتے، بہرحال سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں ذرا وضو کر آؤں۔ میں اگلے چند روز بہت مصروف رہی۔ لہٰذا اس بے چین رات کو بھول گئی لیکن جب جنوری ۵۱ء میں ایوب خان کو اچانک پاک آرمی کا کمانڈر انچیف بنا دیا گیا تو بے اختیار مجھے وہ بے چین

رات یاد آ گئی جب سکندر مرزا اور ایوب خان لیاقت علی خان سے رخصت ہوتے وقت سینے پر ہاتھ باندھ کر رکوع کی حالت میں جھکے تھے اور ان کے جانے کے بعد وزیراعظم نے ٹہل کر ساری رات گزار دی تھی۔ مجھے یقین تھا ایوب خان کی تقرری اور اس رات کا آپس میں کوئی گہرا تعلق ہے۔ رات جب لیاقت علی خان دفتر سے واپس آئے تو میں نے ان کی شیروانی اترواتے وقت اپنے شک کا اظہار کیا وہ مسکرائے اور کہا۔'' میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا'' اور ساتھ ہی وہ وضو کے لئے چلے گئے۔ ابھی انہوں نے عشاء کی نماز پڑھنا تھی۔ پھر میں نے ان سے اس سلسلے میں کبھی بات نہیں کی کیونکہ مجھے پتہ تھا اب وہ اس موضوع پر کوئی بات نہیں کریں گے۔

ٹھیک تین ماہ بعد ہمارے'' نئے آرمی چیف'' نے جنرل اکبر سمیت دوسرے ایسے فوجی اور سول لوگ وزیراعظم کو پیش کر دیئے جو ملک میں اشتراکی فوجی حکومت لانے کے لئے تختہ الٹنے کی سازش کر رہے تھے۔ سکندر مرزا نے'' مجرموں'' کی فائل وزیراعظم کو پیش کرتے ہوئے کہا تھا۔ '' سر دیکھئے ہمارا انتخاب غلط ثابت نہیں ہوا'' خان صاحب نے فائل پکڑتے ہوئے میری طرف دیکھا تو میں بے اختیار مسکرا اٹھی۔ خان صاحب نے نفی میں گردن ہلائی اور سکندر مرزا کو ساتھ لیکر سٹڈی میں چلے گئے۔ چند روز بعد ان'' مجرموں'' کے خلاف پنڈی سازش کیس کے تحت مقدمہ قائم کر دیا گیا۔ فوج نے خصوصی ٹریبونل تشکیل دے کر باقاعدہ سماعت شروع کر دی۔'' پنڈی سازش کیس'' افشا ہونے کے بعد حالات بظاہر ٹھیک ہو گئے لیکن اس کے باوجود مجھے ایوان اقتدار میں سازش کی بو محسوس ہو رہی تھی۔ عوام میں مسلم لیگ کا وقار ختم ہوتا جا رہا تھا۔ بعض وزراء لیاقت علی خان کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔ کچھ مفاد پرست جاگیردار بھی حکومت کا حصہ بن چکے تھے۔ دوسرا میں نے لیاقت علی خان کی ذات میں بھی بعض تبدیلیاں محسوس کیں۔ وہ رات دیر دیر تک جاگتے رہتے، قہوہ پیتے رہتے، بعض اوقات پوری پوری رات نوافل پڑھتے رہتے۔ انہی دنوں سی آئی ڈی کا چیف بھی کثرت سے وزیراعظم ہاؤس آتا رہتا۔ ان تبدیلیوں سے میرا دل بہت گھبراتا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی طوفان میرے گھر کی طرف بڑھ رہا ہے۔ کوئی بھونچال بنیادوں کے نیچے پروان چڑھ رہا ہے، لیکن میں سوائے دعا کے کچھ نہیں کر سکتی تھی، سو وہ میں کرتی رہتی۔

۱۹۵۱ء میں گرمیوں کی ایک شام کو لیاقت علی خان جب دفتر سے واپس لوٹے تو بڑے تھکے تھکے سے تھے۔ انہوں نے آتے ہی وضو کیا اور نماز عصر ادا کر کے لان میں میرے پاس آ کر

بیٹھ گئے۔ میں نے چائے کا کپ تیار کر کے انہیں پیش کیا' وہ خاموشی سے چائے پینے لگے۔ اس شام کراچی میں کچھ زیادہ ہی حبس تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے مالی کیاریوں میں پانی لگا کر گیا تھا لہذا فضا میں حبس کے ساتھ ساتھ گیلی مٹی کی مہک بھی اڑ رہی تھی۔ میں نے خان صاحب کو مخاطب کر کے کہا ''مٹی کی خوشبو کتنی اچھی ہوتی ہے۔''

''ہوں۔'' انہوں نے چونک کر میری طرف دیکھا اور چند لمحوں تک استغراق میں رہنے کے بعد بولے۔ ''ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو' مسز ذکی تم یقین کرو مجھے ان سے اس قدر ٹھنڈے جواب کی توقع نہیں تھی لیکن اس کے باوجود مجھے غصہ نہیں آیا کیونکہ مجھے احساس تھا اس وقت میرے خاوند شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہیں۔ وہ ذہنی خلجان کی حالت میں ہمیشہ خاموش ہو جایا کرتے تھے۔ غصہ انہیں پتھر بنا دیتا تھا۔ وہ چیختے نہیں تھے، بولتے نہیں تھے، اس لمحے ان کا ایک ہی علاج ہوتا تھا۔ تنہائی، خاموشی اور طویل وقفہ اور میں نے ایک اچھے معالج کی طرح برتن سمیٹنے اور ویٹر کو بلانے کی بجائے خود ہی اٹھا کر اندر جانے کا فیصلہ کیا لیکن میں جوں ہی کرسی سے اٹھی، انہوں نے مجھے روک لیا۔

''تم میرے پاس بیٹھو میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں'' میرے خاوند کے لہجے میں کوئی بات تھی جس سے ایک کپکپی سی میری ریڑھ کی ہڈی سے گزر گئی۔ میں بیٹھ گئی تو وہ بڑے طویل وقفے تک خالی کپ ہاتھ میں پکڑے مجھے دیکھتے رہے۔ اسی دوران وزیر اعظم ہاؤس کی مسجد سے مغرب کی اذان سنائی دی تو وہ چونک پڑے اور مجھے مخاطب کر کے بولے۔ ''کچھ لوگ مجھے مارنا چاہتے ہیں۔'' ''مسز ذکی آپ یقین کریں ان کے یہ الفاظ بم کی طرح مجھ پر گرے اور میں چیخ کر کھڑی ہو گئی۔ انہوں نے آگے پیچھے دیکھا اور مجھے اطمینان سے بیٹھ جانے کی ہدایت کی۔ میں کرسی پر ٹک تو گئی لیکن اپنا آپ سنبھالنا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ میں جب ساڑھی کے پلو سے چہرے کا پسینہ پونچھ رہی تھی تو مجھے نہیں پتہ تھا اس میں میرے کتنے آنسو شامل تھے۔ یہ میری ازدواجی زندگی کا پہلا واقعہ تھا۔ جب خان لیاقت علی خان نے مجھ سے کھل کر بات کی تھی۔ ان کے خلاف کون کیا سازش کر رہا ہے؟ کون قاتلوں سے بات چیت کر رہا ہے؟ سازشیوں کے ساتھ کون کون شریک ہے؟ وہ ہر بات کے بعد غلام محمد اور گورمانی کا ذکر کرتے تھے۔ آخر میں انہوں نے مجھے بتایا انہوں نے آج کابینہ کے اجلاس میں غلام محمد اور گورمانی کو بڑی جھاڑ پلائی جبکہ انہوں نے (غلام محمد اور گورمانی) نے مجھ سے صفائی کے لئے کچھ مہلت طلب کی ہے جو میں نے دے دی ہے لیکن میں انہیں جلد ہی

فارغ کر دوں گا۔ ساتھ ہی وہ نماز کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے لیکن میں اسی لان میں بیٹھی رات کے بطن میں اترتی شام کو دیکھتی رہی۔

ستمبر ۵۱ء میں جب لیاقت علی خان نے ملک بھر میں طوفانی دوروں کا پروگرام بنایا تو میں نے انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن ان کا اٹل ارادہ توڑنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ لہذا مجبوراً میں نے حفاظتی نقطہ نظر سے ان کے ساتھ کچھ لوگ لگا دیئے۔ یہ لوگ سائے کی طرح ان کے ساتھ رہتے تھے اور ہر شام مجھے رپورٹ دیتے تھے۔ جب وہ لاہور کے جلسے میں گئے اور کچھ شر پسندوں نے جلسہ الٹ دیا اور ان پر حملہ کیا تو مجھے ان لوگوں نے اطلاع دی کہ آپ خان صاحب کو روکیں ان کے لئے خطرات بڑھتے جا رہے ہیں۔ کچھ لوگ ان کے خلاف خونی سازشیں تیار کر رہے ہیں۔ میں نے لیاقت علی خان کو ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کی لیکن ان پر پاکستان کو دنیا کے بہترین ممالک کی فہرست میں لا کھڑا کرنے کا جنون سوار تھا۔ وہ ملک کے لئے اپنی جان کو حقیر نذرانہ قرار دے رہے تھے۔ میں زچ ہو کر رہ گئی۔ ۱۶ اکتوبر کی صبح جب وہ راولپنڈی جانے کے لئے تیار ہوئے تو بڑے خوش تھے۔ جب وہ سٹاف کار میں بیٹھنے لگے تو میرے دونوں بیٹے اشرف اور اکبر بھی سکول جانے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ انہوں نے بچوں کو پیار کیا تو دونوں ساتھ جانے کے لئے ضد کرنے لگے لیکن خان صاحب نے بڑی شفقت سے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا ''بیٹا پڑھائی پہلے سیر بعد، آپ اس عمر میں صرف سکول جا سکتے ہیں۔'' پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا میں آج قوم کو اپنا رازدار بنا کر سارے دکھوں سے آزاد ہو جاؤں گا۔ میں ان سب کے نام دے دوں گا جو ملک کی جڑیں کاٹنا چاہتے ہیں، تم میرے لئے دعا کرنا'' اور ساتھ ہی وہ سٹاف کار میں بیٹھ گئے۔ گاڑی سٹارٹ ہوئی تو انہوں نے ہاتھ شیشے سے باہر نکال کر ہلایا۔ جواب میں ہم تینوں نے بھی ہاتھ فضا میں لہرا دیئے۔ اس لمحے ہمیں کیا معلوم تھا یہ ان سے ہماری آخری ملاقات ہے۔ ورنہ ہم پورچ میں گاڑی کے ٹائروں کے نشان تکتے رہنے کی بجائے انہیں روک لیتے خواہ ہمیں کچھ بھی کرنا پڑتا۔

اسی شام مجھے اطلاع ملی ہمارا سہاگ اُجڑ گیا ہے۔ میرے بچے یتیم ہو چکے ہیں، لیکن میں روئی بالکل نہیں، کیوں؟ کیونکہ جس شخص کو پوری قوم رو رہی تھی اس کی مرگ میرے آنسوؤں کی محتاج نہیں تھی۔ وہ ہیرو تھا، پوری قوم کا ہیرو۔ معمار، رہنما قائداعظم کے بعد دوسرا قائداعظم۔ لہذا میں اس کی نعش پر ان پڑھ جاہل عورتوں کی طرح آنسو نہیں بہانا چاہتی تھی۔ رجز نہیں پڑھنا

چاہتی تھی۔ بس میں نے اپنے بچے لئے اور خاموشی سے وزیراعظم ہاؤس چھوڑ کر آ گئی۔ غلام محمد گورنر جنرل بن گیا۔ ان کے حواریوں کو بڑے بڑے عہدے مل گئے۔ قوم کو بے وقوف بنانے کے لئے ایک انکوائری کمیشن بنا دیا گیا اور بس۔ میرے خاوند یوپی اور کرنال کے نواب تھے لیکن پاکستان آ کر انہوں نے جائیداد کا کوئی کلیم جمع نہیں کرایا تھا لہٰذا جب وہ شہید ہوئے تو پورے ملک میں ہمارے لیے سر چھپانے کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ رقم وہی تھی جو مرحوم کی اچکن سے نکلی۔ لہٰذا میں نے سوچا بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے کہیں نوکری کر لوں۔ انہی دنوں سکندر مرزا میرے پاس آئے تو میں ان سے بڑی تلخی سے پیش آئی، کیونکہ وہ بھی لیاقت علی کی شہادت کے بعد موقع سے فائدہ اٹھانے والوں میں شامل تھے۔ وہ بڑے تحمل سے میری بات سنتے رہے آخر میں وہ مجھے قائل کر کے غلام محمد کے پاس لے گئے۔ وہ بڑی فرعونیت سے مجھے ملے اور کہنے لگے۔ ''مجھے پتہ ہے آپ کے پاس سر چھپانے کے لئے کوئی جگہ نہیں، کھانے کے لئے کوئی رقم نہیں لیکن میں آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکتا کیونکہ آپ کے خاوند نے کلیم جمع کرانے کا موقع ضائع کر دیا تھا۔'' مجھے بڑا غصہ آیا اور میں انہیں خوب برا بھلا کہہ کر چلی آئی۔ باہر کوریڈور میں سکندر مرزا نے مجھ سے بڑی معذرت کی لیکن میں جواب میں کیا کہہ سکتی تھی، ایک محروم بے آسرا بیوہ کیا کہہ سکتی تھی۔

ایک روز لیاقت علی قتل کیس کی تفتیش کرنے والے اعزاز الدین (اس وقت کے آئی جی سپیشل برانچ) کراچی میں میرے گھر آئے' وہ بڑے وضع دار اور محب وطن شخص تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ قاتل تک پہنچ چکے ہیں۔ اگر وہ چند دن مزید زندہ رہے تو زیادہ دیر تک یہ راز راز نہیں رہے گا۔ میں نے ان سے تفصیلات پوچھیں تو کہنے لگے سید اکبر (لیاقت علی خان کے قاتل) کو سی آئی ڈی کا ایک اہلکار ۱۵ اکتوبر کو ایبٹ آباد سے راولپنڈی لایا تھا۔ ہوٹل کے رجسٹر میں اس اہلکار کا نام بھی درج ہے۔ اسے اس کام کے لئے ۱۵ ہزار روپے دیئے گئے۔ ۱۰ ہزار اس کے گھر اور تین ہزار اس کی جیب سے برآمد ہوئے۔ باقی دو ہزار کا ابھی تک سراغ نہیں ملا۔ ۱۶ اکتوبر کو وہ اور اس کا بیٹا سب سے پہلے پنڈال میں داخل ہوئے اور پہلی قطار میں سٹیج کے بالکل سامنے جا کر بیٹھ گئے۔ اس وقت اس سارے پنڈال کو پولیس اور سی آئی ڈی کے اہلکاروں نے گھیر رکھا تھا پھر اس مشکوک حرکت پر اس سے پوچھ پڑتال کیوں نہیں کی گئی؟ جلسہ شروع ہونے سے پہلے جب سارے پنڈال کی تلاشی لی گئی تو پولیس نے اس کی ''ڈب'' سے پستول برآمد کیوں نہیں کیا؟ خان لیاقت علی خان کے قتل کے بعد جب سید اکبر کے قریب بیٹھے قصاب نے اسے دبوچ لیا تو پھر شاہ محمد اے

ایس آئی نے اسے گرفتار کرنے کی بجائے فوری طور پر گولی کیوں مار دی؟ قتل کے روز غلام محمد اور مشتاق گورمانی راولپنڈی میں ہونے کے باوجود وزیراعظم کے جلسے میں شریک کیوں نہیں ہوئے؟ غلام محمد نے گورنر جنرل بنتے ہی آئی جی پنجاب قربان علی خان کو گورنر بلوچستان کیوں بنا دیا؟ اور پھر موت ہر وقت سائے کی طرح میرا پیچھا کیوں کرتی رہتی ہے؟ روز روڈ پر میری گاڑی کا ایکسیڈنٹ کیوں ہو جاتا ہے؟ چھت کا پنکھا میرے اوپر کیوں گر جاتا ہے؟ سارے سوالوں کے جواب واضح ہیں، بس مجھے ایک ثبوت کی تلاش ہے جو چند روز تک مل جائے گا۔ اس کے بعد میں اپنی رپورٹ اعلیٰ حکام کی بجائے اخبارات کو پیش کروں گا تاکہ مجرموں کو سزا ملنے سے قبل ہی یہ رپورٹ تاریخ کا حصہ بن جائے۔ اعزاز الدین سے اس ملاقات کے بعد میرے خدشات حقیقت کا روپ دھارنے لگے۔ مجھے اپنے خاوند کے قاتلوں کا یقین ہو گیا اور میں بڑی شدت سے اعزاز الدین کی رپورٹ کا انتظار کرنے لگی لیکن چند روز بعد جب اس کی رپورٹ مکمل ہو گئی تو اس طیارے کو اعزاز الدین اور اس کی رپورٹ سمیت ٹائم بم سے اڑا دیا گیا۔ یوں میری آخری امید بھی دم توڑ گئی۔

۵۴ء کے شروع میں سکندر مرزا میرے پاس ملک غلام محمد کا پیغام لے کر آئے کہ ''اگر آپ پسند کریں تو آپ کو سفیر بنا کر بیرون ملک بھیجا جا سکتا ہے۔'' میں نے انکار کر دیا لیکن سکندر مرزا بولے یہ آپ اور آپ کے بچوں کے لئے بہتر ہے کیونکہ یہ لوگ واردات کا ہر نشان مٹا دینا چاہتے ہیں۔ مجھے مسز ڈکی آپ کے سامنے یہ اعتراف کرتے ہوئے کوئی شرمندگی نہیں کہ میں ڈر گئی اور میں نے ان کی یہ آفر قبول کر لی۔ یوں چند ہی روز میں مجھے یہاں روم بھیج دیا گیا۔ جہاں میں اور میرے بچے خطرے سے بہت دور ہیں لیکن کل کلاں غلام محمد' گورمانی' سکندر اور ایوب خان نے بھی مر جانا ہے۔ ان کا اقتدار بھی زوال پذیر ہو گا۔ ان کی فرعونیت بھی ختم ہو گی، تو کیا اس وقت کچھ دردمند لوگ اپنے ہیرو کی موت کی تحقیقات نہیں کریں گے؟ مجھے یقین ہے کبھی نہ کبھی ایسا ضرور ہو گا؟ کیونکہ شہیدوں کا لہو زمین پر جم جایا کرتا ہے اسے کوئی طاقت نہیں مٹا سکتی خواہ اس پر کتنی ہی گرد کیوں نہ پڑ جائے۔ میں تم لوگوں سے اس لئے بات کر رہی ہوں کہ مدہوشی میں سنی یہ باتیں کبھی شعور اگل دے تو شاید ان لوگوں کے کام آ سکیں جو اپنے اس عظیم ہیرو کے قتل پر تحقیقات کریں گے۔''

کمرے میں اندھیرا اتر چکا تھا۔ کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ بس میرے کان آتشی رنگت کے اس بوڑھے سفارتکار کی آواز سن رہے تھے۔ جو سفارتکاروں کی روایتی احتیاط سے سوچ

سوچ کر آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ بات ختم ہوئی تو اندھیرے کا احساس بھی بیدار ہو گیا' وہ اُٹھا اور بلب کا بٹن دبا دیا۔ ساتھ ہی پورے کمرے میں روشنی جاگ اُٹھی۔ ہر چیز چکا چوند ہو گئی' کتابوں کی ساری شلفیں' رسالوں کے سارے ریک اور بوڑھے سنارنگار کی آتشی رنگت جس پر پسینے کے قطرے نجانے کب سے لکیریں بنا رہے تھے۔ پھر اس نے کہا میں نے تمہیں یہ سب کچھ اس لئے بتایا ہے کہ تم میرا نام کسی کو نہیں بتاؤ گے۔ میں نے پوچھا' کیوں؟ تو وہ بولا اس لئے کہ ابھی تک ہماری قوم میں تلخ حقیقتیں سننے کا حوصلہ پیدا نہیں ہوا اور جب تک یہ پیدا نہیں ہوتا ہم جیسے لوگوں کو سچ بولنے کے لئے نام بدلنا پڑیں گے۔

• • •

جس گھر سے مکینوں کا اعتماد اُٹھ جائے اُسے کوئی نہیں بچا سکتا

محب وطن شہریوں کے لئے یوم آزادی پر ایک فکری تحفہ

یہ چند دوستوں کی کہانی ہے جو پاکستان کے یوم آزادی پر ایک دوسرے کے ساتھ اپنے دکھ شیئر کرتے ہیں۔ جب یہ مضمون شائع ہوا تھا تو حکومت نے میرے اوپر غداری کا مقدمہ بنانے کا فیصلہ کیا لیکن مقدمہ بنانے سے پہلے حکومت بدل گئی۔ یوں میں "ہیرو" بنتے بنتے رہ گیا۔ یہ پندرہ برس پرانا مضمون ہے۔ افسوس اس مضمون کے پاکستان اور آج کے پاکستان میں کوئی فرق نہیں۔

......

تو پھر ارشد بولا۔

میں تمہیں بتاتا ہوں میں کیوں واپس امریکہ جا رہا ہوں۔ ہم دو نسلوں سے امریکی ہیں۔ میرے باپ نے ۱۹۵۸ء میں کیلی فورنیا کی ایک کلب ڈانسر سے شادی کر لی اور میں پیدا ہوا۔ میں جو مشرق اور مغرب کے درمیان کڑی ہوں شروع سے مختلف تھا۔ میرا اٹھنا بیٹھنا' کھانا پینا' چلنا پھرنا امریکیوں سے مختلف تھا۔ میری براؤن جلد میری کالی آنکھیں اور میرے سیاہ بال مجھے ان لوگوں میں "مکس اپ" نہیں ہونے دیتے تھے۔ میں وہاں اجنبی تھا بالکل کھجور کے اس درخت کی طرح اجنبی جو پہاڑ پر اُگ گیا ہو یا صحرا میں اُگے چیڑ کی طرح۔ میں نے کیلی فورنیا یونیورسٹی سے الیکٹریکل انجینئر کی ڈگری لی اور پاکستان آنے کا اعلان کر دیا تو میری ماں نے مجھے روک کر کہا تم پاکستانی نہیں ہو' دیکھو میری طرف دیکھو کیا میں تمہیں مشرقی نظر آتی ہوں' اپنی گرینڈ ما اور اپنے گرینڈ پا کو دیکھو کیا وہ تمہیں انڈین نظر آتے ہیں' اپنے باپ کے کاغذات دیکھو وہاں کسی بھی جگہ پاکستان لکھا ہوا ہے لیکن میں ہنس پڑا کیونکہ مجھے پتہ تھا ولایتی گملوں میں اُگنے کے باوجود دیسی پودے پر دیسی پھول ہی کھلتے ہیں اور میں تو سرسوں کا وہ پھول تھا جو میرا باپ جہلم سے اپنے خون میں چھپا لایا تھا۔ قصہ مختصر میں اپنی "اوریجن" کی تلاش میں یہاں آ گیا اس اوریجن کی تلاش میں جسے میرا باپ ۳۰ برس پہلے چھوڑ گیا تھا۔

میں آیا تو میں نے دیکھا' یہ سب لوگ یہاں سے بھاگنا چاہتے ہیں' اس بیل کی طرح جسے کھونٹے سے بندھے بندھے اچانک احساس ہو گیا ہو کہ زندگی اس دائرے سے باہر ہے۔ مجھے ہر شخص کے چہرے پر سراسیمگی نظر آئی جیسے انہیں کسی نے خبر کر دی ہو کہ چند لمحوں بعد بم پھٹنے والا ہے اور جو بھاگ سکتا ہے بھاگ لے' میں روز ایمبیسی روڈ سے گزرتا تو مجھے غیر ملکی سفارتخانوں

کے باہر ایسے سینکڑوں لوگ نظر آتے جن کے لباس سے پسینے کی بو آ رہی ہوتی اور جن کے دانتوں پر رات کے کھانے کی میل جمی ہوتی لیکن وہ قدرت کی مہربانی کے انتظار میں قطار میں کھڑے ہوتے۔ ان سے پوچھا تم کہاں جانا چاہتے ہو تو وہ بولے باہر کسی بھی ملک میں امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وہ نہیں تو برطانیہ، فرانس، جرمنی، اٹلی، چیکوسلواکیہ، یونان، ترکی ادھر نہیں تو جاپان، فلپائن، سنگاپور، ملائشیا، کوریا اور چین، یہاں بھی گنجائش نہیں تو ازبکستان، ترکمانستان، تاجکستان، روس یا یوکرائن بھیج دو، ہم وہاں سے آگے چلے جائیں گے ادھر بھی پابندی ہے تو چلو سعودی عرب، عراق، کویت، ابوظہبی، صلالہ، لیبیا اور مصر ہی سہی ادھر نہیں جانے دیتے تو برازیل، پانامہ، میکسیکو، یا کیوبا جانے دو، وہاں نہیں تو جنوبی افریقہ، نائیجیریا، مراکش اور سوڈان ہی سہی بس ہمیں کسی طرح یہاں سے نکالو خدا کے لئے نکالو کہیں دیر نہ ہو جائے' تمہیں پیسے چاہئیں تو بولو کتنی رقم لاؤں گھر بیچ دوں گا' بیوی کا زیور نیلام کر دوں گا، دکان فروخت کر دوں گا، بوڑھے باپ کی ساری جمع پونجی دے دوں گا بس تم مجھے یہاں سے نکالو، دوستو! میں نے دیکھا اپنے ہی ملک پر اتنا عدم اعتماد کہ امریکہ ویزہ لاٹری کا اعلان کرے اور ملک کے تین کروڑ بالغوں میں سے دو کروڑ اپلائی کر دیں، میں نے دیکھا لوگ امریکی پاسپورٹ حاصل کرنے کے لئے دس لاکھ روپے دینے کے لئے تیار ہیں'' ون ملین روپیز'' میں نے دیکھا ترکی کا ویزہ لگوا کر یونان کے باڈر پر گولی کا نشانہ بن جاتے ہیں لیکن اگلے ہی روز پھر ڈیڑھ سو بندے ترکی ایمبیسی کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔ دوستو! میں پوری دنیا دیکھ چکا ہوں لیکن میں نے کسی جاپانی کو برطانوی کہلاتے نہیں دیکھا، کسی امریکی کو فرنچ کہہ دیں تو وہ مرنے مارنے پر اتر آتا ہے سکاٹش دنیا کے کسی کونے میں چلا جائے وہ سکاٹش ہی کہلائے گا لیکن پاکستانی ہر دوسری قوم میں ضم ہونے کی سر توڑ کوشش کرتا ہے، لوگ اسے امریکی کہیں، برطانوی کہیں، جرمن کہیں، جاپانی کہیں، اس کا سینہ پھول جائے گا' آنکھوں میں چمک آ جائے گی' گردن تن جائے گی پھر وہ دوسرے پاکستانیوں سے کترائے گا کہ کہیں پہچان نہ لیا جائے اور اگر کبھی رنگ و نسل کا سوال آ جائے تو وہ بڑے آرام سے کہے گا'' آئی ایم این ایسٹرن'' اپنے ہی ملک پر اتنا عدم اعتماد۔

میں نے ان لوگوں سے پوچھا تم کیوں جانا چاہتے ہو تو انہوں نے جواب دیا زندہ رہنے کے لئے کیونکہ ہمیں پتہ ہے اس ارض پاک کی حدود ختم ہوتے ہی ہمیں انسان سمجھا جائے گا۔ کوئی نیم اور خواندہ سپاہی ہمیں چوک پر بے عزت نہیں کرے گا۔ بغیر سرچ وارنٹ کے پولیس کی

پوری گارڈ ہمارے گھر داخل نہیں ہو گی۔ ہمیں بغیر چالان جیلوں میں بند نہیں کیا جائے گا۔ کوئی ہمیں بیچ سڑک روک کر نکاح نامہ طلب نہیں کرے گا۔ ہمیں ہسپتال جانے کے لئے سفارشی رقعے کی ضرورت نہیں ہو گی۔ میرے بچوں کو بغیر تردد تعلیمی اداروں میں داخلہ ملے گا۔ میرٹ پر انہیں ملازمت ملے گی جب تک ہم بے روزگار رہیں گے ہمیں وظیفہ ملے گا' رہنے کے لئے گھر اور کھانے پینے کے لئے وافر ضروریات زندگی ملیں گی، کوئی ہم پر جھوٹا استغاثہ نہیں کرے گا، ہم انصاف کے لئے مارے مارے نہیں پھریں گے۔ وہاں صدر، وزیراعظم، وزراء اور گورنر کے لئے سڑکیں بلاک نہیں ہوں گی، وہاں سیاسی نمائندوں سے ملاقات کے لئے سارا سارا دن دھوپ میں کھڑا نہیں ہونا پڑے گا، وہاں کوئی میرے گھر' میری دکان میرے پلاٹ پر قبضہ نہیں کرے گا۔ وہاں میں جتنا کام کروں گا مجھے اتنے پیسے ملیں گے اور میرا مالک دوران ملازمت میری عزت نفس پر حملہ نہیں کرے گا تو ہم یہاں سے کیوں نہ چلے جائیں جو ملک ہمارے حقوق پورے نہیں کرتا جو ہمیں تحفظ نہیں دیتا جو ہماری عزت نفس کی حفاظت نہیں کرتا اسے ہم چھوڑ کیوں نہ دیں۔

دوستو! میں نے انہیں کہا وہاں تم لوگ نسلوں تک اجنبی رہو گے۔ تمہارا ثقافتی بعد، تمہارے رنگ و نسل کا فرق، تمہارا طرز فکر تمہیں اس معاشرے میں حل نہیں ہونے دے گا تم ہمیشہ منفرد رہو گے الگ تھلگ'' آسولیٹ'' تو انہوں نے کہا ہم یہاں بھی تو آسولیٹ ہیں، اجنبی، تنہا، شودر جو صرف ووٹ دینے اور کڑھنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں، جہاں قانون ہمارا نہیں، پولیس ہماری نہیں، زبان ہماری نہیں، حکمران ہمارے نہیں اور نظام ہمارا نہیں وہ ملک ہمارا کہاں ہے؟ تم ذرا غور کرو تو ہم تمہیں غدار وطن نہیں لگیں گے ہم اپنا ملک چھوڑ کر نہیں جا رہے بلکہ اجنبی لوگ ایک اجنبی جگہ چھوڑ کر دوسری اجنبی جگہ جا رہے ہیں؟

لاہور کی مال روڈ پر جب ہجوم نے دکانوں کے شیشے توڑنا شروع کر دیئے تو میں نے چند لوگوں کو روک کر کہا، تم اپنی ہی پراپرٹی کو نقصان کیوں پہنچا رہے ہو تو انہوں نے قہقہہ لگا کر کہا، ہماری پراپرٹی، یہ بینک ہمارا تو نہیں، یہ شاپنگ مال تو اے کریم بخش والوں کا ہے' کتابوں کی یہ دکان میاں فیروز کی آل اولاد کی ہے اور یہ پٹرول پمپ حکومت کا ہے، ان میں کون سی عمارت ہماری ہے؟ ہمیں بتاؤ ان میں سے تم کس پراپرٹی کو ہماری کہتے ہو جو پاکستانیوں کی ہے، ہم جیسے شہریوں کی ہے یہاں تو جس کے پاس چند لاکھ ہیں، وہ آقا ہے اور باقی سب غلام، آداب عرض ہے حضور کا اقبال بلند ہو کورنش بجا لاتے ہیں اور بس یہ ہیں ہم۔

اور اے صحافی، ارشد نے رندھی آواز میں کہا، جاؤ اپنے اس دانشور سے پوچھو جو کبھی تمہارے ایک حکمران کا دست راست تھا اور اب وہ گھر میں بیٹھ کر صرف کتابیں پڑھتا ہے اور شام کو واک کے دوران اسے جب کبھی کوئی ہمدرد مل جائے تو وہ اس سے دنیا کے حالات سن سن کر کڑھتا رہتا ہے لوگ اسے الطاف گوہر کہتے ہیں، جاؤ اس سے ملو اور اس بوڑھے پروفیسر کا احوال سنو جسے چند ماہ قبل کراچی میں پولیس بیٹے سمیت گھر سے اٹھا لے گئی تھی، ان کی آنکھوں پر ان ہی کی قمیصیں بندھی ہوئی تھیں۔ پھر جب انہیں مجرموں کی قطار میں کھڑا کر دیا گیا تو ایک ان پڑھ اے ایس آئی نے اس بوڑھے پروفیسر کی چھاتی پر انگلی سے دستک دے کر کہا او بڈھے تم کیا کرتے ہو؟ اور اس بوڑھے پروفیسر نے برتی آنکھوں سے کہا "میں یونیورسٹی میں پڑھاتا ہوں۔" "تو تم لڑکوں کو نقل کراتے ہو" اس وقت اے ایس آئی کی انگلی اس کی شکن آلود پیشانی پر تھی اس تضحیک پر اے ایس آئی کے پیچھے کھڑے اہلکاروں نے قہقہہ لگا کر اپنے افسر کو داد دی تو اے ایس آئی نے اس بوڑھے پروفیسر کے گرد چکر لگا کر کمال شہنشاہیت سے ہوا میں ہاتھ لہرا کر کہا، جاؤ تمہاری جان بخش دی لیکن پروفیسر چکوال کے اس نوجوان اے ایس آئی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اس اے ایس آئی نے کبھی کسی کالج کا منہ نہیں دیکھا ہو گا، اپنے کسی تائے چاچے یا بھائی کی "کوششوں" سے اس عزت و عظمت کا مالک بن گیا ہو گا، اس اے ایس آئی نے رعونت سے کہا کیوں اب کیا تکلیف ہے؟ بوڑھے پروفیسر نے کانپتے ہوئے کہا حضور میرا بچہ بے گناہ ہے، اے ایس آئی سامنے کھڑے اس نوجوان کی طرف مڑا، اے ایس آئی نے اس کے گرد ایک چکر لگایا اور پروفیسر کی طرف مڑ کر کہا یہ تو مجھے کوئی دہشت گرد لگتا ہے اس سے تو تفتیش کرنا ہو گی تم چلے جاؤ اور پھر وہ بوڑھا پروفیسر ساری رات تھانے کے باہر سردی میں اکڑوں بیٹھا رہا اور اندر تفتیش ہوتی رہی۔ صبح جب اس کا بیٹا تھانے سے باہر آیا تو وہ اپنی ٹانگوں پر کھڑا نہیں ہو سکتا تھا لیکن اس کٹے پھٹے بیٹے کو دیکھ کر بھی بوڑھے پروفیسر کے چہرے پر بہاری گزر گئی اور وہ گھر تک تشکر آمیز نگاہوں سے آسمان کو دیکھتا رہا کیوں؟! اے صحافی صرف اس لئے کہ اس کا بیٹا ان چند خوش قسمتوں میں سے ایک تھا جو اس تھانے میں گئے اور "پولیس مقابلے" میں مارے جانے سے بچ گئے۔ گھر کی دہلیز عبور کرتے ہوئے پروفیسر نے سوچا چند چوٹیں ہی تو ہیں تھوڑے ہی عرصے میں ٹھیک ہو جائیں گی شکر ہے اس کی جان تو بچ گئی لیکن وہ پروفیسر بڑا بے وقوف تھا جو یہ تک نہ جان سکا کہ جان ہی تو نہیں بچی وہ جوان بیٹا اپنی تمام تر عزت نفس کے ساتھ حب الوطنی اور نظریہ پاکستان بھی وہیں تھانے میں چھوڑ

آیا تھا۔ جہاں اسے صرف اس جرم کی سزا ملی کہ ۴۷ برس پہلے اس کے بزرگ اپنا سب کچھ یوپی میں چھوڑ چھاڑ کر یہاں آ گئے تھے...... اور وہ تمہارا دانشور جب بھی کسی کو یہ قصہ سناتا ہے تو آخر میں اپنا چشمہ صاف کرتے ہوئے کہتا ہے "پرندہ تو مر گیا لیکن چٹان پر بہے لہو کے نشان ابھی نہیں مٹیں گے۔" اور اگر پھر بھی یقین نہ آئے تو مری روڈ کے اس شوروم میں جھانک کر دیکھو جس کے سامنے ایک نوجوان گاڑیاں صاف کرتا نظر آئے گا جس نے دس دن سے شیو نہیں بنائی، جس کے کپڑوں پر انجن آئل کے دھبے لگے ہیں اور جس کے سیاہ ہاتھوں سے مٹی، کیچڑ اور پٹرول کی بو آتی ہے۔ اس لڑکے نے تمہارے ملک کی سب سے بڑی یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری لی تھی اور جب اسے "نظام" نوکری نہ دے سکا تو وہ حالات کی چوکھٹ پر آ گرا۔ اگر یقین نہیں تو اپنے ہی دفتر کے اس شخص سے پوچھ لو جس نے اسے ڈگریوں کا لفافہ واپس کرتے ہوئے کہا تھا "ہمیں افسوس ہے ہمارے پاس آپ کے شایان شان کوئی نوکری نہیں" اور جب اتفاقاً وہ شخص اس شوروم میں گیا تو اس نوجوان نے اس کا دامن پکڑ کر کہا "جناب دیکھئے میں نے بالآخر اپنے شایان شان نوکری تلاش کر ہی لی" اور اب وہ شخص جب کسی کو یہ قصہ سناتا ہے تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور پلکیں اعتراف گناہ میں آنکھوں پر گر جاتی ہیں اور اگر تم پھر بھی ان حقائق کو سنی سنائی باتیں سمجھو تو جاؤ نو لاکھ نو ہزار چھ سو چھیانوے مربع میل پر پھیلے اس وسیع و عریض ملک کے کسی شہر میں داخل ہو جاؤ وہاں تمہیں ایسے مایوس لوگوں کی وسیع تعداد ملے گی جو اپنی لاشیں اپنے ہی کندھوں پر اٹھائے گلیوں بازاروں میں نوحہ کناں ہیں۔

مجھے پتہ ہے تم لوگ یقین نہیں کرو گے کیونکہ آسودگی تمہارے گھروں کی دیواروں میں بسی ہے اور آشتی اور فراوانی تمہاری زندگی کا حصہ ہے۔ کافی تمہارا مشروب، سنابری اور چیری تمہارا پھل، حاملہ عورت کی طرح پھولی کپڑوں کی الماریاں، درجنوں جوتے اور نئے ماڈل کی عورتیں اور گاڑیاں تمہارا طرز معاشرت ہے اور یہ وہ عینک ہے جس سے سب ہرا ہی نظر آتا ہے پھر تم یقین کیوں کرو گے؟ لیکن اس کے باوجود میری بات پر یقین کر لو میں تمہارا ہمدرد ہوں کیونکہ میں تمہارا سیاسی مشیر نہیں، میں رکن پارلیمنٹ نہیں، میں کوئی سیکرٹری نہیں، میں نے الیکشن نہیں لڑنا پھر میں جھوٹ کیوں بولوں گا دیکھو صرف ایک بار بازار میں نکل کر دیکھو تو تمہیں پھلوں کی ریڑھیوں پر ایسے درجنوں لوگ نظر آئیں گے جو صرف ریٹ پوچھ کر واپس چلے جائیں گے، تمہیں نچلے درجے کے ہوٹلوں میں ایک پلیٹ پر دو دو تین تین بھوکے نظر آئیں گے، تمہیں شاپنگ پلازوں کے باہر ایسے

سینکڑوں لوگ ملیں گے" پراس چٹ" پڑھ کر گھر چلے جانا جن کا مشغلہ ہے تم اگر یہ بھی نہیں کر سکتے تو جاؤ رات کو کسی سڑک پر ٹائر بدلنے کے لئے رک جاؤ اور جب کوئی شخص پستول کی نالی تمہاری گردن پر رکھ دے تو اس کی آنکھیں پڑھو جو تمہاری سجی سجائی عورت کی بجائے اس کے گلے میں لٹکے ہار پر مرکوز ہونگی اور اس کی انگلیاں جب تمہاری بیوی کی طرف بڑھیں گی تو ہار پر آ کر رک جائیں گی کہ بھوک جنس سے بڑا جذبہ ہے۔

یہ چند لوگ نہیں کہ تم انگلیوں پر گن لو یہ کروڑوں ہیں جن کو سنبھالنا کسی کے بس کی بات نہیں۔ یہ قطرے نہیں کہ تمہارے ہتھیلی پر ہی خشک ہو جائیں' یہ سمندر ہیں جو بوتل میں بند نہیں ہو سکتے۔ یہ لوگ بڑے طاقتور ہیں انہیں اپنا دوست بنا کر رکھو کہ محاذ پر فوجی صرف اس وقت جان کا نذرانہ پیش کرتا ہے جب اسے یقین ہو پیچھے اس محاذ سے بہت پیچھے لاکھوں لوگ اس کی شجاعت کے گیت گا رہے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جو جب بگڑتے ہیں تو جرنیل ڈھاکہ کے میدان میں دشمن کے کمانڈر کو سلیوٹ کر کے اپنی بندوقیں پیش کر دیتے ہیں، یہ لوگ بڑے ظالم ہیں جب نظام سے تنگ آ جائیں تو سوویت یونین جیسا کوہ گراں بھی ان کے سامنے نہیں ٹھہرتا' ان لوگوں کو یہاں سے نکل جانے دو' کوئی سعودی عرب جا کر آباد ہو جائے' کوئی کوریا اور کوئی یورپ' نہیں تو یہ لوگ تمہیں نہیں بخشیں گے۔ تمہارے فوجی محاذ پر پہنچنے سے پہلے ہی ان کے ہاتھوں مارے جائیں گے۔ تمہاری پولیس کو یہ کچل کر رکھ دیں گے اور تمہاری انتظامیہ ان کے سامنے کان پکڑ کر بیٹھ جائے گی اور اگر یہ سب کچھ نہ ہو سکا تو یہ کسی "ایسٹ انڈیا کمپنی" کو دعوت دے دیں گے کہ آج سے پونے دو سو سال پہلے مہاجنوں کے ڈسے، جاگیرداروں کے ستائے اور آقاؤں کے ہاتھوں کچلے لوگوں نے انگریز کو "کالی کٹ" کی بندرگاہ سے اٹھا کر دہلی پہنچا دیا تھا۔

دیکھو میری فلائٹ بالکل تیار ہے میں اگلے چند گھنٹوں میں یہاں سے دور چلا جاؤں گا اور پھر میرا اس زمین سے کوئی رشتہ کوئی ناطہ نہیں رہے گا۔ میرے باپ نے دوبار ہجرت کی ایک بار ۱۹۴۷ء میں اور دوسری بار ۱۹۵۸ء میں۔ وہاں کیلی فورنیا میں بیٹھ کر وہ پوری زندگی یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اس کا اپنا وطن کون سا ہے کرنال جہاں وہ پیدا ہوا یا جہلم جسے وہ چھوڑ کر چلا آیا۔ مجھے یقین ہے یہ فیصلہ اس کا باپ بھی نہیں کر سکا ہو گا جو پانی پت سے آ کر کرنال آباد ہوا تھا اور اس کا باپ دادا یا پردادا بھی نہیں جو بابر کے ساتھ فرغانہ سے پانی پت آیا اور فرغانہ سے آگے بھی تو دنیائیں ہیں جہاں انسانی نسل کی کڑیاں ابھی تک رزق خاک نہیں ہوئیں، میں چاہوں تو وہاں اپنے خون کے

آثار تلاش کر سکتا ہوں لیکن میں ایسا نہیں کروں گا کیونکہ یہ بے وقوفی ہے انسان جوں جوں ماضی میں اترتا ہے زمین آگے آگے سرکتی چلی جاتی ہے لہٰذا انسان کو تھک ہار کر کہیں نہ کہیں رکنا پڑتا ہے۔ زمین کے کسی نہ کسی ٹکڑے کو اپنا وطن قرار دینا پڑتا ہے اور وہ وطن کون سا ہوتا ہے؟ جہاں اس کے ہم نسل، ہم زبان اور ہم خیال لوگ زیادہ ہوں، گویا نظریہ اور ثقافت ہی وطن ہوتے ہیں لہٰذا نا سمجھو زمین کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی یہ ہمارا نظریہ ہماری فکر اور ہماری سوچ ہوتی ہے جو ہمیں ایک قطعہ ارض پر ثابت قدم رکھتی ہے لیکن جب سوچ اڑ جائے نظریہ دم توڑ دے اور فکر بکھر جائے تو وطن زمین کا ایک ٹکڑا بن کر رہ جاتا ہے' رہے تو رہے نہ رہے تو نہ رہے۔

"جاؤ ان لوگوں سے کہہ دو" ارشد دم لینے کے لئے رکا' اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور اس کے سرخ وسپید چہرے پر پسینہ شبنم بن کر چمک رہا تھا۔ ان لوگوں سے جو ہر پانچ برس بعد کاٹن کے سفید سوٹوں پر سیاہ ویسٹ کوٹ پہن کر ملک کے سب سے بڑے ادارے میں آ جاتے ہیں اس سے کہو" تم لوگ ہو اس کے ذمہ دار، تم ہی وہ لوگ ہو جو خربوزے کو اوپر سے بھی کاٹ رہے ہو اور نیچے سے بھی۔ بیوہ کے سیاہ لباس کے بھی تم ہی ذمہ دار ہو اور آسمان کے ٹوٹتے ستاروں کے مجرم بھی تم، ان کو سمجھاؤ کہ جب لوگ نہ رہیں تو زمینیں بنجر ہو جاتی ہیں اور درخت پھل دینا بند کر دیتے ہیں اور بنجر زمینوں اور بے پھل درختوں کا کوئی نظریہ نہیں ہوتا' کوئی وطن نہیں ہوتا ... اور ہاں حاکم وقت سے کہہ دو جب بھی آسمانوں سے عذاب اترتے ہیں تو تمام تر ذمہ داری تخت و تاج پر ہوتی ہے اسے یہ بھی کہہ دو کہ پریشر ککر کی نلکی بند ہو چکی ہے لیکن آگ مسلسل جل رہی ہے یہ آگ نہ بجھی تو دھماکہ ہو گا ... اور پھر تم کہاں جاؤ گے۔ پیرس، لندن، جنیوا، فرینکفرٹ یا نیویارک لیکن تم وہاں کیا ہو گے، معمولی سے پناہ گزین! یا شاہ ایران کی طرح پردیس میں تمہارا بھی ایک تنگ و تاریک ویران اور اداس سا مرقد ہو گا اور اس پر دن رات مسلح گارڈز کا پہرہ ہو گا۔ یاد رکھو جو لوگ خلق خدا کے لئے زندگی کا حلقہ تنگ کر دیتے ہیں زمین ان کی لاشوں کو پناہ نہیں دیتی۔

قارئین کرام آپ کو یوم آزادی مبارک ہو۔

• • •

حکمرانوں کے روحانی بابے

۱۹۹۶ء میں اخبارات میں ایک چھوٹی سی خبر شائع ہوئی "بے نظیر بھٹو اقتدار میں دوام کے لیے پیر تنگ کی درگاہ پر گئیں جہاں پیر صاحب نے چھڑیاں مار کر انہیں لمبے اقتدار کی بشارت دے دی۔" میں نے یہ خبر پڑھی تو سوچا 'کیا بے نظیر پاکستان کی پہلی حکمران ہیں جو اس روحانی مغالطے کا شکار ہیں یا دوسرے حکمران بھی اس نفسیاتی کمزوری میں مبتلا تھے۔ میں نے اس نقطے سے تحقیق شروع کی تو پاکستان کے زیادہ تر سابق اور موجودہ حکمران اپنی تمام نفسیاتی اور روحانی کمزوریوں کے ساتھ میرے سامنے آ گئے۔ یہ مضمون بھی آپ کی نذر ہے۔

.....

۴۰ برس پہلے کی بات ہے۔

گورنر جنرل غلام محمد سے ایک دن ان کی چہیتی پرائیویٹ سیکرٹری مس روتھ بورل نے بے باکی سے پوچھا "سر مجھے آپ میں حکمرانوں والی کوئی بات نظر نہیں آتی 'فالج سے آپ چل پھر نہیں سکتے، بول آپ نہیں سکتے' کھانے کے دوران لقمے آپ کے منہ سے گر جاتے ہیں..... تو پھر آپ اتنے برسوں سے اس ملک کے حکمران کیسے چلے آ رہے ہیں — میں بہت حیران ہوں" غلام محمد مسکرائے اور اپنے تکیے کے نیچے سے ایک بوسیدہ بلیک اینڈ وائٹ تصویر نکال کر مس بورل کے ہاتھ میں پکڑا دی اور اپنی جناتی زبان میں بولے (جسے صرف مس بورل ہی سمجھ سکتی تھی اور ہر قسم کی محفلوں میں گورنر جنرل کی ترجمانی کا فریضہ سرانجام دیتی تھی) صرف اس شخص کی وجہ سے! مس بورل نے غور سے تصویر دیکھی اور پوچھا "سر یہ کون ہیں؟" غلام محمد نے تصویر واپس لی اور عقیدت سے ہونٹوں اور آنکھوں سے لگا کر بولے۔ "یہ میرے مرشد ہیں۔"

گورنر جنرل غلام محمد حاجی وارث شاہ سے بہت عقیدت رکھتے تھے، حاجی وارث شاہ صاحب لکھنؤ کے نزدیک "دیوا شریف" میں مدفون ہیں۔ غلام محمد کے بقول ان کی زندگی پر پیر آف دیوا شریف کا بڑا اثر رسوخ تھا اور انہوں نے زندگی میں جتنی بھی ترقی کی اس کے پیچھے حاجی صاحب کا ہی ہاتھ ہے۔ پیر دیوا شریف ۲۰ ویں صدی کے شروع میں انتقال کر گئے۔ تقسیم سے قبل غلام محمد ان کے مزار پر اکثر حاضری دیا کرتے تھے۔ جب وہ گورنر جنرل بنے تو پیر آف دیوا شریف کا ایک متولی گورنر جنرل ہاؤس میں آ کر بس گیا' غلام محمد کے بقول یہ متولی باباجی اور ان کے درمیان "رابطے" کا ذریعہ ہے اور انہیں کسی بھی کام سے قبل مراقبے کے ذریعے باباجی سے مشورہ لے کر بتاتا ہے۔ اس دور میں پاکستان کے "مقدر" کے کئی اہم فیصلے اسی متولی کے مراقبوں سے سرانجام پائے۔ ان اہم فیصلوں میں اسمبلیوں کی برخاستگی اور کابینہ کے متعدد وزراء کی برطرفی جیسے

''معمولی'' کارنامے بھی شامل ہیں۔ غلام محمد اقتدار کے آخری دنوں میں نیم پاگل ہو گئے تھے۔ وہ روز صبح سوٹ بوٹ پہن کر گورنر جنرل ہاؤس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھتے اور ہاؤس کے سٹاف کو جمع کر کے اس کی ایک مصنوعی کابینہ بناتے اور اس میں پورٹ فولیو تقسیم کرتے رہتے تھے۔ اس وقت اسی متولی نے باباجی کی ''ناراضگی'' کا اعلان کیا اس اعلان کے چند روز بعد غلام محمد سکندر مرزا کے ہاتھوں اقتدار ہار کر کلفٹن میں اپنی بہن کے گھر شفٹ ہو گئے، ان کے ذاتی معالج کرنل سرور اکثر لوگوں کو بتایا کرتے تھے کہ غلام محمد اپنی زندگی کے آخری دنوں میں انہیں بلا کر کہتے تھے سرور میں طیارہ چارٹر کرا کے دیوا شریف جانا چاہتا ہوں شاید میری حاضری سے باباجی ''راضی'' ہو جائیں مگر زندگی نے انہیں اس کی اجازت نہیں دی لیکن زندگی بھر حاجی وارث شاہ کی تصویر غلام محمد کے سرہانوں کے نیچے یا سامنے تپائی پر رہی اور انہوں نے زندگی کے ہر اہم اور غیر اہم فیصلے پر حاجی صاحب کو ''شامل حال'' رکھا۔

ایوب خان نے مارشل لاء لگایا تو ان دنوں ڈیفنس ہاؤسنگ سکیم کراچی میں ایک خاتون عطیہ (ابھی زندہ ہے) رہتی تھی یہ Seer تھی اور ہونے والے واقعات کو قبل از وقت دیکھ لیتی تھی، اس خاتون نے اپنی نجی محفلوں میں کہنا شروع کر دیا۔ ''اس بے وقوف پٹھان کو بتا دو میں اس کی لاش کو گولیوں کی باڑ پر دیکھ رہی ہوں'' یہ بات اڑتے اڑتے ایوب خان کے کانوں تک پہنچ گئی تو انہوں نے قدرت اللہ شہاب کو عطیہ موجود کے پاس بھیجا۔ عطیہ نے شہاب کو بتایا فلاں تاریخ کو فلاں ریل گاڑی میں مجھے تین چار بیگمات نظر آ رہی ہیں، ان کے حلیے یہ ہیں، یہ بیگمات ایوب خان کو قتل کرنے کے لئے بھیجی جا رہی ہیں۔ قصہ مختصر عطیہ موجود کی بتائی گئی تاریخ کو ٹرین پر چھاپہ مارا گیا تو واقعی اس میں چار بیگمات سوار تھیں انہیں گرفتار کر کے تفتیش کی گئی تو انہوں نے انکشاف کیا سکندر مرزا نے انہیں ایوب خان کو راستے سے ہٹانے کے لئے بھیجا ہے۔ پھر اسی رات گورنر جنرل ہاؤس کو آرمی نے اپنے قبضے میں لے لیا اور سکندر مرزا کو گرفتار کر کے کوئٹہ بھیج دیا گیا اس واقعہ کا ایوب خان کے ذہن پر بڑا اثر ہوا اور وہ زندگی بھر جوتشیوں، اہل کشف، بزرگوں، پیراسائیکالوجیکل پاورز کے مالک لوگوں اور ''بابوں'' میں دلچسپی لیتے رہے۔

ان دنوں امریکہ میں جین ڈکسن کا بڑا شہرہ تھا۔ اس خاتون کا دعویٰ تھا کہ جب وہ کسی سے ہاتھ ملاتی ہے تو اس شخص کا ماضی، حال اور مستقبل آشکار ہو جاتا ہے۔ امریکی صدر جان ایف کینیڈی کے قتل کے بارے میں اس کی پیش گوئی ان دنوں چہار دانگ عالم میں گونج رہی تھی۔ اس پیشین گوئی میں جین ڈکسن نے کینیڈی کے قاتل کے نام کے ابتدائی حروف بھی بتا دیئے تھے۔

صدر ایوب خان جین ڈکسن کی اس شہرت سے بہت متاثر تھے چنانچہ جب وہ امریکہ کے دورے پر گئے ان کی خواہش پر جین ڈکسن سے ملاقات کا اہتمام کیا گیا۔ جین ڈکسن نے ایوب خان کا ہاتھ پکڑا کر آنکھیں بند کیں اور بولنا شروع کر دیا۔ دروغ برگردن راوی جین ڈکسن نے ایوب خان کو بتایا'' تم ۱۸ء تک اقتدار میں رہو گے۔ تمہاری بے دخلی اتنی بدترین ہوگی جتنے تمہارے اقتدار کے دن شاندار۔ تمہارے اقتدار کے بعد بھی بھارت سے پاکستان کی ایک جنگ ہوگی جس میں تمہارے ملک کو بہت نقصان پہنچے گا۔ کشمیر اس صدی کے آخر تک آزاد ہو جائے گا لیکن کشمیری پاکستان کے ساتھ الحاق کی بجائے خود مختاری کو زیادہ اہمیت دیں گے وغیرہ وغیرہ۔ عینی شاہدوں کا کہنا ہے ایوب خان نے اس ملاقات کا بڑا اثر لیا اور وہ اپنی نجی محفلوں میں جین ڈکسن کا اکثر ذکر کیا کرتے تھے، اس ذکر سے صاف محسوس ہوتا تھا وہ جین ڈکسن کی پیش گوئیوں سے خائف ہیں... اس واقعے کے بعد بھی ایوب خان زندگی کے اہم موڑوں پر جین ڈکسن سے مشورے لیتے رہے۔

خوشاب کے ایک وکیل عبدالغفور صدر ایوب کو ایوان صدارت میں خط لکھتے تھے۔ ان صاحب کا کہنا تھا کہ بعض طاقتوں نے ان کی ڈیوٹی لگائی ہے اور وہ یہ ناگوار ''فرض'' ادا کرنے پر مجبور ہیں۔ عبدالغفور نے اپنے پہلے خط میں لکھا ''محترمی ارباب بست وکشاد نے مجھے حکم دیا ہے کہ روزانہ آپ کو خط لکھوں۔ خط لکھنے کا مقصد ذاتی مفاد حاصل کرنا ہے اور نہ ہی آپ سے قرب حاصل کرنا۔ جناب والا یقین کریں جس قدر میرے خط پڑھنا آپ کے لئے ناگوار ہوگا اتنا ہی میرے لئے آپ کو خط لکھنا ناگوار ہے لیکن یہ ایک مجبوری ہے چونکہ حکم ماننا میرے لئے فرض کی حیثیت رکھتا ہے۔'' صدر ایوب یہ خط پڑھ کر بہت کنفیوز ہوئے اس کے بعد عبدالغفور ایڈووکیٹ صدر ایوب کو ایک برس تک مسلسل خط لکھتے رہے۔ ان خطوں میں انہوں نے ایوب خان کو ۶۵ء کی جنگ کی، معاہدہ تاشقند، لعل بہادر شاستری کی وفات، اقتدار کو درپیش خطرات، ایوب خان اور ان کے ساتھیوں کی سیاسی غلطیوں کی پیش از وقت اطلاع دی، جنگ کے دوران ایوب خان کو مشورہ دیا کہ سیز فائر نہ کرنا اگر کرنا پڑے تو منہ زبانی کرنا عملی نہ، تاشقند کے سلسلے میں مشورہ دیا کہ بلاوے پر تاشقند نہ جانا اگر ضروری ہوا تو کوئی نمائندہ بھیج دینا وغیرہ وغیرہ۔ صدر ایوب خان عبدالغفور ایڈووکیٹ کی ''معلومات'' پر بڑے حیران تھے کیونکہ ان کے خطوں سے صاف محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایوان صدر میں ہونے والے انتہائی خفیہ اجلاس تک کی خبر رکھتے ہیں لہٰذا معاہدہ تاشقند کے دوران ایوب خان نے ان کے گھر کے سامنے خفیہ ایجنسیوں کے لوگ بٹھا دیئے لیکن عبدالغفور اس کے باوجود بلاخوف خطوط لکھتے رہے۔ صدر ایوب کے سیکرٹری نے جب عبدالغفور ایڈووکیٹ کے انتقال

کی خبر دی تو صدر ایوب کو بہت شاک پہنچا۔ انہوں نے تھوڑا سوچا اور کہا ہاں وہ سچ کہتا تھا لیکن میں کیا کروں غیر سائنسی باتیں مجھے اپیل ہی نہیں کرتیں۔

ایوب خان اپنے اقتدار کے آخری دنوں میں مری کے مجذوب بابا لال شاہ کے ''مرید'' ہو گئے تھے۔ ۶۵ء کے الیکشن کے دوران جب محترمہ فاطمہ جناح نے ایوب خان کا بری طرح گھیراؤ کر لیا تو صدر پاکستان اپنی اہلیہ کے ساتھ بابا لال شاہ کے پاس حاضر ہوئے' لوگ قطاروں میں لگے ہوئے تھے' ایوب بھی قطار میں کھڑے ہو گئے۔ دروغ برگردن راوی جب صدر پاکستان کی باری آئی تو لال شاہ نے انہیں نیم وا آنکھوں سے دیکھا اور حکم دیا اپنی بیوی کو اٹھاؤ اور ایوب خان نے بھرے ہجوم کے سامنے خاتون اول کو بازوؤں میں اٹھا لیا۔ بابا جی نے خوش ہو کر کہا' ''اینوں چک لیا تے اوتوں وی چک لیں گا'' (اس کو اٹھا لیا ہے تو فاطمہ جناح کو بھی اٹھا لو گے) بابا جی کے اس اذن کے بعد ایوب خان کو انتخاب میں اپنی کامیابی کا یقین ہو گیا۔ ایوب خان کو بابا لال شاہ سے بہت عقیدت تھی' وہ اکثر ان کے پاس جاتے رہتے تھے۔ انہوں نے بابا جی کو متعدد مرتبہ ایوان صدر آنے کی دعوت دی لیکن بقول شخصے بابا جی نے اپنا آستانہ چھوڑ کر جانے سے انکار کر دیا۔

ایوب خان مریڑھ حسن کے قبرستان میں مدفون اللہ بخش نامی بزرگ کی قبر پر بھی حاضری دیتے تھے۔ اللہ بخش سے ایوب خان کو ''متعارف'' کرانے کا سہرہ قدرت اللہ شہاب کے سر جاتا ہے۔ اللہ بخش کے ایک مرید خاص بھائی جان نہ صرف شہاب اور اللہ بخش کے درمیان رابطے کا ذریعے تھے بلکہ ایوب خان اور بابا جی کے درمیان ''میل ملاقات'' بھی انہی کے ذریعے ہوتی تھی۔ بابا جی ایوب خان کے اقتدار سے بہت پہلے انتقال فرما چکے تھے لیکن بھائی جان کے بقول وہ اب بھی زندہ ہیں اور کارگاہ زیست میں اپنا کام تمام تر کروفر کے ساتھ سرانجام دے رہے ہیں۔ بھائی جان ایک مرتبہ قدرت اللہ شہاب کو بابا جی کی قبر پر لے گئے اور ان کے سر پر دستار باندھ کر اللہ بخش صاحب کی خوشنودگی کا ''پیغام'' دیا جس کے بعد شہاب باقاعدگی سے مریڑھ حسن کے قبرستان میں حاضری دینے لگے۔ عقیدت کے اس دور میں شہاب نے ایوب خان کو بھی اللہ بخش سے متعارف کرایا اور ایوب خان بھی بابا جی سے ''مشاورت'' فرمانے لگے۔

جنرل ضیاء الحق بزرگوں سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔ بہت سے کچے پکے ولیوں سے ان کی ملاقات کے شواہد ملتے ہیں۔ لیکن وہ سب سے زیادہ حکیم فاضل ظہیر سے متاثر تھے۔ حکیم فاضل ظہیر لاہور کی مال روڈ پر ''برائٹ'' کے نزدیک رہتے تھے۔ ان کا تعلق صابریہ سلسلہ سے تھا وہ جہاں روح کی پیچیدہ دنیا کے ماہر تھے وہاں دین اور علم فلکیات کے بھی عالم تھے۔ ان کے علم و فضل

اور معجزات کے باعث آرمی آفیسرز کا ایک بڑا طبقہ ان کا معترف تھا۔ یہ تو معلوم نہ ہو سکا کہ جنرل ضیاء الحق حکیم صاحب سے پہلی مرتبہ کب اور کہاں ملے لیکن یہ بات علم میں آئی ہے کہ حکیم صاحب نے جنرل ضیاء کو اقتدار کی نوید اس وقت سنا دی تھی جب اس کا دور دور تک کوئی امکان نہیں تھا بعد ازاں جب حالات جنرل ضیاء کے حق میں سازگار ہو گئے تو ان کا حکیم صاحب پر اعتماد بڑھتا چلا گیا یہ اعتماد بالآخر عقیدت کی شکل اختیار کر گیا۔ برسراقتدار آنے کے بعد جنرل ضیاء الحق کی حکیم صاحب سے مشاورت جاری رہی' حکیم صاحب کا مشورہ جنرل ضیاء الحق کے لئے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ بعض رازدانوں کا دعویٰ ہے جنرل ضیاء کے دور میں ہونے والی اسلامی اصلاحات کے پیچھے حکیم فاضل ظہیر کی تعلیمات کارفرما تھیں۔ بیگم شفیقہ ضیاء اور مولانا کوثر نیازی کے بقول حکیم صاحب نے سانحہ بہاولپور سے قبل جنرل ضیاء کو آنے والے خطرات سے آگاہ کر دیا تھا۔ ۱۷ اگست ۱۹۸۸ء کی صبح حکیم صاحب نے جنرل ضیاء الحق کو بہاولپور کے سفر سے روکنے کے لئے ایوان صدر فون کیا لیکن ان کی صدر سے بات نہ ہو سکی' معاملہ حساس ہونے کے باعث حکیم صاحب نے ایوان صدر کے کسی دوسرے شخص کو رازدار نہ بنایا تاہم وہ بہاولپور چھاؤنی فون کرتے رہے لیکن صدر ضیاء سے ان کا رابطہ نہ ہو سکا بقول مولانا کوثر نیازی حکیم صاحب نے ان کے صاحبزادے کو حکم دیا کہ وہ کار پر بہاولپور جائے اور جنرل ضیاء کو بہاولپور سے واپسی سے قبل مجھ سے فون پر بات کرنے کا کہے لیکن یہ کوشش بھی کارگر ثابت نہ ہوئی اور شام کو جنرل ضیاء کی حادثاتی موت کا پیغام نشر ہو گیا۔

بابا ملتانی کا بھی دعویٰ ہے جنرل ضیاء ان سے بڑی عقیدت رکھتے تھے انہیں اور ان کے اہل خانہ کو جنرل ضیاء نے متعدد حج اور عمرے کرائے اور انہیں (بابا ملتانی) جنرل ضیاء کے ساتھ خانہ کعبہ اور حجرہ نبویؐ کے اندر تک جانے کی سعادت حاصل ہوئی' جنرل ضیاء ملتان کے بزرگوں سے بھی وابستہ تھے لیکن ان کے نام ابھی تک پردہ راز میں ہیں۔

مانسہرہ سے ۴۵ کلومیٹر کے فاصلے پر ''لساں نواب'' نامی ایک قصبہ ہے وہاں سے سات کلومیٹر کے پیدل پہاڑی سفر کے بعد ''رحمت اللہ دیوانہ بابا'' کا آستانہ آتا ہے' دیوانہ بابا کو عرف عام میں ننگہ بابا کہا جاتا ہے۔ اس درگاہ پر زمین سے تین فٹ بلند چھوٹا سا چبوترہ بنا ہوا ہے جس پر چھپر پڑا ہے اور اس چبوترے پر لنگوٹی باندھے ویسٹ کوٹ پہنے معروف روحانی کردار ''ننگہ بابا'' ہاتھ میں ڈنڈا پکڑے بیٹھا ہے اور اس کے سامنے ''زائرین'' کی ایک طویل قطار بنی ہوئی ہے۔ ایک ایک کر کے یہ زائرین بابا کے سامنے پیش ہوتے ہیں اور بابا جی حسب توفیق ہر شخص کی کمر پر ایک دو ڈنڈے مار دیتے ہیں' اس ڈنڈا نوازی سے زائرین اپنے گوناگوں مسائل سے چھٹکارا پا

جاتے ہیں۔ بابا جی کی کرامات اوّل اوّل صرف ہزارہ تک محدود تھیں لیکن ''لساں نواب'' سے چھ کلومیٹر کے فاصلے پر آباد ایک گاؤں ''جھوکاں گراں'' کی ایک خاتون کی شادی جمالی فیملی میں ہو گئی' اس شادی کے بعد بابا جی بین الاقوامی اہمیت اختیار کر گئے۔ اس خاتون نے اپنے سسرال میں تنکہ بابا کی کرامات کا ذکر کیا تو میر ظفر اللہ خان جمالی کی والدہ متاثر ہو کر بابا تنکہ کے پاس حاضر ہو گئیں۔ بعدازاں میر ظفر اللہ خان جمالی بھی وہاں تشریف لے گئے۔ ان دنوں بلوچستان میں ان کے لئے حالات سازگار نہیں تھے بابا جی کی ''تواضع'' کے بعد جمالی صاحب کی مشکلات حل ہو گئیں۔ جمالی صاحب نے بابا جی کا ذکر اس وقت کے وزیراعلیٰ پنجاب میاں نواز شریف سے کیا۔ چند روز کے بعد نواز شریف کا سرکاری ہیلی کاپٹر تنکہ بابا کی درگاہ کے قریب اترا اور مانسہرہ جیسے دور دراز مقام کے اس کردار کو بین الاقوامی شہرت مل گئی۔ تنکہ بابا نے نواز شریف کی کمر پر تین ڈنڈے مارے اور کہا ''تو بادشاہ بنے گا'' بابا جی کی پیش گوئی سچ ثابت ہوئی اور نواز شریف ۱۹۹۰ء میں وزیراعظم بن گئے جس کے بعد انہوں نے لساں نواب سے بابا جی کی درگاہ تک تین کروڑ روپے کی لاگت سے سڑک تعمیر کرنے اور درگاہ کے بالکل سامنے ہیلی پیڈ بنانے کا حکم دیا تاکہ آئندہ کسی قائد حزب اختلاف کی پجارو اور وزیراعظم کے ہیلی کاپٹر کو بابا جی تک رسائی میں مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ نواز شریف کے دور اقتدار میں بابا تنکہ کی شہرت ایوان اقتدار میں پوری طرح گونجتی رہی۔ اس شہرت نے اس وقت کی قائد حزب اختلاف بے نظیر بھٹو کو بھی متاثر کیا اور ۱۹۹۱ء میں وہ بھی سات کلومیٹر تک پیدل سفر کر کے بابا تنکہ کے حضور حاضر ہو گئیں۔ بابا جی کے ملنگ آج تک زائرین کو بے نظیر کی حاضری کی داستان فخر سے سناتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا ''جب بے نظیر بابا جی کے سامنے پیش ہوئی تو انہوں نے ہاتھ باندھ رکھے تھے اور ان کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔'' بابا جی نے انہیں دیکھا اور اپنے سامنے بٹھا لیا۔ بابا جی کی طرف سے ترجمانی کے فرائض ایک نیم خواندہ ملنگ ادا کر رہا تھا جبکہ بے نظیر بھٹو کی ترجمان ان کی لیڈی سیکرٹری تھی۔ ملاقات کے آخر میں بابا جی نے تین عدد ڈنڈے مار کر کہا ''ہن تیری واری اے'' (اب تمہاری باری ہے) پیش گوئی اس بار بھی سچ ثابت ہوئی لہٰذا بے نظیر بھٹو نے ۱۹۹۳ء میں برسراقتدار آتے ہی درگاہ تک پختہ سڑک کی تعمیر کا کام تیز کرنے کا حکم دے دیا۔ مئی ۱۹۹۰ء میں غلام مصطفیٰ جتوئی نے بھی بابا جی کے حضور حاضری دی اور بابا جی نے انہیں بھی ڈنڈوں سے نوازا لیکن تادم تحریر ان ڈنڈوں کا اثر سامنے نہیں آیا۔

مسلم کمرشل بینک جہلم میں عرفان احمد نامی (ابھی زندہ ہیں) ایک صاحب ملازم تھے انہیں قدرت نے ماضی اور مستقبل میں جھانکنے کی صلاحیت عطا کر رکھی تھی۔ نواز شریف (وزیراعلیٰ

پنجاب کے دور میں) نے کسی شخص کو دو کروڑ روپے دیئے۔ اس شخص نے یہ رقم راجہ افضل کو پہنچانا تھی لیکن وہ شخص رقم لے کر غائب ہو گیا' کیس حساس نوعیت کا تھا' افشائے راز کے خوف سے اس میں پولیس اور خفیہ ایجنسیوں کو ملوث نہیں کیا جا سکتا تھا لہٰذا راجہ اکرم (بری امام والے) راجہ افضل اور مرحوم سیف الدین حسام (معروف ادیب اور دست شناس) عرفان احمد کو لے کر نواز شریف کے پاس پہنچ گئے۔ عرفان احمد نے آنکھیں بند کیں اور کہا میں اس حلیے کے شخص کو فلاں تاریخ کو راوی پل سے داتا دربار کے درمیان گھومتے دیکھ رہا ہوں اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا بریف کیس ہے جس میں رقم موجود ہے اور یہ شخص اس دن کے بعد ملک سے فرار ہو جائے گا۔ وزیراعلیٰ کے حکم سے مقررہ تاریخ کو پولیس نے راوی کے پل سے داتا دربار تک سارا علاقہ سیل کر دیا پیش گوئی سچ ثابت ہوئی اور وہ شخص پیر مکی کے قریب پکڑا گیا رقم بریف کیس میں محفوظ تھی...... اس واقعہ کے بعد نواز شریف عرفان احمد کے معترف ہو گئے اور گاہے بگاہے پیچیدہ قومی مسائل پر ان کی ''مدد'' لیتے رہے۔

فیصل آباد ڈجکوٹ روڈ پر دس کلومیٹر کے فاصلے پر ''دسواں آرائیاں'' نام کا گاؤں ہے۔ یہ گاؤں صوفی برکت المعروف ''سالار صاحب'' کے حوالے سے بڑی شہرت کا حامل ہے۔ سالار صاحب کے بارے میں مشہور ہے کہ انہوں نے چپ کا روزہ رکھا ہوا ہے اور وہ ایک ہاتھ میں تسبیح پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے کچھ نہ کچھ تحریر کرتے رہتے ہیں۔ ان کی ان تحریروں کو لاہور کا ایک پبلشر خوبصورت اور قیمتی کاغذ پر شائع کر دیتا ہے اور یہ تحریریں زائرین میں مفت تقسیم کی جاتی ہیں۔ سالار صاحب کے پاس روز سینکڑوں لوگ آتے ہیں' ہر شخص ان کے سامنے چند لمحات کے لئے حاضری دیتا ہے اور پھر اُٹھ کر چلا جاتا ہے اس دوران وہ اگر کسی سے بات کرنا چاہیں تو صرف ہونٹ ہلاتے ہیں اور ان کا مرید خاص ہونٹوں کی اس حرکت کو پڑھ کر سنا دیتا ہے۔ سالار صاحب نے وہاں ایک ''قرآن محل'' بھی بنا رکھا ہے جس میں قرآن مجید کے قدیم اور جدید لاکھوں نسخے رکھے گئے ہیں۔ نواز شریف کو فیصل آباد کے ایم این اے شیر علی وہاں لے کر گئے تھے۔ سالار صاحب نے ان سے تفصیلی بات چیت کی' وہ میاں صاحب کو قرآن محل بھی لے گئے جہاں انہوں نے میاں نواز شریف کے لئے بلند اقبال کی دعا فرمائی۔ وزارت عظمیٰ کے دوران نواز شریف سالار صاحب سے اکثر ملاقاتیں کرتے رہے۔ یہ سلسلہ ۱۹۹۲ء میں ان کی برطرفی تک جاری رہا' دروغ برگردن راوی جب نواز شریف کی صدر اسحاق سے آویزش طول پکڑ گئی اور دونوں کا جانا ٹھہر گیا تو نواز شریف مشورے کے لئے سالار صاحب کے پاس گئے لیکن انہوں نے یہ کہہ کر ملنے سے انکار کر دیا کہ ''یہ شخص اب ہمارے پاس زیادہ ہی آنے لگا ہے۔''

نوازشریف پیر علاؤالدین سے بھی گہری عقیدت رکھتے ہیں۔ پیر صاحب سے نوازشریف کو ڈاکٹر طاہر القادری نے ''اچھے'' دنوں میں متعارف کرایا تھا۔ پیر صاحب عبدالقادر جیلانی کے نسب سے تعلق رکھتے ہیں اور ظاہری و باطنی علوم کے ماہر ہیں۔ پاکستان کے اندر اور ملک سے باہر ان کے عقیدت مندوں کا وسیع حلقہ موجود ہے نوازشریف ان سے بھی بعض اُمور پر مشاورت کرتے رہے لیکن یہ سلسلہ ڈاکٹر طاہر القادری کے ساتھ گزبڑ کے بعد کچھ کمزور پڑ گیا تاہم نوازشریف آج بھی پیر صاحب کا نام بڑی عقیدت سے لیتے ہیں۔

بھٹو خاندان کی پیروں، بزرگوں، جوتشیوں اور غیر مرئی طاقتوں کے حامل حضرات سے وابستگی کی داستان بڑی ہوشربا ہے۔ اس تحقیق کے دوران ذوالفقار علی بھٹو کی ''عقیدت'' کے زیادہ شواہد نہیں مل سکے لیکن بیگم بھٹو، بے نظیر اور آصف علی زرداری کے بارے میں خاصا مواد سامنے آیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کا ذکر مولانا کوثر نیازی اس طرح کیا کرتے تھے ''اقتدار کے آخری دنوں میں بھٹو نے اپنے ہاتھ کا پرنٹ دیا اور کہا اسے ایم اے ملک کے پاس لے جاؤ اور اس سے میرے نام کا ذکر کئے بغیر پوچھو اس شخص کا کیا بنے گا۔ وہ پرنٹ ایم اے ملک کے پاس لے گئے تو ایم اے ملک صاحب نے نام اور تاریخ پیدائش پوچھی جو بتانے سے انکار کر دیا تھا، بہر حال ایم اے ملک نے کہا یہ شخص قدرتی موت نہیں مرے گا شاید پھانسی چڑھ جائے۔ بھٹو کیس کے دوران جب بیگم بھٹو اور بے نظیر ہر طرف سے مایوس ہو گئیں تو ان کے مشیروں نے روحانی طاقتوں سے مدد لینے کا مشورہ دیا۔ بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو شاہ عبداللطیف بھٹائی کے مزار پر گئیں وہاں ان کی ملاقات ایک مجذوب سے کرائی گئی اس نے بیگم بھٹو سے کہا۔ ''تمہارے سر کا سائیں نہ رہے تو بھی بادشاہت تمہارے ہی گھر رہے گی۔'' مجذوب کی یہ بات اس وقت دونوں خواتین کے لئے دیوانے کی بڑ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی لیکن جب دس بارہ برس بعد پاکستانی سیاست میں بھٹو خاندان کی جگہ بننے لگی تو بے نظیر بھٹو کو مجذوب کی بات میں وزن محسوس ہوا۔ ۸۸ء میں ضیاء کریش پھر انتخابات میں پیپلز پارٹی کی کامیابی کے بعد غیر مرئی طاقتوں پر بھٹو خاندان کی روحانی وابستگیوں کی داستانیں چند ہونٹوں تک محدود رہیں اگر یہ بات باہر نکلی بھی تو لوگوں نے پروپیگنڈا سمجھ کر نفی کر دی لیکن اگست ۹۰ء میں حکومت کی برطرفی کے بعد بے نظیر بھٹو کے روحانی ''رابطوں'' کو عوامی دوام مل گیا جس کی تفصیل دلچسپ حکایات سے کم نہیں۔

حکومتی برطرفی کے چند روز بعد ۱۹۹۶ء میں بے نظیر بھٹو چکوال سے چند کلومیٹر پیچھے جاتلی میں مقیم مجذوب سائیں بلی (زندہ ہے) سے ملاقات کے لئے گئیں۔ مس ناہید خان اور

پرویز اشرف بھی ان کے ہمراہ تھے۔ سائیں بلی بابا لال شاہ کا شاگرد تھا بعد ازاں وہ بڑے عرصے تک بری امام کے مزار پر رہا پھر اس کی ''ڈیوٹی'' چکوال میں لگا دی گئی۔ سائیں بلی نے بے نظیر کو دشمنوں پر قابو پا لینے کی نوید سنائی اور سارے وفد کو تھپکیاں دے کر رخصت کر دیا۔ دوبارہ برسر اقتدار آتے ہی مس ناہید خان نے ایک قیمتی پلنگ تحفتاً سائیں کی خدمت میں پیش کیا' یہ پلنگ بلی سرکار نے اپنی بہن کو دے دیا۔ مس ناہید خان کا آج تک سائیں بلی کے ساتھ رابطہ ہے اور وہ بلند اقبالی کے لئے سائیں سے باقاعدگی سے دعائیں کراتی ہیں۔

کراچی کے علاقے چاکیواڑہ میں ایک ویران اور شکستہ مزار پر ایک غیر مسلم خاکروب ہے یہ سفلی علوم کا ماہر سمجھا جاتا ہے۔ پیپلز پارٹی کراچی کے ایک صاحب جنہیں جعفری کہا جاتا ہے وہ ۱۹۹۱ء میں بے نظیر بھٹو کو اپنی ذاتی گاڑی میں اس کے پاس لے کر گئے۔ ''ماہر'' نے جلتی آگ میں کوئی چیز پھینکی اور دھوئیں پر نظریں گاڑھ کر کہا ہم تمہارے دشمنوں کا اتحاد توڑ دیں گے۔ بعد ازاں بے نظیر بھٹو باقاعدگی سے اس ''ماہر'' کے پاس جاتی رہیں کچھ عرصے بعد محمد خان جونیجو کا انتقال ہوا اور مسلم لیگ دو حصوں میں تقسیم ہو گئی جس کے بعد نوازشریف حکومت کا زوال شروع ہو گیا۔ بے نظیر اس ساری تبدیلی کا کریڈٹ اس ''ماہر'' کے چلوں کو دیتی ہیں دوبارہ برسر اقتدار آنے کے بعد جعفری صاحب کی خدمات کے اعتراف میں گورنر ہاؤس کے پریس سیکشن میں اعلیٰ افسر لگا دیا گیا وہ ۱۹۹۶ء تک وہاں تعینات رہے۔

آصف علی زرداری نے قید کے دوران مذہب کا مطالعہ شروع کیا تو تصوف کی چند کتابیں بھی ان کی نظر سے گزریں۔ ان میں بزرگوں کے احوال پڑھ کر انہوں نے کسی اللہ والے سے ملاقات کا فیصلہ کیا ان کے چند سیاسی ملاقاتیوں کو جب ان کے ارادے کی خبر ہوئی تو انہوں نے میانوالی کے نواب جہانگیر ابراہیم المعروف ''ابرا'' سے زرداری کی ملاقات کا اہتمام کیا۔ نارمل زندگی میں درویشانہ طرز معاشرت کے حامل ''ابرا'' کے پاس چند غیر مرئی طاقتیں ہیں جس کے باعث وہ مختلف نوعیت کی پیش گوئیاں کرنے کا ماہر سمجھا جاتا ہے۔ ''ابرا'' نے ملاقات کے دوران زرداری کو مستقبل قریب میں رونما ہونے والے چند واقعات کے اشارے دیئے جو بعد ازاں سچے ثابت ہوئے تو زرداری کو ''ابرا'' سے عقیدت ہو گئی۔ اس دوران بے نظیر بھٹو سے بھی ان کی چند ملاقاتیں ہوئیں لیکن ''ابرا'' انہیں زیادہ متاثر کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ یہاں سے الیکشن تک راوی کو ''ابرا'' کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملتی لیکن پیپلز پارٹی کی حکومت بننے کے بعد ''ابرا'' کو وزیر اعظم ہاؤس میں بلا روک ٹوک آتے جاتے دیکھا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ آصف زرداری

کی انتہائی حساس میٹنگوں میں بھی بغیر پیشگی اطلاع کے چلا جاتا تھا اور زرداری صاحب خوشی سے اس کا استقبال کرتے تھے۔ ۹۵ء میں بے نظیر کے دورہ امریکہ کے دوران ''ابرا'' نے پہلی مرتبہ اخبارات میں طلوع ہو کر شہرت حاصل کی چند ہفتوں تک سرخیوں کا موضوع بننے کے بعد ابرا دوبارہ گوشہ گمنامی میں چلا گیا لیکن وزیراعظم ہاؤس تک اس کی پہنچ اسی طرح قائم رہی۔

۹۳ء کے انتخابات کے دوران بے نظیر بھٹو جب فیصل آباد کے دورے پر گئیں تو وہاں ان کے شوق سے واقف ایک سیاسی شخصیت نے ان کی ملاقات ایک نجومی سے کرائی۔ نجومی نے زائچہ بنا کر بتایا آپ الیکشن جیت جائیں گی لیکن آپ کا اقتدار صرف اڑھائی سال تک چلے گا۔ وہ چونک پڑیں اور کہا مجھے ریحانہ (گوجر خان میں مقیم ہے) نے بھی یہی کہا تھا۔

بے نظیر بھٹو ۱۹۹۵ء میں نیلسن منڈیلا کی تقریب حلف برداری میں شرکت کے لیے جنوبی افریقہ گئیں۔ اقتدار سنبھالنے کی تقریب کا آغاز افریقہ کے روایتی انداز سے ایک وچ ڈاکٹر کی دعا سے ہوا۔ وچ ڈاکٹر کو دیکھتے ہی وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے معروف پاکستانی صحافی اور دانشور الطاف گوہر کے کان میں کہا ''افریقی آپ کے پرانے دوست ہیں میں اس وچ ڈاکٹر سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں آپ میری ملاقات کا انتظام کر دیں۔'' صحافی کے بقول تقریب کا باقی وقت وزیراعظم پاکستان نے عجیب بے چینی اور اضطراب میں گزارا۔ تقریب کے بعد دونوں کی ملاقات کا اہتمام کر دیا گیا۔

ترکی کے توپ کاپی میوزیم میں نبی اکرمؐ کی مہر موجود ہے۔ نبی رسالتؐ اپنے تمام مکتوبات پر یہ مہر لگایا کرتے تھے۔ یہ مہر مختلف ہاتھوں سے ہوتی ہوئی عثمانی خلفاء تک پہنچی تو وہ ہر سال چند کاغذوں پر یہ مہر ثبت کر کے یہ کاغذ اپنے پسندیدہ درباریوں، وزراء اور معززین شہر میں تقسیم کر دیتے تھے۔ یہ ''تعویذ'' بلند اقبالی، باعث برکت اور باعث سعادت سمجھا جاتا تھا۔ وزیراعظم بے نظیر کو خبر ہوئی تو انہوں نے ترکی کے دورے کے دوران توپ کاپی میوزیم کھلوا کر مہر رسالت کا وہ تعویذ حاصل کیا۔

باوا ملتانی ایک ایسا عجیب کردار ہے جو پچھلے ۴۰ برس سے ایوان اقتدار کے اردگرد منڈلاتا نظر آ رہا ہے۔ ایوب خان کی والدہ، ہمشیرہ اور اہلیہ، یحییٰ خان کی اہلیہ، جنرل ضیاء کے اہل خانہ اور نواز شریف سے اس کے تعلقات کے باقاعدہ شواہد ملتے ہیں۔ اس ان پڑھ بزرگ کو بزرگی کا ۶۰ سالہ تجربہ ہے۔ پورے ملک کے اعلیٰ طبقوں میں اس کے زائرین پائے جاتے ہیں۔ کراچی، لاہور اور اسلام آباد میں باوا ملتانی کی بڑی شاہانہ رہائش گاہیں ہیں جہاں روز بڑی بڑی گاڑیوں میں سوار پاکستان کی کریم حاضری دیتی ہے۔ پاکستان ٹیلی وژن کے ایک معروف اداکار جو ۳۵

برس سے باوا جی کے مرید ہیں، انہوں نے مجھے بتایا باوا لاہور میرے گھر آ کر ٹھہرتا تھا جب کسی خصوصی زائر کا کام کرنا ضروری ہوتا تو باوا کوئلوں کی انگیٹھی اور دو چھریاں منگواتا، چھریاں کوئلوں میں دبا دیتا، جب لوہا سرخ ہو جاتا تو وہ ان چھریوں کو اپنی زبان پر بجھانا شروع کر دیتا اور زائر کا کام ہو جاتا۔ باوا جی نے برہنہ پا پورا پاکستان گھوما ہے ہر جگہ اس کے زائرین ہیں بالخصوص وفاقی سیکرٹری، آرمی کے جنرل، عدلیہ کے اعلیٰ ارکان، تاجروں اور سیاست دانوں کی بڑی تعداد باوا کے حلقہ اثر میں داخل ہے۔ مضبوط تن و توش، سرخ آنکھوں اور گھنی سفید داڑھی والے باوا سے بے نظیر بھٹو کا رابطہ کراچی میں ہوا جہاں باوا سے بے نظیر کی ملاقات کے باقاعدہ شواہد ملتے ہیں۔ آج کل باوا ملتانی راول ٹاؤن میں اپنی شاہانہ رہائش گاہ میں مقیم ہے۔ جہاں ایک مرتبہ وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو بھی تشریف لے گئیں جبکہ باوا ملتانی متعدد مرتبہ وزیراعظم ہاؤس گیا۔

شیخوپورہ کے بابا شیرانوالہ اور ٹھٹھہ کے بابا جناتی کا بھی وزیراعظم سے رابطہ ثابت ہوتا ہے تاہم ان کے بارے میں زیادہ تفاصیل دستیاب نہیں، ہماری معلومات اخبارات کی کہانیوں تک محدود ہیں لہٰذا وہ خارج از بحث ہیں۔

علامہ اقبال ٹاؤن کے جہانزیب بلاک میں مقیم سید سرفراز شاہ عصر حاضر کے ایک پڑھے لکھے بزرگ ہیں۔ لندن سے ایم بی اے کیا۔ پاکستان میں ایک بڑی فرم میں نمبر ٹو ہیں لیکن اپنی روحانی طاقتوں کے باعث پڑھے لکھے اور صاحب اقتدار حلقے میں ان کی بڑی دھوم ہے۔ ان کا اصل کمال کشف ہے، وہ چہرہ دیکھ کر ماضی، حال اور مستقبل کا احوال بتانا شروع کر دیتے ہیں جو حاضرین کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ اندھوں کی بینائی لوٹانے کی ان کے پاس خصوصی دعا ہے، جس سے وہ بیسیوں مریضوں کو شفایاب کر چکے ہیں۔ وہ ملاقاتیوں سے صرف جمعہ اور پیر کے روز ملتے ہیں۔ تنخواہ کا زیادہ تر حصہ مہمانوں کی خاطرداری پر لگا دیتے ہیں۔ حکمران طبقے میں میاں منظور احمد وٹو اور ان کے وزراء کی ایک کثیر تعداد ان سے وابستہ ہے۔ آرمی آفیسرز، عدلیہ کے ججوں، دانشوروں، ادیبوں اور صحافیوں کا ایک بڑا طبقہ بھی ان کے حلقہ اثر میں شامل ہے۔ جنرل جہانگیر اشرف قاضی کو عارضی آرمی چیف بننے اور جسٹس الیاس کو عبوری گورنرشپ کی نوید شاہ صاحب نے بہت پہلے سنا دی تھی۔

مسلم لیگ جونیجو کے زیادہ تر ارکان ہری پور کے بزرگ ڈاکٹر جان محمد وارثی کے معتقد ہیں۔ وارثی صاحب سلسلہ وارثیہ کے بزرگ ہیں۔ ظاہری و باطنی علوم کے ماہر ہیں۔ طبیعت کی عاجزی اور کشادہ دلی سے ہر ملنے والے کا دل موہ لیتے ہیں۔ ۹۰ برس کے کہن رسیدہ بزرگ ہیں۔ لیکن ملنے والوں کو ''بزرگی'' کی لاٹھی سے نہیں ہانکتے لہٰذا ان کی محفل میں ''جنریشن گیپ'' نہیں وہ

ذہنی طور پر نابالغ شوخ وشنگ نوجوان سے مل کر بھی اتنے ہی خوش ہوتے ہیں۔ جتنے ایک اعلیٰ پائے کے عالم سے۔ اقبال احمد خان' چودھری عبدالستار (ایم این اے) اور ملک خدا بخش ٹوانہ ان کے بہت معتقد ہیں۔ اقبال احمد خان نے تو پاکستان نظریاتی کونسل کی چیئرمین شپ بھی اس وقت تک قبول نہ کی جب تک وارثی صاحب نے ان کو اجازت نہ دے دی۔

قارئین کرام! دنیا میں موجود روحانی نظام سے انکار ممکن نہیں اور یہ بھی درست ہے کہ نگاہ مرد مومن سے تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ گمراہ لوگوں کو منزل مل جاتی ہے اور روحانی بحران میں مبتلا لوگ مرکز حیات تک پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن اس روحانی نظام کے ارباب بست وکشاد کون ہیں.....؟ وہ کہاں ہوتے ہیں.....؟ ان تک کیسے پہنچا جا سکتا ہے.....؟ اور ان کی نشانیاں کیا ہیں.....؟ یہ تفصیل طلب اور متنازعہ موضوع ہے ہاں البتہ ایک بات واضح ہے کہ بعض جعل سازوں نے انسانی فطرت کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تسبیحوں، چوغوں اور داڑھیوں کو ایک کاروبار بنالیا ہے۔ اور ان لوگوں کی ان مکروہ حرکات کی وجہ سے نہ صرف آج کے انسان کا روحانیت سے یقین اٹھ گیا ہے بلکہ وہ مذہب سے بھی دور ہو گیا ہے۔ جس کا نتیجہ سنگین ذہنی، قلبی اور روحانی بحران کی شکل میں سامنے آیا جس کی عملی تفسیر آج کا انسان ہے۔ یہ بھی ایک تفصیل طلب موضوع ہے جس پر پھر کبھی بات ہوگی..... مندرجہ بالا تحقیقی مقالے میں کچھ اصلی بزرگ ہیں اور کچھ اصل نما، کچھ عامل ہیں اور کچھ قدرت کی روحانی طاقتوں کا خوبصورت شہکار ان میں اصل کون ہے اور اصل نما کون.....؟ اس کا تعین آپ نے خود کرنا ہے۔ ہمیں آپ کی ذہانت پر مکمل اعتماد ہے۔ جہاں تک ہمارا کام ہے ہم نے کسی بھی "بزرگ" کی ہتک سے سو فیصد پرہیز کیا کیونکہ اندر کے بھید صرف خدا جانتا ہے۔ ہو سکتا ہے ہم جسے اصل سمجھ رہے ہوں وہ اصل نما ہوں اور جسے جعلی سمجھ رہے ہوں۔ وہی اصلی ہوں باقی آپ جانیں اور آپ کا کام۔

• • •

بجٹ نہیں زندگی مسئلہ ہے

حکومت ہر سال جون میں اگلے مالیاتی سال کا بجٹ پیش کرتی ہے' ہر سال یہ بجٹ بجلی بنا کر عوام کے سروں پر گرتا ہے' ہم لوگ جب بھی اس بجٹ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے یہ بجٹ ایک ایسی چکی ہے حکومت جس میں اس ملک کے عوام کو پیس دے گی۔ اس مضمون میں ایک عام شخص کے ذاتی بجٹ کا تخمینہ لگایا گیا ہے۔ یہ فیچر ۱۹۹۷ء میں شائع ہوا تھا۔ آپ آج کی مہنگائی کو سامنے رکھ کر اس کے اعداد و شمار میں تبدیلی کر لیں۔

......

ہمارے پاس دو کمروں کا فلیٹ تھا۔

ایک چھوٹا سا کچن، ایک باتھ روم' الماریوں اور کھڑکیوں سے عاری دو چھوٹے سے کمرے' ایک بالکونی اور بس، دو ہزار کرائے کے اس فلیٹ میں ہم چھ افراد رہتے تھے۔ تین ایک کمرے میں تین دوسرے میں جبکہ بالکونی میں ہمارا ملازم رؤف رہتا تھا۔ ہم سب غیر شادی شدہ زندگی گزار رہے تھے۔ سب مختلف شہروں سے تھے۔ سب مختلف دفاتر میں کام کرتے تھے اور سب کی تنخواہیں تین ہزار سے کم تھی۔ صرف رؤف ہمارا ملازم شادی شدہ تھا لیکن اس کے دونوں بچے اور بیوی مانسہرہ کے قریب ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ رؤف ڈیڑھ برس سے ہمارے پاس ملازم تھا، شروع میں ہم اسے ایک ہزار روپے ماہانہ دیتے تھے لیکن اس کی کارکردگی سے متاثر ہو کر ہم نے ایک سال بعد اس کی تنخواہ میں پورے دو سو روپے کا اضافہ کر دیا۔ مہینے کی آخری تاریخوں کو رؤف بہت بے چین ہو جاتا تھا اور ہم میں سے سب سے پوچھتا تھا۔ ''صاحب آپ کو تنخواہ کب ملے گی؟'' فلیٹ کے ہر مکین سے اس کا یہی سوال ہوتا۔ ہم اس کو تنخواہ نہ ملنے کا معقول جواز پیش کرتے لیکن اس کی تسلی نہ ہوتی' اس بے چینی میں پہلی تاریخیں آ جاتیں' ہم جب شام کو واپس لوٹتے تو روز اسے دہلیز پر منتظر پاتے لیکن ہماری خالی جیبیں اسے مایوسی کی انتہا تک لے جاتیں۔ جس روز ہمیں تنخواہ ملتی وہ گھر سے باہر ہی اپنے ۱۲ سو روپے اُچک کر مانسہرہ بھاگ جاتا پھر دو دن تک ہمیں اس کی خبر نہ ملتی۔ تنخواہ کی ''اکساٹمنٹ'' ختم ہوتے ہی وہ واپس آ کر دوبارہ کچن میں سر دے کر بیٹھ جاتا۔ مہینے میں صرف ایک بار سینما میں فلم دیکھنا اور سودے سے پیسے بچا کر چھپ چھپ کر گھٹیا سے سگریٹ پینا اس کے دو ہی شوق تھے۔ ڈاکٹر کی فیس سے ڈر کر وہ کبھی بیمار نہیں پڑا، ہمارے پھٹے پرانے کپڑے پہنتا' جوتا اس نے تین برس قبل خریدا تھا جسے وہ انتہائی اہم موقع پر ہی استعمال کرتا۔

ہم نے اسے جب بھی دیکھا ننگے پاؤں ہی دیکھا۔ میں نے اس سے ایک بار پوچھا تم بارہ سو میں گزارا کیسے کرتے ہو؟ تو اس نے مجھے حیرت سے دیکھ کر کہا "گزارا؟ ہمارے گھر والے چوبیس گھنٹوں میں ایک بار کھانا کھاتے ہیں۔ آپ مجھے جو کپڑے دیتے ہیں ان میں سے ایک اپنے لئے رکھ کر باقی گھر لے جاتا ہوں جو ابا جی امی اور میری بیوی پہن لیتی ہے۔ جب وہ ان کے کام کے نہیں رہتے تو ہم انہیں کاٹ کر بچوں کے کپڑے بنا لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا بڑا شکر ہے ہم پورے گاؤں میں سب سے امیر ہیں کیونکہ میں کام پر لگا ہوا ہوں پر صاحب مہنگائی بہت ہے۔ میں پچھلے مہینے گھر گیا تو ابا جی کو خون کی الٹیاں لگی ہوئی تھیں ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا تو اس نے ۸ سو روپے لے لیے دو سو روپے آنے جانے پر خرچ ہو گئے اور دو سو روپے میں اپنی بیوی کو دے آیا...

قارئین کرام آج نیا بجٹ آ رہا ہے ابھی چند گھنٹوں بعد قومی اسمبلی کا ایوان ہمارے منتخب نمائندوں سے بھر جائے گا اور وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو اور قائد حزب اختلاف میاں نواز شریف کی موجودگی میں مخدوم شہاب الدین اعداد و شمار کی توپ چلائیں گے۔ اتنے ارب خسارہ، اتنے ارب کے مزید ٹیکس، صوبوں کو اتنے ارب روپے ملیں گے، فلاں ٹیکس میں چھوٹ فلاں ڈیوٹی کا اطلاق اور ٹیلی فون بجلی اور گیس کے نرخ میں اتنا اضافہ وغیرہ وغیرہ اربوں روپے کی باتیں ہونگیں۔ کروڑوں کے سوال اٹھائے جائیں گے اور لاکھوں روپے میں جواب ہونگے لیکن صاحبان دیکھئے گا اس پورے ایوان میں ایک بھی شخص ایسا نہیں ہوگا جو اس رؤف کی بات کرے گا جس کا سارا بجٹ بارہ سو روپے پر محیط ہے اور جس کا خاندان مانسہرہ میں ہے اور وہ اسلام آباد کے ایک فلیٹ میں کسمپرسی سے زندگی گزار رہا ہے اور یہ وہ رؤف ہے جس کے لئے جون کے مہینے میں کوئی دلچسپی نہیں پیپلز پارٹی ہو یا مسلم لیگ، بجٹ ہو یا نہ ہو ڈالر ہو یا روپیہ، آئی ایم ایف ہو یا عالمی بینک اسے کوئی غرض نہیں کیونکہ وہ دنیا کو ضرورت کی آنکھ سے دیکھتا اور ضرورت کی آنکھ سے سنتا ہے۔ ضرورت ہی اس کا ملک ہے اور ضرورت ہی اس کی حکومت، ضرورت ہی اس کی سوچ اور ضرورت ہی اس کا ایمان بلکہ یوں کہا جائے کہ وہ سرتاپا ضرورت ہی ضرورت ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ لیکن ہم تو اس رؤف کی بات کر سکتے ہیں کیونکہ ہم حکومت ہیں اپوزیشن اور نہ ہی وزیر خزانہ۔ آئیے دیکھیں اس ضرورت سے بنے رؤف کو زندگی گزارنے کے لئے روز کتنے وسائل کی ضرورت ہے۔

فرض کریں اس کا کنبہ چھ افراد پر مبنی ہے تو

(خوراک)

1) ناشتہ = چائے + بند مبلغ 6 روپے اگر خاندان چھ افراد پر مشتمل ہے تو 36 روپے بہت کفایت شعاری کی جائے تو پورا خاندان 30 روپے میں ناشتہ کرے گا۔

2) دوپہر کا کھانا = 3 روٹی + سالن مبلغ 14 روپے پورا خاندان 84 روپے کفایت شعاری کے ساتھ 80 روپے۔

3) رات کا کھانا اگر نیا سالن پکے تو تین روٹی + سالن مبلغ 14 روپے فی کس پورا خاندان 84 روپے کفایت شعاری کے ساتھ 80 روپے۔

4) دو وقت کی چائے = چار روپے، پورا خاندان 24 روپے، کفایت شعاری کے ساتھ 20 روپے۔

5) تیاری کے لئے نہانا شیو، پیسٹ اور تیل اوسطاً 5 روپے روزانہ پورا خاندان 30 روپے اور کفایت شعاری کے ساتھ 26 روپے روزانہ۔

یوں گھر کا ہر شخص 43 روپے چھ افراد کا کنبہ 258 روپے اور کفایت شعاری کے ساتھ 236 روپے روزانہ خرچ کرتا ہے جبکہ اس مد میں ماہانہ خرچ فی کس 1290 روپے پورے خاندان کا 7740 روپے اور کفایت شعاری کے ساتھ 7080 روپے بنتا ہے۔

سفر

اگر دفتر سکول، کالج اور مارکیٹ چار کلومیٹر کے اندر ہے تو ویگن کا دو طرفہ کرایہ چھ روپے ماہانہ خرچ 180 روپے اگر گھر کے تین افراد روزانہ ویگن پر سفر کرتے ہیں تو 540 روپے ماہانہ اضافی خرچ ہوگا اگر مزید کفایت شعاری کی جائے تو بھی 500 روپے ضرور خرچ ہونگے۔

رہائش

محکمہ بہبود آبادی کی رپورٹ کے مطابق پاکستان میں ایک کمرے میں اوسطاً چار افراد رہائش پذیر ہیں جبکہ شہری آبادی کا چالیس فیصد حصہ کراچی، لاہور اور فیصل آباد میں اقامت پذیر ہیں۔ ان تینوں بڑے شہروں میں دو کمرے کا انتہائی عام گھر ایک ہزار روپے کرائے سے کم نہیں ملتا لہٰذا اگر ایک ہزار کرائے کے گھر میں چھ افراد اقامت پذیر ہیں تو رہائش پر فی کس خرچ 167

روپے ماہانہ ہوا جبکہ رہائشی سہولیات بجلی، پانی، گیس، فرنیچر اور مرمت پر اوسطاً فی شخص 165 روپے ماہانہ خرچ کرتا ہے (سالانہ 990 روپے انتہائی کفایت شعاری کے ساتھ 900 روپے)۔

لباس

ہر شخص سال میں کم از کم دو جوڑے کپڑے بناتا ہے۔ انتہائی گھٹیا لباس پر بھی تین سو روپے خرچ ہوتے ہیں (دو جوڑوں کے 600 روپے) یوں پورے کنبے کے لباس پر 3600 روپے خرچ آئے گا۔ انتہائی کفایت شعاری کی جائے تو تین ہزار روپے خرچ ہونگے اس کی اگر ماہانہ اوسط نکالی جائے تو ہر شخص پچاس روپے اور پورا خاندان 300 روپے ہر ماہ اس ضمن میں خرچ کرتا ہے۔

جوتا

غریب آدمی سال میں ایک سے زائد جوتا خریدنے کی معاشی طاقت نہیں رکھتا لیکن عام سے عام جوتا بھی تین سو روپے سے کم میں نہیں ملتا۔ اس اوسط سے پورا کنبہ سال میں 1800 روپے جوتوں پر خرچ کرتا ہے۔ ماہانہ اوسط فی شخص 25 روپے اور خاندان 150 روپے بنتی ہے۔

اچانک یا حادثاتی سفر

مہینہ بھر میں خاندان کا ایک شخص شہر کے اندر کم از کم سو روپے کے اچانک یا حادثاتی سفر کر جاتا ہے جبکہ سال میں کم و بیش ایک مرتبہ پوری فیملی کو شہر سے باہر بھی سفر کرنا پڑتا ہے جس پر 12 سو روپے سے کم خرچ نہیں ہوتا یوں اندرون اور بیرون شہر پر اوسط 150 روپے فی کس ماہانہ خرچ بھی ہو جاتا ہے۔

حادثاتی اخراجات

بیماری، مرگ، پیدائش، مہمان اور اس نوعیت کے دیگر حادثات پر ایک خاندان اوسطاً 600 روپے ماہانہ ضرور خرچ کر بیٹھتا ہے۔ اس خرچ کو چھ افراد کے کنبے پر تقسیم کیا جائے تو ہر شخص کے حصے میں ایک سو روپے آتے ہیں۔

ان تمام اخراجات کا جدول کچھ یوں بنتا ہے۔

وجہ خرچ	ایک شخص کا ماہانہ خرچ	پورے خاندان کا کفایت شعاری سے ماہانہ خرچ
خوراک	1290 روپے	7080 روپے
روزانہ سفر	180 روپے	500 روپے
رہائش	167 روپے	1000 روپے
رہائشی سہولیات	165 روپے	900 روپے
لباس	50 روپے	300 روپے
جوتا	25 روپے	150 روپے
حادثاتی سفر	150 روپے	900 روپے
حادثاتی اخراجات	100 روپے	600 روپے
ٹوٹل		2120 روپے
		11600 روپے

اب اگر چھ افراد کے کنبے میں صرف دو بچے تعلیم حاصل کر رہے ہوں تو یونیفارم، جوتے، کتابوں اور فیسوں پر کم از کم 300 روپے فی کس خرچ مزید شامل کر لیا جائے (دونوں بچوں کا 600 روپے) یوں فی کس ماہانہ خرچ 2420 روپے اور پورے کنبے کا خرچ 12200 روپے ماہانہ ہو جائے گا۔

اگر پورا خاندان مہینے میں ایک بار سیر و تفریح پر نکل جائے تو سینما، پارک کے ٹکٹ، آئس کریم، پاپ کارن، سموسے، پکوڑے اور چاٹ وغیرہ پر چار سو روپے اضافی خرچ ہوگا۔ یوں 67 روپے کے اضافے سے فی کس ماہانہ خرچ 2487 روپے اور پورے کنبے کا خرچ 12600 روپے تک جا پہنچے گا۔

ان اعداد و شمار کی روشنی میں کنبوں کی تقسیم کچھ یوں ہوگی اگر خاندان دو افراد پر مشتمل ہے تو 4934 روپے، تین افراد پر مشتمل ہو تو 7401 روپے، چار افراد پر مشتمل ہو تو 9868 روپے، پانچ افراد ہوں تو 12335 روپے اور اگر چھ افراد پر مشتمل ہو 14802 روپے ماہانہ خرچ

ہوگا۔ (اگر کفایت شعاری سے کام لیا جائے تو چھ افراد کا ماہانہ خرچ 12300 روپے ہوگا)۔

اب آتے ہیں خاندان بھر میں کمانے والے افراد کی طرف۔ محکمہ بہبود آبادی کی رپورٹ کے مطابق پاکستان کے 15 کروڑ عوام سے صرف تین کروڑ برسر روزگار ہیں جبکہ باقی 12 کروڑ زیر کفالت ہیں۔ گویا 5 افراد میں ایک شخص کمانے والا ہے اب ہمارے تخلیق کردہ اخراجات کی رو سے دیکھا جائے تو اگر وہ برسر روزگار شخص 9868 روپے ماہانہ کما کر لائے تو ہی چار افراد پر مشتمل خاندان روکھی سوکھی کھا سکتا ہے۔

ادھر ہماری فی کس آمدنی چار سو ڈالر سالانہ (14000 روپے) ہے جو ماہانہ 33 ڈالر روزانہ بنتی ہے جبکہ ہر شخص کو 71 روپے روزانہ 2120 روپے ماہانہ اور 25440 روپے سالانہ درکار ہیں اب وہ 36 روپے روزانہ 1120 روپے ماہانہ اور 11400 روپے کا سالانہ خسارہ کہاں سے پورا کرے گا جبکہ پاکستان میں ایسے خاندانوں کی بھی کوئی کمی نہیں جن میں ایک ڈالر سے دس افراد گزارا کرتے ہیں۔ دیہات میں تو ایک کنبہ ایک ڈالر میں ہفتہ بھی گزارتا ہے۔

پاکستان میں اس وقت قریباً ایک کروڑ افراد سرکاری ملازمین ہیں جن میں قریباً دس لاکھ آرمڈ فورسز میں کام کر رہے ہیں۔ سول میں گریڈ ایک سے گریڈ سات تک چالیس لاکھ گریڈ سات سے سولہ تک 22 لاکھ اور گریڈ سترہ سے بائیس تک سوا لاکھ افراد ملازم ہیں جبکہ نیم سرکاری اداروں میں 26 لاکھ افراد ملازمت کر رہے ہیں۔ باقی دو کروڑ برسر روزگار افراد بزنس، غیر سرکاری اداروں، کارخانوں، ٹرانسپورٹ، کاشتکاری اور مزدوری کے شعبوں سے وابستہ ہیں۔

سرکاری ملازمین کو اپنی بنیادی تنخواہوں کے علاوہ 45 فیصد ہاؤسنگ' 90 روپے میڈیکل' 130 روپے ٹرانسپورٹ اور سات فیصد کاسٹ آف لیونگ الاؤنس ملتا ہے۔ ان تمام الاؤنسز کو ملا کر ان کی تنخواہوں کی صورتحال کچھ یوں ہے۔ (یہ 1995ء کے اعداد و شمار ہیں۔)

گریڈ	بنیادی تنخواہ	الاؤنسز	ٹوٹل
1	1245	867	2112روپے
2	1275	883	2158روپے
3	1320	906	2226روپے
4	1360	928	2287روپے
5	1400	948	2348روپے
6	1440	968	2409روپے
7	1480	989	2470روپے
8	1540	1021	2561روپے
9	1605	1052	2657روپے
10	1660	1083	2743روپے
11	1725	1117	2842روپے
12	1830	1172	3002روپے
13	1950	1234	3184روپے
14	2065	1294	3359روپے
15	2190	1359	3549روپے
16	2535	1538	4073روپے
17	3880	2508	6388روپے

نوٹ:۔ اس میں انکریمنٹس شامل ہیں۔

اگر ہم اعداد و شمار دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ 80 فیصد برسرروزگار پاکستانی جسمانی محنت کے شعبوں سے وابستہ ہیں۔ زیادہ تر لوگ تعمیرات، کارخانوں اور کھیت کھلیان میں کام کرتے ہیں جہاں سے انہیں اوسطاً ایک سو روپے روزانہ ملتے ہیں جن سے انہوں نے کم از کم چھ افراد کا پیٹ پالنا ہوتا ہے جبکہ غیر سرکاری دفاتر میں بی اے سے کم تعلیمی قابلیت کے حامل افراد کو نوکریاں نہیں ملتیں۔ نئے بھرتی ہونے والے 85 فیصد نائب قاصد میٹرک اور ایف اے ہیں۔ دوسری طرف ایم اے اور پروفیشنل کورسز میں ماسٹرز کر کے آنے والے زیادہ تر نوجوانوں کو شروع میں تین ہزار روپے سے زائد تنخواہ نہیں ملتی جس میں وہ بمشکل اپنا گزارہ چلاتے ہیں جبکہ اکثر کیسوں میں نوکری لگتے ہی ان کی شادی کر دی جاتی ہے۔ یوں پہلے سے معاشی گرداب میں پھنسے سربراہ خانہ (نوجوان کا باپ بھائی یا والد) پر بہو اور ایک آدھ برس بعد پوتے پوتی کا بوجھ بھی

آ پڑتا ہے۔ دوسری طرف جب تین چار برس کی دن رات کی محنت کے بعد اس نوجوان کی تنخواہ میں دو تین ہزار کا اضافہ ہوتا ہے تو وہ تین چار بچوں کا باپ بن چکا ہوتا ہے۔ یوں وہ جب والدین سے الگ ہوتا ہے تو ایک معاشی جدوجہد سے بھری تلخ زندگی منہ کھولے اس کا انتظار کر رہی ہوتی ہے۔ اکثر اوقات یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اس کی معاشی گردن پر بوڑھے والد بیمار والدہ یا بہن کی شادی کی ضرب بھی آلگتی ہے جس سے اس کے جانبر ہونے کے امکانات مفقود ہو جاتے ہیں۔

تو رؤف اپنی بیوی کو دو سو روپے دے کر اسلام آباد آ گیا' وہ رؤف جو ہمارا ملازم تھا جو فلیٹ کی بالکونی میں سوتا تھا جو ہمارے کپڑے پہنتا اور ننگے پاؤں پھرتا تھا اور جو کھانا کھاتے وقت لقمہ ہونٹوں کے قریب لا کر سوچوں میں گم ہو جاتا تھا یا جو رات کو بالکونی میں بار بار پہلو بدلتا تھا' اس وقت ہمیں یقین ہوتا کہ وہ اپنے بچوں اپنی بیوی اور اپنے والدین کے بارے میں سوچ رہا ہے جو اس سے دور مانسہرہ کے قریب ایک گاؤں میں رہتے ہیں جنہوں نے دو سو روپے میں پورا مہینہ گزارنا ہے اور وہاں ایک دق زدہ بوڑھا باپ بھی ہے جو خون کی الٹیاں کرتا ہے اور ڈاکٹر نے جس کے علاج کے لئے آٹھ سو روپے لے لئے تھے یقیناً رؤف کے ہونٹوں کے دروازے پر ٹھہرے لقمے اس سے سوال کرتے ہوں گے کہ اس کے بچوں نے تو دو دن سے کھانا نہیں کھایا' بالکونی کی پتھریلی زمین اس سے پوچھتی ہوگی کہ اس کی سدا کی بھوکی بیوی اپنی ناموس پلو سے باندھے اس کا انتظار کر رہی ہے اور گلی سے گزرنے والا ہر شخص جب کھانستا ہوگا تو اسے اپنے باپ کی چھاتی کا درد یاد آ جاتا ہوگا...... لیکن صاحبو! یہ لقمے' یہ سخت زمین اور یہ سینوں سے اٹھتی کھانسی صرف رؤف کو ہی تنگ کرتی ہے۔ آج قومی اسمبلی کے ایوان سے تو کوئی شخص رؤف کے بارے میں سوال نہیں کرے گا کیونکہ یہاں تو اربوں کروڑوں اور لاکھوں کی باتیں ہو رہی ہیں۔ بارہ سو روپے لینے والے اس رؤف کو کون پوچھتا ہے خواہ یہ رؤف ملک کا 80 فیصد ہی کیوں نہ ہو...... لیکن صاحبو! میری روتی ہوئی آنکھیں اور میرے گلے میں پھنسی ہوئی بے کس مجبور آواز وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو اور قائد حزب اختلاف میاں محمد نواز شریف اور خزانہ کے وزیر مملکت مخدوم شہاب الدین سے ایک سوال کرتی ہے ہاں صرف اور صرف ایک سوال کہ کیا آپ لوگ ان 80 فیصد رؤفوں سے صرف نظر کر کے گرم پانیوں کے سمندر میں برف کے جزیرے نہیں بنا رہے؟

●......●......●

کسی شخص نے اللہ تعالیٰ سے رابطہ کیا اور اس سے کوئی ذمہ داری سونپنے کی درخواست کی، اللہ تعالیٰ نے اسے حکم دیا۔ ''یہ سامنے ایک چٹان پڑی ہے اسے دھکا دیتے رہو۔'' وہ شخص اُٹھا اور دونوں ہاتھوں سے چٹان دھکیلنے لگا، ایک دن گزرا، ایک ہفتہ گزرا، ایک سال گزرا، دس سال گزر گئے لیکن چٹان ٹس سے مس نہ ہوئی۔ لوگوں نے اسے سمجھایا ''بھلے مانس تم یہ چٹان نہیں سرکا سکو گے، کیوں اپنی جان ہلکان کر رہے ہو۔'' وہ لوگوں کی باتیں سنتا رہا، سنتا رہا لیکن چٹان بھی دھکیلتا رہا۔ جب لوگوں کے مذاق میں تیزی آ گئی تو اس نے ایک دن سوچا، واقعی دس برسوں میں یہ چٹان ایک اِنچ بھی آگے نہیں سرکی، وہ سیدھا ہوا اور آسمان کی طرف منہ کر کے شکوہ کرنے لگا۔ ''یا پروردگار! یہ چٹان تو نہیں سرک رہی؟'' اللہ تعالیٰ نے جواب دیا۔ ''اے بے وقوف شخص! ہم نے تمہیں اس چٹان کو دھکا دینے کا حکم دیا تھا، اسے سرکانے کا نہیں، سو جسٹ پُش اِٹ۔''

لوگ مجھ سے اکثر پوچھتے ہیں ''تمہارے لکھے کا اثر کیوں نہیں ہوتا؟'' میں ان سے عرض کرتا ہوں۔ ''جس قوم پر قرآن مجید کا اثر نہیں ہوا اس پر کالم کیا خاک اثر کریں گے۔'' لوگ پوچھتے ہیں۔ ''تمہیں اپنی ناکامی پر ٹینشن نہیں ہوتی؟'' میں کہتا ہوں۔ ''نہیں ہوتی'' وہ پوچھتے ہیں۔ ''کیوں؟'' میں عرض کرتا ہوں۔ ''مجھے اللہ تعالیٰ نے چٹان کو دھکیلنے کی ذمہ داری سونپ رکھی ہے، اسے سرکانے کی نہیں، سو آئی ایم جسٹ پُشنگ اِٹ۔'' وہ ہنس پڑتے ہیں اور میں بھی قہقہہ لگا کر خاموش ہو جاتا ہوں۔

ISBN [illegible]

Mob: 0300 521 1201